قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

نومبر 2016، قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

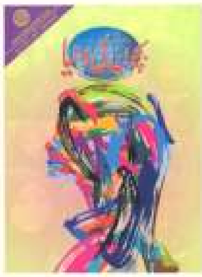

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے　　سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:18، شمارہ:11، نومبر 2016

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in, ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
لابی سے ادب اور قاری دونوں
کا نقصان ہوتا ہے: قاسم خورشید — قسیم اختر 8

زبان و تعلیم
معاشرتی تربیت میں تعلیمی اداروں
اور اساتذہ کا کردار — محمد افروز 13

ناموران نومبر
مولانا آزاد کے روشن افکار — امام اعظم 16

سید سلیمان ندوی — فاروق اعظم قاسمی 19

گوشۂ احمد ندیم قاسمی
احمد ندیم قاسمی — ارتضیٰ کریم 22

احمد ندیم قاسمی: احوال و کوائف — افشاں ملک 25
احمد ندیم کے افسانوں میں عورت — شہناز رحمٰن 30
احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات — رضوان بن علاء الدین 34

ادبی مباحث
اردو زبان کی ہمعصر معنویت و اہمیت — محمد زاہد الحق 37
گایتری منتر کا منظوم ترجمہ 'آفتاب' — شریف احمد قریشی 40
عزیز لکھنوی کی قصیدہ نگاری — حسن رضا کمیلی 42

ہم نے جنھیں بھلا دیا
وجودی عشق کا شاعر: میلا رام وفا — احمد سہیل 44
تربھون پرساد سریواستو انجام — احترام اسلام 46

یادیں باتیں
یادیں عصمت چغتائی کی — شیخ رحمٰن اکولوی 48

نشانِ دانش
ابن رشد ایک عظیم مفکر — ریحانہ بجنوری 50

سلسلۂ صحافت
منشی نول کشور اور ان کا اودھ اخبار — شمیم طارق 53
اردو صحافت کا عصری منظر نامہ — احمد اشفاق 56

صحت
ڈینگو: مہلک مرض — محمد رفیق 59

فلم
پرتھوی راج کپور — انیس امروہوی 61

کوئز
ادبی کوئز — زیب النساء سعید 65

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 67

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 79

ہماری بات

نئے عہد میں اردو زبان و ادب سے جڑے ہوئے بہت سے مسئلے ہیں جن پر معروضی اور منطقی انداز سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے اور ان مسئلوں کا حل ایک مربوط لائحہ عمل تیار کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ اردو زبان کے فروغ کے نئے امکانات کی جستجو کا ہے اور دوسرا مسئلہ اردو زبان میں تراجم کے ذریعے مختلف نئے علوم وفنون کی منتقلی کا ہے۔ آج بہت سے دانشور بھی اس تشویش کا اظہار کر رہے ہیں کہ اردو زبان صرف ادب اور تنقید تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اس میں سائنس، سوشل سائنس، میڈیا اور جدید علوم وفنون جیسے موضوعات کی کمی ہے۔ جبکہ دوسری زبانوں میں علوم وفنون سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی جا رہی ہیں اور عہد نو کے تقاضوں سے ہم آہنگ تصنیفات منظر عام پر آ رہی ہیں۔

اردو میں المیہ یہ ہے کہ علوم وفنون کی مبادیات سے متعلق بھی کتابیں نہیں کے برابر ہیں جس کی وجہ سے اردو میڈیم کے طلبہ کو خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر سماجیات، سیاسیات اور ابلاغیات سے متعلق جو نئے افکار و تصورات سامنے آ رہے ہیں ان افکار کو اردو میں منتقل کیا جانا بہت ضروری ہے۔ اسکول اور کالج کی سطحوں پر بھی اردو میں اقتصادیات، ریاضیات، نفسیات، قانونیات اور دیگر موضوعات سے متعلق تراجم کی شدید ضرورت ہے۔

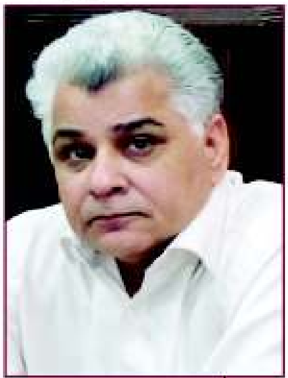

ماضی میں ترجمے کی اہمیت کا احساس تھا۔ اسی لیے کچھ ایسے ادارے قائم کیے گئے جہاں مترجمین کی ایک بڑی تعداد معقول تنخواہ پر مامور تھی جنھوں نے نہ صرف فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، معاشیات اور دیگر علوم وفنون کے ترجمے کیے بلکہ سنسکرت اور دیگر علاقائی زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے کیے۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی اور دارالترجمہ عثمانیہ میں ترجمے کا کام انہماک اور ارتکاز کے ساتھ کیا گیا۔ اس سے قبل دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر کی کوششوں سے بہت سی انگریزی کتابوں کے ترجمے اردو میں کیے گئے۔ شمس الامراء کبیر ثانی کے اہتمام میں مغربی سائنسی کی کتابوں کے اردو میں جو ترجمے ہوئے وہ بھی قابل ذکر ہیں۔ اور بھی بہت سے مترجمین تھے جنھوں نے مغربی علوم کو اردو میں منتقل کیا اور اس طرح اردو زبان کو ایک علمی، فکری اور سائنسی مزاج ومنہج عطا کیا۔

اس طور پر دیکھا جائے تو ماضی میں ترجمے کی روایت بہت زیادہ مستحکم رہی ہے۔ باضابطہ ترجمے کی کمیٹیاں تھیں جن میں ماہرین شامل تھے۔ ان میں کئی بڑے نام ہیں جنھوں نے انگریزی، فرانسیسی، جرمن، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان ترجموں کے ذریعے ہمارا ذہنی افق بھی وسیع ہوا اور ہمارے علمی اور ادبی سرمائے میں بھی گراں قدر اضافہ ہوا۔ تراجم ہی کی بدولت ہمیں عالمی ادبی شاہکاروں سے شناسائی حاصل ہوئی۔ ان ترجموں کے ذریعے مختلف ملکوں کے کلچر، تہذیب اور طرز معاشرت سے واقفیت ہوئی اور ملکوں اور قوموں کے درمیان لسانی اور تہذیبی سطح پر جو خلیج تھی اسے بھی کم کرنے میں مدد ملی۔ 'الف لیلہ' اور 'پنچ تنتر' جیسی کہانیوں تک ہماری رسائی ترجمے کے ذریعے ہی ہوئی۔ ترجمے کا عمل رک جائے تو زبان اور تہذیب مفلوج ہو جاتی ہے۔ زبانوں کی زندگی کے لیے ترجمے کے عمل کو جاری رکھنا ضروری ہے اور آج کے عہد میں جب نئے نئے علوم وفنون کا اضافہ ہو رہا ہے، نئے نئے افکار سامنے آ رہے ہیں تو ایسے میں ترجمے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

آج مختلف ملکوں میں ترجمے کے ذریعے ایک دوسرے سے ثقافتی رابطے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسے میں اردو مطالعات کے مراکز اور عصری جامعات کے اردو شعبہ جات اور اردو سے جڑی ہوئی دیگر تنظیموں کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ اردو میں ترجمے کے حوالے سے سنجیدگی سے غور و فکر کریں اور ایسی کتابوں کا انتخاب کریں جس کا ترجمہ کیا جانا بہت ضروری ہو اور اس کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جس میں مختلف علوم وفنون سے تعلق رکھنے والے ارباب دانش شامل ہوں اور انہی کے مشوروں کی روشنی میں موضوعات کا تعین کیا جائے۔ اردو زبان کے دائرے کو وسیع تر کرنے اور اس کے علمی سرمائے کی توسیع کے لیے یہ عمل آج کے عہد میں بہت ضروری ہے اور اس کے لیے کسی ایک ادارے پر انحصار کیا جانا غلط ہوگا۔ اردو کی جتنی اکادمیاں، تنظیمیں اور ادارے ہیں ان سب کو مل بیٹھ کر کام کرنا ہوگا تبھی ہم عالمی زبانوں سے مقابلہ کر پائیں گے۔

ارتضیٰ
پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

'اردو دنیا' ستمبر 2016 کا شمارہ ملا۔ اس بار بھی آپ نے بڑے اچھے مضامین کو جگہ دی ہے ہر مضمون ایک معلوماتی کائنات کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'اردو دنیا' ہندوستان کا واحد رسالہ ہے جس نے غزلوں اور نظموں سے اپنا رشتہ الگ کر رکھا ہے۔

زیرِ نظر شمارے کے اداریے میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو کی عالم گیر خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے اس میں روز بروز اضافے اور الیکٹرانک میڈیا کی وساطت سے اس کے فروغ کے مزید امکانات کو ظاہر کیا ہے اور بلاشبہ اردو زبان میں وہ خوبی ہے کہ وہ اپنے دامن میں بیسیوں بولیوں اور بھاشاؤں کے قابلِ قبول لفظوں اور شبدوں کو اپنے اندر ضم کر لیتی ہے اور اس حیرت ناک لہر و بحر کا سلسلہ سمندرِ لسانیِ اردو ادب میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے یقیناً یہ ہمارے لیے فخر و انبساط کا مقام ہے۔

عبدالرشید نے 'کرشن چندر کا تصورِ اتحاد' میں کرشن چندر کے منتخب اور شاہکار افسانوں میں چند افسانوں کی مثالیں جیسے کالو بھنگی، جلیان والا باغ میں جو کردار پیش کیے ہیں وہ اس دور کے کردار ہیں جو تقسیم ہند کے بعد فسادات کی صورت میں پھوٹ پڑنے والے حالات کا نشانہ بنے۔ اسی دور میں فسادات پر افسانے لکھنے والوں میں عصمت چغتائی، مہندر ناتھ، کنہیا لال کپور، احمد ندیم قاسمی، پرکاش پنڈت، نریش کمار شاد اور سعادت حسن منٹو بھی موجود تھے۔ سید فضل اللہ مکرم کا مضمون 'دکنی کلچر اور قومی یکجہتی' میں انھوں نے دکن کے تین شاہی سلاطین اور خاندانوں کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ ایک گلبرگہ کا بہمنی خاندان، دوسرا بیجاپور کا عادل شاہی اور تیسرا حیدرآباد دکن کا قطب شاہی، بہمنی خاندان کے آٹھویں فرمانروا فیروز شاہ بہمنی کو ہندو مسلم یکجہتی کا ہیرو ثابت کیا ہے جنھوں نے وہاں معاشرت، طرزِ تعمیر، ادب اور آرٹ کے ساتھ ساتھ زبان و ادب سے قومی یکجہتی کا چراغ روشن کیا تھا۔ اسی طرح بیجاپور کے علی عادل شاہ اور ابراہیم عادل شاہ نے بھی مختلف اقوام میں یکجہتی کا خود کو مظہر بنایا اور اپنی سلطنت میں ہندو مسلمان مرہٹے، کنڑ، دکنی، ایرانی، حبشی غرض

مختلف قوموں کو آباد کیا لیکن قومی یکجہتی کی تابندہ اور تاریخی مثال بننے والوں میں محمد قلی قطب شاہ (اردو کے اولین صاحب دیوان شاعر) سرِفہرست رہے جنھوں نے اپنے آپ کو دکن کے کلچر سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔ شعر و ادب، موسیقی، رقص اور تعمیرات میں نہ صرف اسلامی ثقافت کو جگہ دی بلکہ تلنگانہ کے ہندو کلچر کو بھی اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا اور ان تعمیرات میں 'چار مینار' یکجہتی کا سب سے بڑا نمونہ اپنے چاروں میناروں کی علامت سے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کی بھائی چارگی کا مضبوط اور روشن جواز پیش کرتا ہے۔

علیم صبا نویدی: فلیٹ نمبر 16، دوسری منزل، چینئی

حسبِ معمول یہ شمارہ بھی گوناگوں مشمولات اور مندرجات سے اس طرح آراستہ ہے کہ اسے ایک سدا بہار گلدستہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ آپ نے اردو جرائد کی پرانی اور خارج از مکان روش کو چھوڑ کر اور خاص کر آج کل کی عامیانہ اردو شاعری سے دامن چھڑا کر اس رسالے کو علم افزا اور قابلِ توجہ مندرجات کا ایک بے مثال رسالہ بنا کر ہندوستان کی ادبی صحافت میں ایک نئی طرح ڈالنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

میں زیرِ نظر شمارے پر تفصیلی گفتگو کرنے کے برعکس اس میں شامل ایک مضمون 'منٹو کے افسانوں میں کشمیریت' از خورشید احمد پر بات کروں گا۔ خورشید صاحب نے اپنے قلم کی بے راہ روی میں منٹو کے ساتھ وہ افسانے بھی کشمیر سے جوڑنے کی کوشش کی ہے جن کا سرزمین کشمیر سے کوئی تعلق نہیں۔ اصل میں منٹو نے کشمیر نژاد ہونے کے باوجود کشمیر کے حوالے سے واضح طور پر صرف دو افسانے 'ٹیٹوال کا کتا' اور 'آخری سیلیوٹ' لکھے۔ خورشید صاحب نے ان شاہکار افسانوں کو از حد ضرورت کے پیش نظر زیر بحث لانے کی زحمت نہیں کی ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے منٹو کے نام سے جن افسانوں کے اقتباسات پیش کیے ہیں ان کا موضوع ملک کے کسی بھی پہاڑی علاقے کے باشندوں سے ہوسکتا ہے۔ مثلاً 'بیگو' کی پہاڑی لڑکی ہماچل پردیش یا اتراکھنڈ کی دوشیزہ بھی ہوسکتی ہے۔ 'رام دئی' اور 'شغل' افسانے بھی کشمیر کی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے نہایت دوری پر ہیں۔ 'شغل' افسانے کا یہ جملہ بجائے خود اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ افسانہ کشمیر کے تناظر میں نہیں لکھا گیا ہے بلکہ اس کا حدود اربعہ وہاں سے دور جموں صوبے کا علاقہ بٹوت ہے۔ ''موٹر لاریوں کی آمد رفت سے بھی ہمارا دل بہلا رہتا تھا جو رنگ برنگ مسافروں کو کشمیر سے واپس یا کشمیر کی طرف لے جاتی رہتی تھیں''۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ بٹوت کو کشمیر کا حصہ نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ جموں صوبے میں ہے۔ البتہ وہ سری نگر سے جنوب میں دو سو میل دور اسی بٹوت کے مقام پر دق کی بیماری کے علاج کی خاطر ہسپتال میں زیرِ علاج رہے جہاں انھوں نے ایک پہاڑی لڑکی کے ساتھ ناکام عشق کیا۔ افسانہ 'بیگو' اسی بٹوت میں تپ دق میں مبتلا منٹو نے لکھا اور اپنی غیر کشمیری معشوقہ بیگو کو اس میں شامل کیا۔ 'شیرو' اور 'لالٹین' بھی کشمیر سے میلوں دور جنوب میں پیر پنچال کے فلک بوس پہاڑوں سے پرے بٹوت ہی کے تناظر میں ایک غیر کشمیری ماحول کی پیداوار ہیں۔

یہاں یہ دہرانا ضروری ہے کہ منٹو واقعی کشمیری الاصل تھے لیکن وہ خود کبھی کشمیر نہیں آئے۔

مضمون نگار نے زیادہ تر شمس الحق عثمانی کی 'کلیات منٹو' سے ہی استفادہ کیا ہے حالانکہ عثمانی صاحب کا کام صرف

کلیات کو مرتب کرنا تھا اور وہ منٹو کی کشمیریت پر کوئی تحقیقی مقالہ نہیں لکھ رہے تھے۔ خورشید صاحب نے اس فرق کو محسوس نہیں کیا ہے اور اس طرح سے ان کا مقالہ ادھورا رہ گیا ہے۔

غلام نبی خیال: 15 راول پورہ، حسین کالونی، سری نگر، کشمیر

ستمبر 2016 کا 'اردو دنیا' ایک نئے انداز میں باصرہ نواز ہوا۔ دلکش مواد کے ساتھ قومی اردو کونسل میں جشنِ آزادی کی جھلکیاں دیکھ کر وہ زمانہ یاد آگیا جب یومِ آزادی سب مل کر بڑے جوش و خروش اور فخر سے مناتے تھے۔ ویسے بھی ایک اردو ادارے کا یومِ آزادی سے ایک خاص تعلق ہے کیونکہ حصولِ آزادی کے لیے اردو زبان اور اس کے چاہنے والے ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔

'ہماری بات' میں اردو کے فروغ کے لیے قومی کونسل کی مستعدی کا اعتراف راجیہ سبھا میں کیا جانا محبانِ اردو کے لیے حوصلہ افزا ہے۔ اردو کی خوب صورتی کا اس کے رسم الخط سے تعلق بہت خوبی سے درخشاں تاجور کے انٹرویو سے اجاگر ہوا ہے اور وہ بھی ایک غیر مسلم دانشور مہندر پرتاپ کی زبانی اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے بھی بڑے عالم ہونے کی وجہ سے چاند صاحب نے اس زبان کی غنائیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عابد حسین حیدری نے مصور سبزواری کی شاعری میں زندگی کی ان علامتوں کی بخوبی نشاندہی کی ہے جو شاعر کے کلام میں رنگ و آہنگ کے ساتھ اس کے خاص اسلوب کو بیان کرتی ہیں۔ عبدالرشید خاں نے اپنے مضمون 'کرشن چندر کا تصورِ اتحاد' میں بجا طور سے یقین ظاہر کیا ہے کہ ''ہندوستان میں جس مشترکہ تہذیب و تمدن اور قومی یکجہتی کو جنم ملا اس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہیں یہ سالہا سال تک نشیب و فراز کے باوجود اس کے مٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔''

کرشن گوتم: 3251، سیکٹر 44-D، چنڈی گڑھ، ہریانہ 47

ستمبر 2016 کے شمارے میں رنگا رنگ عنوانات کے لحاظ سے آپ نے 'اردو دنیا' کے افق پر ایک دھنک سی آویزاں کردی ہے۔ جناب مہندر پرتاب چاند سے ملاقات کر کے بے ساختہ ایک شعر زبان پر آگیا:

جن کی صحبت میں کہانی کا مزہ آتا ہے
ایسے احباب تو قسمت سے ملا کرتے ہیں

موصوف کے جواں سال چہیتے بیٹے کی حادثاتی موت کے غم کو آگ کا دریا گردانتے ہوئے یہ کہنا کہ ''اپنے غم کو حوصلے کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے خدا کی بخشی ہوئی ہزارہا نعمتوں کا شکر ادا کیا۔ ایک سوال کے جواب میں آپ نے یہ کہا کہ ''مجھے اردو پڑھ کر بڑی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ نیز تقسیم کے جہنم زار سے گذرتے ہوئے کسی نیک سیرت مسلمان تھانیدار کے غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردانہ رویے کا ذکر کرتے ہوئے موصوف کا یہ کہنا کہ ''آج بھی ان کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ ایسا وقت دوبارہ کسی پر نہ پڑے۔ موصوف کی یہ شیریں سخنی اُن کے مزاج کے فطری بہاؤ کے رخ کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ وہ کمیاب اور نادر المثال اوصاف ہیں جن اوصاف نے آپ کی دل آویز شخصیت کی بڑے سلیقے سے جا بندی کی ہے۔ مختلف مذاہب اور رنگ و نسل کی اردو داں شخصیات دنیا بھر میں خوشنما جزائر کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ وہ من موہنی شخصیات ہیں کہ جن سے تصویرِ کائنات میں رنگ ہے۔ جناب حقانی القاسمی کے تعارفی مضمون میں جہاں محترمہ سنگوک ہونگ کی اردو دوستی کے سبب اُن کی دیدہ زیب تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہیں مضمون نگار کی دیدہ وری کی جھلکیوں نے اس مضمون کو نہایت وقیع اور معنی خیز بنادیا ہے۔

متین اچل پوری: بیابانی، اچل پور، ضلع امراوتی، مہاراشٹر

ماہ ستمبر کے شمارے کے اداریے میں اس بار 'ہماری بات' کے تحت یک جہتی کی دورِ حاضر کی ضرورت کی بخوبی خط کشی کی گئی ہے۔ آغاز میں ہی ذوق کا شاندار شعر محولہ کیا گیا ہے۔ اس میں 'نا اتفاق' اس معنی کی بجائے دوئم معنی 'کثرت' (Diversity) میں ہی لفظ 'اختلاف' کا تصرف درخورِ توجہ ہے۔ 'کثرت میں وحدت' (Unity in Diversity) کو ہی دیگر ممالک سے ہمارے ملک کا ایک امتیازی طرہ تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

مہندر پرتاپ چاند کے ساتھ محترمہ ڈاکٹر درخشاں تاجور نے از حد معیاری مشافہہ تیار کیا ہے۔ خورشید احمد نے کشمیر و کشمیریت جیسے کمیاب موضوع پر مبنی اپنے موقر مقالے میں منٹو کے افسانوں کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ سنتوش کمار نے عدم گونڈوی کی شاعری میں باغیانہ و احتجاجی مزاج کی آواز کی بھی اپنے مضمون میں بخوبی خط کشی کی ہے۔ اس میں بھی زبان و بیان کی کچھ غلطیاں تھیں۔ چونکہ ریسرچ اسکالروں کو ایک طویل راستہ طے کرنا ہوتا ہے، لہٰذا انھیں زبان کا استعمال ہمیشہ بموجب قواعد ہی کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر ریحان حسن صاحب نے اپنے مقالے 'ولی الحق انصاری...' میں ان کی غزلیات میں تلمیحات کی کثرت کی جاندار نشان دہی کی ہے۔ موضوع کا تنوع معیاری بھی ہے اور قابلِ مدح بھی۔ قوسین کے مابین آگے بھی چند اغلاط دے رہا ہوں۔ 'گیتا' کتاب کے نام میں 'شری' لفظ کے بعد 'مد' چاہیے تھا اور 'سکھنڈی' (شکھنڈی)، 'کونچ' ('کوچ' Kavach)۔ نہایت عاجزی و انکساری سے کہہ رہا ہوں کہ زبان و املا کی اشاعت کی بابت خاص توجہ دینے سے جریدے کا معیار مزید ارفع و بلند ہوگا۔

کرشن بھاوک: کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' ستمبر کا شمارہ اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ دستیاب ہوا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ قومی اردو کونسل کی حسن کارکردگی کا اعتراف مرکزی حکومت نے کیا ہے۔ آپ کی کوششیں رنگ لا رہی ہیں۔ درخشاں تاجور نے مہندر پرتاپ چاند جیسے محبِ اردو کا اپنے انٹرویو میں جس طرح تعارف کرایا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ حقانی القاسمی صاحب نے سنگوک ہونگ سے تفصیلی گفتگو کر کے ان کی شخصیت اور اردو سے لگاؤ کو اجاگر کیا ہی ہے اس سے اردو کی آفاقیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ تبصراتی مضامین پسند آئے۔ قاضی عدیل عباسی صاحب نے دینی تعلیمی کونسل قائم کر کے قوم کے لیے ایک بڑا کام کیا ہے۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یوپی کے تمام مسلم علاقوں میں مدرسوں اور مکاتب کا جال بچھ گیا اور مسلم بچے دینی تعلیم کے ذریعے اردو کی تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں۔ ہمارے ان رہنماؤں کی جو اردو زبان کے فروغ سے جڑے ہیں انھیں عباسی صاحب سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ محمد وصی اللہ حسینی نے قاضی عدیل عباسی صاحب کو اپنے مضمون کے ذریعے یاد کر کے قابلِ تحسین کام کیا ہے۔

عبدالحی پیام انصاری: پیر ولی بازار، ضلع گورکھپور، یوپی

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ شکریہ۔ اس کے صوری حسن اور معنوی جمال کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ 'ہماری بات' کے تحت آپ نے اردو کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی اچھی خوش خبری دی ہے کہ حکومتِ ہند اردو کے فروغ کے تعلق سے نہ صرف سنجیدہ ہے بلکہ قومی اردو کونسل کی عمدہ کارکردگی کا بھی اعتراف کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اردو کے جتنے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے ہیں ان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سب سے زیادہ فعال ہے۔ مشمولات میں سبھی مضامین سے کچھ نہ کچھ نئی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اردو رسم الخط کی خوبصورتی اور اس کے کومل شبدوں کے تعلق سے مہندر پرتاپ چاند اور سنگوک ہونگ کے اعترافات حقیقت پسندی پر مبنی ہیں۔ مصور سبزواری،

کرشن چندر اور منٹو کے فکر وفن پر مقالات فکر انگیز ہیں۔ اسی طرح ولی الحق انصاری، بلراج کومل، عدم گونڈوی، نواب محبت خاں محبت اور قاضی عدیل عباسی جیسی شخصیات کی بازیافت قابل تعریف تو ہے ہی، ان مقالات سے ان شخصیات کے روشن پہلو بھی سامنے آتے ہیں جس کے لیے فاضل مقالہ نگار مبارکباد کے مستحق ہیں۔ دکنی کلچر اور کوکن کے اردو لوک گیت تحقیقی نوعیت کے مضامین ہیں جنھیں سید فضل اللہ مکرم اور محمد دانش غنی نے بڑی عرق ریزی سے سپرد قلم کیا ہے۔ دیگر مشمولات بھی حسب معمول لائق مطالعہ ہیں۔

سعید رحمانی: مدیراعلیٰ: ادبی محاذ، دیوان بازار کٹک، اڈیشا

'اردو دنیا' اگست 2016 کا شمارہ اپنی امتیازی خصوصیتوں یعنی حسن طباعت وکتابت اور حد درجہ معلوماتی، محققانہ اور بصیرت افروز مشمولات کے ساتھ موصول ہوا۔ اس کے مندرجہ ذیل مضامین بہت پسند آئے۔ انٹرویو کے تحت 'اردو صحافت کا مزاج جمہوری ہے' زبان وتعلیم کے تحت: نوآبادیاتی ہندوستان: فکریات وتعلیمی تجربہ، جشن آزادی کے تحت: اردو کی نظمیہ شاعری میں حب الوطنی اور آزادی، ادبی مباحث کے تحت: اردو کی ابتدائی نشو ونما میں ترکوں کا حصہ، مابعد نوآبادیاتی مطالعہ، گوشہ شکیل بدایونی کے تحت: شکیل بدایونی کچھ اہم باتیں، شاعر ونغمہ نگار: شکیل بدایونی، سلسلۂ صحافت کے تحت: اردو کی ادبی صحافت 'معارف' کے سو سال، شخصیات کے تحت: نصیرالدین ہاشمی، خراج عقیدت کے تحت: سیدہ جعفر، عالمی اردو کے تحت: زہیر بن سلمیٰ، کوئز کے تحت: ادبی کوئز اور تبصرے وغیرہ۔

اسی طرح اردو دنیا ستمبر 2016 کا شمارہ بھی موصول ہوا۔ یہ شمارہ محققانہ اور حد درجہ معلوماتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کے لکھنے والے حضرات اور خود آنجناب دلی مبارکباد قبول کریں۔ مندرجہ ذیل مضامین اس ذیل میں آتے ہیں اور یہ بہت زیادہ پسند آئے: اردو کی خوب صورتی اس کے رسم الخط میں ہے، اردو کے شبد بہت کومل لگتے ہیں، ادبی مباحث کے تحت: کرشن چندر کا تصور اتحاد، بیسویں صدی میں صنعتی ارتقا اور سماجی و خاندانی نظام حیات، ولی الحق انصاری کی غزل میں تلمیحات، ہم نے جنھیں بھلا دیا کے تحت: نواب محبت خان محبت، سلسلۂ صحافت کے تحت: قاضی عدیل عباسی کی صحافت، تہذیب اور ثقافت کے تحت: دکنی کلچر اور قومی یک جہتی، صحت کے تحت: باہر کے کھانوں سے بچیے، کوئز کے تحت: ادبی کوئز، کتابوں کی دنیا کے تحت: تبصرہ وتعارف۔

ڈاکٹر ہاشم قدوائی: سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ بابت اگست 2016 موصول ہوا۔ مذکورہ شمارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں شکیل بدایونی پر گوشہ شائع ہوا ہے۔ یہ ایک قابل تحسین امر ہے، کیونکہ شکیل جیسے باصلاحیت اور مقبول ترین شاعر اور نغمہ نگار کو لوگ بھول گئے تھے۔ گوشے میں تین مضامین ہیں اور اپنی اپنی جگہ تینوں اہم اور معلومات افزا ہیں۔ لیکن مضمون 'شکیل بدایونی سے متعلق کچھ اہم باتیں' از صدر عالم گوہر مجھے بہ طورِ خاص پسند آیا کہ اس میں شکیل صاحب کے بعض فلمی نغموں کا پس منظر بڑے سلیقے سے بیان کیا گیا ہے، جو معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ چشم کشا بھی ہے۔ فلم 'چودھویں کا چاند' کا ایک مقبول نغمہ، جس کا مکھڑا یہ ہے:

چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو
جو بھی ہو تم خدا کی قسم لاجواب ہو

اس کے پہلے مصرعے میں ایک رکن کے سقوط کی وجہ سے نقص واقع ہوگیا ہے۔ اگر اس میں شروع میں لفظ 'تم' کا اضافہ کرکے اس کو یوں کردیا جاتا۔ تم چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو— تو یہ درست ہوجاتا۔ مذکورہ مضمون میں اس نغمے بلکہ مکھڑے کی آمد اور ظہور پذیری کا احوال بیان کیا گیا ہے اور اس درآمدہ عیب ونقص پر استاد شاعر جناب ناطق گلاوٹھوی کے اعتراض وگرفت کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ (دیکھیے ص 39)

جناب حبیب احمد صاحب (سابق استاذ عربی، شعبۂ عربی وفارسی، الہ آباد یونیورسٹی) نے بھی اس عیب کی جانب اس وقت اشارہ فرمایا تھا جب میں 1970 میں ان سے علم عروض کی الف بے سیکھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ، انھوں نے اور بھی کئی فلمی نغموں میں موجود عیوب واسقام کی نشان دہی فرمائی تھی، جس کا ذکر میں نے اپنے احباب اور ہم کاروں سے متعدد بار کیا ہے۔

حسن اتفاق کہ اس کے کئی سال بعد یعنی 4 اکتوبر 1976 کو مجھے نوشاد صاحب سے ملاقات کا شرف ان کی رہائش گاہ واقع ممبئی پر حاصل ہوا۔ دوران گفتگو میں نے ان کی توجہ زیر بحث مکھڑے میں واقع عیب کی جانب مبذول کرائی۔ میری عرض کو بہ غور سماعت کرکے انھوں نے فرمایا کہ 'تم' رکھ کر بھی اچھی دھن بنائی جاسکتی تھی۔ اس خوش گوار اور لطف اندوز ملاقات سے مشرف ہونے کے بعد جب میں ممبئی سے الہ آباد واپس آیا، تو غالباً نومبر 1976 میں صہبا افغانی صاحب کی خدمت میں نوشاد صاحب کا سلام عرض کرنے کی غرض سے حاضر ہوا۔ اتفاق سے اس ملاقات میں بھی مذکورہ بالا نغمے کا ذکر آگیا۔ اس ضمن میں صہبا صاحب نے یہ انکشاف فرمایا کہ جس وقت اس کی ریکارڈنگ ہورہی تھی اسٹوڈیو میں میں بھی موجود تھا۔ شکیل صاحب لفظ 'تم' رکھنے پر اصرار کررہے تھے، مگر موسیقار روی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے، کیونکہ ایسا کرنے سے ان کو دھن میں تبدیلی کرنی پڑتی۔ ان کا کہنا تھا کہ دھن بہت اچھی بن گئی ہے اور اس میں لفظ 'تم' کے دخول سے خلل واقع ہوجائے گا۔ اس طرح مجبوراً شکیل صاحب کو رضامند ہونا پڑا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ میں نے بھی شکیل صاحب کو یہ کہہ کر راضی کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس سے آپ کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آئے گا، کیونکہ اہل فن کے نزدیک آپ کی شاعرانہ صلاحیت ولیاقت مسلم ہے۔ لوگ سمجھ جائیں گے کہ ایسا کسی مجبوری کے تحت کیا گیا ہے۔

پروفیسر مقصود احمد: بڑودہ، گجرات

ماہ اگست 2016 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس کے تمام مشمولات اداریہ سے لے کر خبرنامہ تک بھی تمام تر خوبیوں سے مزین ہیں۔ عزت مآب پرکاش جاوڈیکر جیسی شخصیت کے بارے میں مزید جاننے کا خواہاں تھا وہ خواہش اس شمارے سے پوری ہوئی۔ شمارہ آنے سے قبل استاد محترم کا انٹرویو شائع ہونے کی آگاہی نے مجھے انٹرویو پڑھنے کا بے حد مشتاق کررکھا تھا۔ ہمارے استاد محترم عبدالغفار انصاری (معصوم شرقی) کے انٹرویو سے نہ صرف احمد سعید ملیح آبادی جیسی بڑی شخصیت اور کلکتہ (موجودہ کولکاتا) سے شائع ہونے والا اخبار 'آزاد ہند' کے عروج وزوال بلکہ پرنٹنگ میں لیتھو پرنٹ سے لے کر آفسیٹ پرنٹ کے ارتقا سے بھی واقف ہوا۔ فوزیہ خانم اور شاکر علی صدیقی کے مضامین قابل تعریف ہیں۔ بڑے غلام علی خان اور نصیرالدین ہاشمی پر لکھے گئے مضامین سے علم میں اضافہ ہوا۔ بانو سرتاج کا ترجمہ 'اکبری لوٹا' بھی کافی اہم ہے۔ اردو دنیا معلومات میں اضافہ کرنے میں سرفہرست ہے۔

خطاب عالم شاذ: کانکی نارہ، شمالی چوبیس پرگنہ، مغربی بنگال

قسیم اختر

لابی سے ادب اور قاری دونوں کا نقصان ہوتا ہے

قاسم خورشید

ڈاکٹرقاسم خورشید موجودہ عہد کے معتبر فکشن نگار شاعر اور میڈیا کی ناگزیر شخصیت ھیں۔ ان کے افسانوی مجموعے 'پوسٹر'، 'ریت پر ٹھہری ھوئی شام' اور 'کینوس پر چھرے' کے علاوہ 'تھکن بولتی ھے'، 'دل تو ھے بنجارا' (شاعری)، 'متن اور مکالمہ' (تخلیقی تنقید)، 'شھر میں چوھے' (ڈرامے)، Waves (انگریزی میں کھانیاں) اور دوسری کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ھیں۔ انھوں نے ٹیلی ویژن کے لیے سیکڑوں فلمیں بنائیں، قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے نوازے جاتے رھے ھیں، ملک اور بیرون ملک کے اھم ترین سمیناروں، مشاعروں میں ان کی شمولیت کامیابی کی ضامن ھوا کرتی ھے۔ پیش ھے موجودہ ادبی منظر نامے کی مختلف جھتوں پر ان سے کی گئی بات چیت!

قسیم اختر: کیا آپ اس بات سے متفق ہیں کہ موجودہ صدی فکشن کی صدی ہے؟

قاسم خورشید: یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟ اور ایسا ادبی فتویٰ صادر کرنے کا حق کسے ہے؟ میں قطعی طور پر متفق نہیں ہوں کہ یہ صدی فکشن کی صدی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وضاحت کی بھی ضرورت نہیں ہے محض ذہن سازی کے لیے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی صدی کسی خاص صنف کے لیے وقف نہیں ہوتی۔ فنون لطیفہ کے تحت جتنے اصناف پر ہم کام کر رہے ہیں دراصل وہ ترسیل کا یا تخلیق کی ترسیل کا خوبصورت میڈیم ہے۔ اس صدی میں ابھی دوسری دہائی بھی مکمل نہیں ہوئی ہے تو پھر کیسے ہم احتساب کرسکتے ہیں کہ یہ صدی فکشن یا کسی دوسری صنف کے لیے زیادہ زرخیز یا معتبر ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ اب تک اس صدی میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ہاں یہ صدی کاروباری، لابی کی، خودستائی کی، خوش فہمی کی صدی ضرور تصور کی جاسکتی ہے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ گذشتہ صدی کے پریم چند، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، رشیدۃ النساء، سجاد ظہیر، سہیل عظیم آبادی، جوگیندر پال، انتظار حسین، غیاث احمد گدی، احمد یوسف کے فکشن سے آگے جانا تو بہت دور کی بات ہے، اگر دیانت داری کے ساتھ خود احتسابی کریں تو یہ احساس ہوگا کہ آج بھی فکشن سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بھلے نئے لوگوں کو پڑھیں لیکن انہیں جائے اماں پریم چند، منٹو، بیدی اور قرۃ العین حیدر جیسے فکشن نگاروں میں ہی ملتی ہے۔ تو پھر ہم کون سا بھرم پال کر بیٹھے ہوئے ہیں کہ یہ صدی فکشن کی صدی ہے۔

ق ا: آپ کی تازہ ترین کتاب 'متن اور مکالمہ' خصوصی بحث میں ہے۔ آپ کے اپنے تاثرات کیا ہیں؟

قاسم خورشید: دیکھیے میں بنیادی طور پر خود کو ایک تخلیق کار تصور کرتا ہوں۔ میرے پاس روایتی نقاد ہونے کا نہ تو تجربہ ہے نہ ہی مشاہدہ۔ جہاں تک اس کتاب کے وجود میں آنے کی بات ہے تو وقتاً فوقتاً جو مضامین تحریر کیے گئے اور انھیں سمیناروں میں پڑھنے کا موقع ملا تو میں نے شدت سے محسوس کیا کہ یہ ایک ایسی کاوش ہے جو کم از کم ہمارے تخلیق کاروں کو ضرور تقویت پہنچائے گی۔ میں نے ایک تخلیق کار کی حیثیت سے جو محسوس کیا اسے رقم کرنے کی کوشش کی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے قارئین کو یہ کتاب بہت پسند آرہی ہے، ظاہر ہے اس سے ہمارا حوصلہ بڑھا ہے۔ میں نے تخلیقی تنقید کا ایک کولاژ تیار کیا ہے۔ جو اہل نظر کو تخلیقی تنقید کے نئے کینوس پر ابھری ہوئی نئی شبیہ معلوم ہوگی۔ اور شاید یہاں سے بعض نئے دریچے وا ہو سکتے ہیں۔

ق ا: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ تخلیقی تنقید کا بھی کوئی منشور ہوسکتا ہے؟

قاسم خورشید: تخلیقی ادب کی تنقید کا کوئی منشور نہیں ہوتا۔ یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ حالانکہ اصول وضع کیے جاتے رہے ہیں۔ بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ ہنوز یہ سلسلہ قائم ہے۔ ادبی تحریک تخلیق کے بطن سے ہی ابھری ہے۔ یعنی ادب پہلے وجود میں آیا اور پھر اپنی ترجیحات کے تحت اسے تحریک یا تحریکوں کا حصہ بنایا گیا۔ اس موضوع پر تفصیلی اظہار خیال کی ضرورت ہے۔ فی الحال یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ ہم تخلیق کار کو ہی اپنا نقاد تصور کریں یا پھر نصابی تنقید نگاری کی آرا کے تحت تخلیق کے مستقبل پر منحصر رہیں۔

ق ا: ازراہ کرم اب آپ اپنے سوانحی حالات کے متعلق بتائیں؟

قاسم خورشید: والدین نے میرا نام قاسم خورشید رکھا۔ میرے والد محترم کا نام سید غلام ربانی ہے۔ میرا آبائی وطن کاکو، جہان آباد (بہار) ہے۔ بچپن ہی میں جب میں چار سال کا تھا والد صاحب کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس وقت دو چھوٹے بھائی بالترتیب ڈھائی سال اور چھ ماہ کے تھے۔ بیوہ ہو جانے کے بعد والدہ نے صبر وتحمل سے کام لیا۔ ہم لوگوں کی تعلیم وتربیت بہتر طریقے سے ہو، اس لیے وہ اپنے میکے چلی آئیں۔ میری ابتدائی زندگی

بہت جد و جہد میں گزری۔ میں سات سال کی عمر میں اپنے خالہ زاد ماموں مظفر الجاوید صاحب کے یہاں پٹنہ آ گیا۔ رام موہن رائے سمینری اسکول سے میٹرک تک کی تعلیم حاصل کی۔ اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی سے آئی اے کیا۔ پٹنہ کالج سے بی اے آنرز کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ میں نے تعلیم جاری رکھنے کے لیے ٹیوشن بھی کیے۔ 'پرل موٹرس' میں بھی کام کیا۔ بس کے اسٹیل والے پارٹ پرزے پر پالش کا بھی کام کیا۔ لیکن رزلٹ ہمیشہ اچھا کرتا رہا۔ جب آل انڈیا ریڈیو میں عارضی اناؤنسر کے عہدے پر مامور ہوا تو شاہدہ وارثی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی۔ باضابطہ نوکری میں آنے کے بعد انھیں ہی رفیق حیات بنالیا۔ آج بھی وہ زندگی کے اس سفر میں میرے ساتھ ہیں۔

ق ا : آپ نے افسانہ نگاری کی شروعات کب کی اور دوسری اصناف کے مقابلے میں افسانہ نگاری کو کیوں ترجیح دی؟

قاسم خورشید: طالب علمی کے زمانے سے ہی میرا شاعری کی طرف رجحان رہا۔ پھر بعد میں افسانہ نگاری اور دیگر اصناف کی طرف مائل ہوا۔ 1982 میں میری پہلی کہانی 'روک دو' ماہنامہ 'زبان و ادب' میں شائع ہوئی۔ پھر ملک کے مختلف رسائل میں لگاتار میری کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ میں نے 70 سے زائد افسانے لکھے۔ محمد حسن، انتظار حسین، احمد فراز، وہاب اشرفی، رتن سنگھ، قمر رئیس، شہر یار، ندا فاضلی، انور سدید، زاہدہ حنا، فاطمہ حسن، جابر حسین، احمد یوسف اور دوسرے مشاہیر ادب نے خصوصی طور پر مجھے اہم ترین افسانہ نگار تصور کیا۔ اسی طرح اور دوسرے نامور ہندی، اردو اور انگریزی کے نقادوں اور ادیبوں نے میرے فن پاروں سے متعلق اپنی بیش قیمت آرا سے نوازا۔ ہندو پاک کے تقریباً سبھی اہم ترین رسائل میں میری تخلیقات بہت اہتمام سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ بہار میں رہ کر مجھے سب سے پہلے بیرون بہار اور بیرون ممالک کے اردو، ہندی اور انگریزی رسائل میں ایک ساتھ شائع ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ میرے افسانوں اور کہانیوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے جن میں 'پوسٹر'، 'ریت پر ٹھہری ہوئی شام'، 'کینوس پر چہرے' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ہندی افسانوں اور کہانیوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے۔ میرے افسانوں اور کہانیوں کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ افسانہ نگاری کے ساتھ میں نے مختلف ڈرامے بھی لکھے اور اسٹیج کیے۔ اپٹا (IPTA) اور دیگر تنظیموں کے ذریعے بہار اور ملک کے دوسرے گوشے میں بھی کئی ڈرامے اسٹیج کیے۔ لیکن مجھے مقبولیت اپنے افسانوں کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ چونکہ افسانہ مجھے سکون بخشتا ہے، مجھے افسانے لکھنے سے یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے افسانہ نگاری ہمیشہ میری پہلی ترجیح رہی۔

ق ا : آپ اپنے افسانوں کے ذریعے قاری کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

قاسم خورشید: افسانہ پیغام رسانی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہ تو محض تحریک پہنچانے کا کوئی وسیلہ ہوسکتا ہے، ایسی تحریک جو انسان کو اپنے وجود کا پتہ دے، ایسی تحریک جو اسے جینے کا حوصلہ عطا کرے، ایسی تحریک جو اسے اپنے آپ سے ملنے کے وسائل مہیا کرا سکے، ایسی تحریک جو سمٹے تو دلِ عاشق اور پھیلے تو زمانہ بن جائے۔

ق ا : 1980 کے بعد کو مابعد جدیدیت تصور کیا جاتا ہے۔ کیا آپ نے اپنے افسانے کو مابعد جدیدیت کے رجحان کے پیش نظر رکھ کر لکھنے کی کوشش کی ہے؟

قاسم خورشید: میں اس سے قطعی طور پر اتفاق نہیں رکھتا کیوں کہ ادب کے بطن سے تحریکیں ابھرتی ہیں کہ کسی تحریک سے کم از کم تخلیقی ادب تو وجود میں آتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تحریک واضح طور پر ابھری اور ان تحریکات کے زیر سایہ جن تخلیق کاروں نے اپنی شناخت بنانے کی سعی کی ان میں عموماً تخلیق کار تحریک کے زوال کے ساتھ ہی زوال پذیر ہوگئے مگر جن تخلیق کاروں کی تخلیقات کو زیر بحث ادبی تحریکوں کی حمایت میں پیش کیا گیا صرف وہی ادب زندہ و تابندہ ہے یہ کام صرف ہمارے نقاد کرتے ہیں۔ آپ ذرا سوچیے کہ پریم چند تک کے ادب کو مابعد جدید کے زمرے میں رکھ کر پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے میرا یہ واضح تصور ہے کہ تخلیقی ادب خود ہی ایک ایسی تحریک ہے جو ہمارے Vision کو مزید جلا بخشتی ہے۔

ق ا : فن افسانہ نگاری آپ کی نظر میں کیا ہے؟

افسانہ نگاری کا فن روایت کے مطابق یہی ہے کہ کسی واقعہ کو اختصار میں تخلیقی بیانیہ کے ساتھ فنکار پیش کیا کرتا ہے اور عموماً بہتر افسانہ اس مقام پر اختتام پذیر ہوتا ہے جہاں سے سوچ کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ افسانہ وہی کامیاب ہوتا ہے جو ہمیشہ قاری کے ساتھ سفر کرتا رہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نسل در نسل منتقل ہونے لگتا ہے۔ جیسے چیخوف کی کہانی 'گرگٹ'، پریم چند کی کہانی 'پوس کی رات'، کرشن چندر کی 'مہا لکشمی کا پل'، منٹو کی 'ٹو بہ ٹیک سنگھ'، غیاث احمد گدی کی 'دیمک'، عبدالصمد کی 'گومڑ'، شموئل احمد کی 'بہرام کا گھر'، شوکت حیات کی 'ڈھلان پر رکے ہوئے قدم'، طارق چھتاری کی 'باغ کا دروازہ'، سید محمد اشرف کی 'نمبردار کا نیلا'، حسین الحق کی 'نیو کی اینٹ' وغیرہ اور اسی طرح کی دوسری کہانیاں اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

قاسم خورشید: افسانہ نگاری کا فن روایت کے مطابق یہی ہے کہ کسی واقعہ کو اختصار میں تخلیقی بیانیہ کے ساتھ فنکار پیش کیا کرتا ہے اور عموماً بہتر افسانہ اس مقام پر اختتام پذیر ہوتا ہے جہاں سے سوچ کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ افسانہ وہی کامیاب ہوتا ہے جو ہمیشہ قاری کے ساتھ سفر کرتا رہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نسل در نسل منتقل ہونے لگتا ہے۔ جیسے چیخوف کی کہانی 'گرگٹ'، پریم چند کی کہانی 'پوس کی رات'، کرشن چندر کی 'مہا لکشمی کا پل'، منٹو کی 'ٹو بہ ٹیک سنگھ'، غیاث احمد گدی کی 'دیمک'، عبدالصمد کی 'گومڑ'، شموئل احمد کی 'بہرام کا گھر'، شوکت حیات کی 'ڈھلان پر رکے ہوئے قدم'، طارق چھتاری کی 'باغ کا دروازہ'، سید محمد اشرف کی 'نمبردار کا نیلا'، حسین الحق کی 'نیو کی اینٹ' وغیرہ اور اسی طرح کی دوسری کہانیاں اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

ق ا : جب سے افسانے لکھے جا رہے ہیں اس میں سماجی پہلو کو ہمیشہ ترجیح دی گئی اور آج بھی اس موضوع کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آپ نے اپنے افسانوں میں اسے کس حد تک اپنانے کی کوشش کی ہے؟

قاسم خورشید: دراصل سماج کے ساتھ انسان کا جو رشتہ ہے وہ بہت ہی گہرا اور لازمی ہے۔ اس لیے زندگی کا کوئی بھی عمل اور خصوصی طور پر جو سماجی سروکار سے وابستہ ہے وہ سماج کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں تخلیق کار کسی بھی طرح خود کو سماج سے الگ رکھ کر نہیں سوچ سکتا ہے بلکہ اپنی غیر معمولی سوچ کی وجہ سے وہ ایسے

انٹرویو

موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جس پر عموماً ہماری نگاہ نہیں جاتی۔ جو تخلیق کار سماجی سروکار سے وابستہ نہیں ہوتا ہے وہ کسی بھی طرح کوئی بڑا شہ پارہ ہمارے ادب کو نہیں دے پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم نے بھی اسی طور پر سوچنے کی کوشش کی ہے۔

ق ا: آپ کی نظر میں افسانے کو کیسا ہونا چاہیے۔

قاسم خورشید: میرا اپنا یہ ماننا ہے کہ افسانہ محض کوئی واقعہ یا رپورٹ نہیں۔ افسانہ تو واقعے یا رپورٹ کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ ہمارے کامیاب ترین افسانے وہی ہیں جو تخلیقی بیانیے کے ساتھ قاری کو ایک نئی فکر سے آگاہ کرتے ہیں۔ کئی بار افسانہ ایک نشست میں پڑھنے پر قاری تک نہیں پہنچ پاتا لیکن جب وہ پوری تندہی اور جڑاؤ کے ساتھ دوبارہ اس کا مطالعہ کرتا ہے تو کئی ایسے منظر نامے روشن ہو جاتے ہیں جن سے وہ پہلی بار روشناس ہوتا ہے۔

ق ا: آپ کے افسانے لکھنے کا طریقہ کار کیا ہے؟

قاسم خورشید: یہ عجیب سا مرحلہ ہے کہ کوئی یہ پوچھے کہ آپ کے مسکرانے کا طریقہ کار کیا ہے؟ آپ کیسے گنگناتے ہیں؟ آپ کینوس پر کس طرح رنگ بکھیرتے ہیں؟ آپ کی روح کو کب اور کیسے تسکین ملتی ہے؟ دراصل تخلیق بھی اسی طرح اپنے جذبوں کی ترجمانی کیا کرتی ہے۔ کہیں کوئی خیال ذہن کے نہاں خانے میں کوندتا ہے تو وہ خیال تخلیقی پیرایۂ اظہار کی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔ اسی عمل میں کبھی افسانہ کبھی نقد کبھی کبھی تو پورا ناول ہی وجود میں آ جاتا ہے۔ اسی لیے افسانے کے بنیادی لوازمات کے پیش نظر خیال کے اظہار کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جانا ممکن ہو پاتا ہے کہ یہ ایک افسانہ بن پایا ہے۔ میں نے اپنے بیشتر افسانوں کو بُننے میں عموماً ایک ہی نشست لی ہے۔ ہاں خیال کی سطح پر کبھی کبھی مہینوں ان کے ساتھ رہا ہوں۔

ق ا: آپ اپنے افسانے میں اپنے تجربات و مشاہدات کو کس حد تک شامل کرنا چاہتے ہیں۔ یا صرف تخیلات و تصورات کے سہارے کہانیاں بُنتے ہیں؟

قاسم خورشید: نہیں! ایسا ممکن ہو سکتا ہے کہ محض تخیلات اور تصورات پر ہماری کہانیاں بُنی جائیں۔ میں شدت سے تسلیم کرتا ہوں کہ اگر ہمارے افسانے میں کہانی پن کا عنصر نہیں ہو تو پھر وہ کامیاب افسانہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ تخلیقی پیرایۂ اظہار متن کی پیش کش کے لیے انتہائی اہم ترین تخلیقی فریضہ ہے۔ میں بھی عموماً ایسے ہی مراحل سے گزرتا رہتا ہوں۔ خصوصی طور پر 'پوسٹر'، 'باگ دادا'، 'کئی کا راجکمار'، 'منیا'، 'اندر آگ ہے'، 'وہیل چیر پر سوئی ہوئی لڑکی'، 'دیواریں' اور 'درد گزرا ہے دبے پاؤں' کی تخلیق کے دوران میں نے واقعات کو پیش کرنے کے عمل میں یہ کوشش ضرور کی ہے کہ پیرایۂ اظہار کا تعلق متعلقہ متن سے کچھ ایسا ہو کہ قاری ان سے موثر ڈھنگ سے وابستہ ہو سکے۔ اور ہوا بھی ایسا ہی ہے۔ زیر بحث کہانیوں نے نہ صرف یہ کہ اردو میں بلکہ انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی ہمیں اپنی توقعات سے زیادہ کامیابیاں عطا کیں۔

ق ا: آزادی سے قبل افسانہ نگار اپنے افسانوں میں جس تکنیک کا استعمال کرتے تھے کیا آج کے افسانہ نگار اسی طرح کی تکنیک استعمال کرتے ہیں یا اس میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟

قاسم خورشید: ایسا ہے کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ افسانہ اپنے متن کے ساتھ بھی اکثر پیرایۂ اظہار یا تخلیقی بیانیہ لے کر آیا کرتا ہے۔ اب جہاں تک آزادی کے قبل کے افسانہ نگاروں مثلاً پریم چند، منٹو، کرشن چندر، بیدی، سہیل عظیم آبادی، سجاد ظہیر وغیرہ نے اپنے افسانوں میں بیانیہ کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے، ان کے بیانیہ میں کہانی پن کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ دیکھا جائے تو افسانے کا ایک روپ ان کے عہد میں ابھر رہا تھا۔ موضوعات بھی کم و بیش ایک ہی جیسے تھے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ افسانے کی کلاسیکی روایت یہیں سے قائم ہوئی اور پھر آنے والی نسلوں کے لیے ان کے افسانے مشعل راہ بنے جو تکنیک ہمارے بزرگ افسانہ نگاروں کے یہاں موجود تھی اسے ہی بعد میں وسعت دینے کی کوشش کی گئی جن میں قرۃ العین حیدر سر فہرست ہیں۔ ساتھ ہی عصمت چغتائی، بلراج مین را، آمنہ ابو الحسن، انتظار حسین، غیاث احمد گدی، اختر اورینوی، شکیلہ اختر، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، صالحہ عابد حسین، جیلانی بانو، زاہدہ حنا، فاطمہ حسن سے لے کر سلام بن رازق، انور خاں، آصف فرخی، احمد یوسف، شفیع جاوید، عبد الصمد، حسین الحق، جابر حسین، شموئل احمد، شوکت حیات، بانو قدسیہ، ذکیہ مشہدی، مشتاق احمد نوری، پرویز شہریار، اختر جاوید، وحید قمر، نگار عظیم، مشرف عالم ذوقی، ساجدہ زیدی، صادقہ نواب سحر، نور شاہ، عارف خورشید، تبسم فاطمہ، تسنیم کوثر، وحشی سعید وغیرہ نے افسانے کے موضوعات کے ساتھ تکنیک پر بھی بہت ہی Innovative طریقے سے کام کیا ہے۔ وجہ صاف ہے کہ آزادی سے قبل یا میں یہ کہوں کہ 1990 تک کے افسانہ نگاروں کے سامنے گلوبل ورلڈ کی چنوتیاں نہیں تھیں اس لیے یہ عہد اس معاملے میں اہم تصور کیا جاتا ہے کہ ہمارے تخلیق کاروں کے سامنے ایسا عالمی منظر نامہ ہے جو لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ ایسے وقت میں ادب کی آبیاری جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

ق ا: آج یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اردو افسانے میں فن دیکھنے کو نہیں مل رہا ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ان افسانوں میں فنی پختگی، نیاپن اور خلوص کی کمی ہے۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

قاسم خورشید: قطعی طور پر نہیں۔ اس لیے کہ اردو افسانہ فنی عروج کے لحاظ سے عالمی منظر نامے پر اپنی شناخت قائم کر چکا ہے۔ چونکہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو تہذیبوں کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے۔ لہجہ اگر اردو کا ہو تو پھر بیان میں ندرت ایک فطری عمل ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ متن کے اعتبار سے بھلے ہی ہندی میں بہتر افسانے لکھے جا رہے ہیں لیکن فنی لحاظ سے اردو افسانے آج بھی اپنی زندہ شناخت کے ساتھ قائم و دائم ہیں۔

ق ا: آپ کی شناخت ایک فکشن نگار کے ساتھ ساتھ معیاری شاعر کی بھی ہے۔ آپ سے میرا سوال ہے کہ اصناف کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

قاسم خورشید: میں سمجھتا ہوں کہ اصناف کا تعلق صرف متن کی ترسیل سے ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شاعر بڑا ہے، فلاں افسانہ نگار بڑا ہے، فلاں

ڈرامہ نگار بڑا ہے۔ بات دراصل یہاں صرف صنف پر آتی ہے۔ مگر آپ اصناف سے متعلق ہیں، اصناف کو سمجھتے ہیں، اصناف کے سلسلے میں آپ کی طبیعت موزوں ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے متن کو اس طور پر ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہم کسی متن کو شعر میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو ہم بہ آسانی اپنی موزونیت کے حساب سے اسے شعر میں ڈھال دیتے ہیں یا کبھی وہ متن افسانے کے لیے موزوں ہوا تو افسانہ بن جاتا ہے یا اگر وہ ناول کے لیے موزوں ہوا تو ناول بن جاتا ہے۔ اس لیے یہ بات ان لوگوں پر زیادہ لاگو ہوتی ہے جو کم از کم اصناف کے حوالے سے اپنے آپ کو بہت Comfortable محسوس نہیں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فلاں بڑا افسانہ نگار ہو گیا، فلاں بڑا شاعر ہو گیا۔ میں پتے کی بات بتاؤں؟ آدمی متن سے بڑا ہوتا ہے۔ آپ کا خیال کیا ہے؟ تصور کیا ہے؟ دراصل لوگ اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں بہت ساری مثالیں ہیں۔ شیکسپیئر کی مثال لے لیجیے، یا اگر فی الحال غالب کو ہی لیں تو ان کی نثر کا کوئی جواب نہیں۔ غالب اپنی شاعری کے علاوہ جب دوسری صنف یعنی نثر میں طبع آزمائی کرتے ہیں تو یہاں وہ متعلقہ صنف کے لوازمات کو مکمل طور پر برتنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اگر کرشن چندر کو لے لیجیے، احمد ندیم قاسمی کو لے لیجیے۔ انھیں آپ کسی خاص صنف کے ساتھ نہیں جوڑ سکتے۔ اگر معیار آپ کے پاس ہے، آپ کے تخیلات کے میلان میں بلندی ہے، اس میں اگر معیار ہے تو ہر جگہ وہ معیار جھلکے گا۔ چاہے آپ شاعری کر رہے ہوں، چاہے آپ افسانے لکھ رہے ہوں یا ناول نگاری کر رہے ہوں۔ میں تو اصناف کے سلسلے میں یہی مانتا ہوں اور اس میں مصمم یقین بھی رکھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ بہت اچھی شاعری کرتے ہیں، یا آپ بہت اچھے افسانے لکھتے ہیں، یا بہت اچھے ڈرامے لکھتے ہیں۔ دراصل میں مانتا ہوں کہ صرف اپنی باتوں کو رکھنے کے لیے جو فارم مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے اس فارم میں اسے ڈھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ق ا : ادب میں تنقید آپ کے لیے کس حد تک معنی رکھتی ہے؟

قاسم خورشید: میں سمجھتا ہوں کہ ادب کے وجود میں آنے کے بعد ہی تنقید سر اٹھانے لگتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ نقاد کا اپنا وجود اس وقت تک قائم نہیں ہو پاتا جب تک تخلیقی ادب منظر عام پر نہیں آتا۔ اس لیے اس حقیقت سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت ہی معمولی درجے کی تخلیق کی معتبریت اعلیٰ درجے کی تنقید سے بہر حال منفرد اور اوریجنل ہوتی ہے۔ دیکھیے! کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ہمارے ناقدین نے تخلیقی ادب یا اصناف ادب کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے بعد کی نسلوں نے کم و بیش انھیں ہی ملحوظ رکھ کر اپنی دکانیں سجائی ہیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اب تنقید کی صورت حال قدرے بدلی ہے آج کا ذمے دار نقاد اپنے وژن، تحقیق اور نظریے کے ساتھ تخلیقی ادب پر اپنی آراء پیش کر رہا ہے۔ اس لیے کئی بار انھیں نامساعد حالات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر نئی نسل جو تازہ کاری چاہتی ہے، جو گلوبلائزیشن سے واقف ہے وہ ایسے ناقدین کا خیر مقدم کرتی ہے اور انھیں معتبر او رمنفرد سمجھ رہی ہے۔ خصوصی طور پر شافع قدوائی، ارتضیٰ کریم، آصف فرخی اور ابو بکر عباد جیسے ناقدین جو اپنے موقف اور مکمل تحقیق اور تخلیقی شد بد کے ساتھ لکھتے ہیں وہ یقیناً محترم ہیں۔

جہاں تک ادبی معاملات ہیں میں ہندو پاک کے ادبی رویے کو بہت الگ نہیں مانتا خاص کر موجودہ عہد میں جبکہ پوری دنیا ایک گلوبل ولیج میں تبدیل ہوچکی ہے۔ ہم زبان تخلیق کاروں کا تقابل محض ملک کی تقسیم کی بنا پر کریں مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ آپ اندازہ لگائیں کہ جب اردو شاعری یا کہانیوں پر ہم گفتگو کرتے ہیں تو وہاں ملک قوم سے زیادہ ادبی معیار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ انتظار حسین ہمارے عہد کے بلکہ میں یہ کہوں کہ موجودہ اردو فکشن کے سب سے معتبر اور صاحب طرز ادیب ہیں۔

ق ا : موضوعات کے اعتبار سے اردو ہندی کہانیوں کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

قاسم خورشید: بلاشبہ موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے ہندی کہانیاں بہت معتبر اور محترم ہیں، جہاں تک فن کا تعلق ہے میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ فنی اعتبار سے اردو کہانیاں آگے ہیں، کیوں کہ ہر زبان کی اپنی تہذیب، اپنا ڈکشن اور اپنا طرز ہوتا ہے۔ اردو مخلوط تہذیب سے وابستہ ایک زبان ہے اس لیے تیسرے درجے کا متن بھی پڑھنے کی سطح پر معتبر لگتا ہے۔ ایسا ہونا فطری عمل ہے۔ ہندی میں لوگوں نے ایسے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جن پر کہانیاں لکھنے کے عمل میں ہماری روایتی، ادبی اور لسانی پاسداری سامنے آجاتی ہے۔ جیسے اودھیش پریت کی کہانی 'علی منزل'، رشی کیش سلبھ کی کہانی 'اَملی' اور پریم کمار منی کی کہانی 'املیاں' اور ایسی ہی بے شمار کہانیاں جو کافی مقبول ہونے کے ساتھ ہندی ادب کو ایک تنوع عطا کر گئیں ویسی کہانیاں اگر اردو میں لکھی جاتیں تو متن کی سطح پر ممکن ہے ہم خیال میں وہ فطری بہاؤ نہیں لا پاتے جو مذکورہ کہانیوں کا حصہ ہیں۔ میرا ہرگز یہ نظریہ نہیں ہے کہ یہاں کوئی تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے۔ بلکہ ترسیل کی سطح پر جو فطری معاملات اردو ہندی کی تخلیقات میں درپیش آئے ہیں یہاں ان کو میں بھی لکھتا رہا ہوں اور مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ جب میری کہانیاں ہندی میں منتقل ہوتی ہیں تو اردو کی سماجیات کا فقدان نظر آتا ہے۔ اس لیے ہم ان کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے متن کی پیش کش پر اور خصوصی طور پر لفظوں کے برتنے کے سلسلے میں اکثر سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

ق ا : ہندوستانی اور پاکستانی کہانیوں میں آپ فرق محسوس کرتے ہیں؟

قاسم خورشید: جہاں تک ادبی معاملات ہیں میں ہندو پاک کے ادبی رویے کو بہت الگ نہیں مانتا خاص کر موجودہ عہد میں جبکہ پوری دنیا ایک گلوبل ولیج میں تبدیل ہوچکی ہے۔ ہم زبان تخلیق کاروں کا تقابل محض ملک کی تقسیم کی بنا پر کریں مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ آپ اندازہ لگائیں کہ جب اردو شاعری یا کہانیوں پر ہم گفتگو کرتے ہیں تو وہاں ملک قوم سے زیادہ ادبی معیار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ انتظار حسین ہمارے عہد کے بلکہ میں یہ کہوں کہ موجودہ اردو فکشن کے سب سے معتبر اور صاحب طرز ادیب ہیں۔ میں نے خود اپنا ایک افسانوی مجموعہ 'ریت پر ٹھہری ہوئی شام' انھیں معنون کیا ہے یہاں آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انتظار حسین جو بظاہر پاکستان میں مقیم ایک تخلیق کار ہیں لیکن ہندوستانی ادب چاہے وہ اردو ہو، ہندی ہو، بنگلہ ہو، پنجابی ہو، کشمیری ہو یعنی تمام زبانوں میں ان کی تخلیقات منتقل ہوچکی ہیں اور پسند بھی کی جاتی ہیں اس لیے جہاں جوگیندر پال، جیلانی بانو، اقبال متین، قاضی عبدالستار، رتن سنگھ، سلام بن رزاق، رشید امجد، نور شاہ، انور قمر، سید محمد اشرف، عبدالصمد، جابر حسین، شفیع جاوید، حسین الحق، مشتاق احمد نوری، کیول دھیر، ذکیہ مشہدی، انجم عثمانی، انیس رفیع، ابن کنول، خالد جاوید، اسلم جمشید پوری، خورشید اکرم، ثروت خان، معین الدین جینابڑے، ترنم ریاض، زنفر کھوکھر، طارق چھتاری، وحشی سعید، شوکت حیات،

بلراج بخشی، پیغام آفاقی، مشرف عالم ذوقی، قمر جہاں، غضنفر، صادقہ نواب سحر، پرویز شہر یار، شائستہ فاخری، ترنم ریاض، شموئل احمد، انور امام، اختر آزاد، خورشید حیات، تبسم فاطمہ، تسنیم کوثر، سید احمد قادری، فخر الدین عارفی، عارف خورشید، وحشی سعید، صغیر رحمانی، ابرار مجیب، بشیر مالیر کوٹلوی، کہکشاں پروین، شفقت نوری وغیرہ کو ہم اردو فکشن کا اہم ترین تخلیق کار پسند کرتے ہیں وہیں پاکستان میں فاطمہ حسن، زاہدہ حنا، ناصر صدیقی، سید نسیم، آصف فرخی، طاہرہ اقبال، نگہت نسیم، سائرہ غلام نبی، ثمیرہ نقوی، آغا گل، نیلوفر اقبال وغیرہ اسی طرح دوسرے ممالک میں جیسے ستیہ پال آنند (امریکا)، قمر وحید (جرمنی)، شاہین کاظمی، (سوئٹزر لینڈ)، ڈاکٹر کوثر جمال (آسٹریلیا)، ممتاز حسین (امریکا)، نسیم سید (کناڈا)، سلمیٰ جیلانی (نیوزی لینڈ)، فرحت پروین (کناڈا) وحید احمد قمر (لندن)، امین صدرالدین بھایانی (امریکا)، نورالعین ساحرہ (امریکا) وغیرہ فکشن نگاروں کو اگر ہم ملک کی سرحدوں سے الگ ہٹ کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سوچ مکمل طور پر اردو فکشن کے Main Stream

جو لوگ ادب میں چور دروازے کے قائل ہیں ان کے لیے لابی ہی واحد راستہ ہے۔ اس سے ادب کے ساتھ قاری کا بڑا نقصان ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایسے ہی لوگوں کے فروغ کی وجہ سے ادب اور زبان کا خسارہ ہو جاتا ہے۔ آج اگر لوگ ادب سے دور ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ لابی کے پیش نظر ایسا ادب پروسا جا رہا ہے جو فرد واحد یا متعلق گروپ کو فائدہ تو پہنچا سکتا ہے لیکن زبان اور قاری کے نقصان کو کبھی پورا نہیں کر سکتا۔

سے وابستہ ہے۔ ویسے لوگ ہندوستان میں رہ کر بھی بیرون ملک کے احوال کا ذکر اپنی تخلیقات میں پوری شدت کے ساتھ کرتے ہیں اسی طرح بیرون ملک میں رہنے والا تخلیق کار ہمارے درد سے بھی بخوبی وابستہ ہوتا ہے۔ آپ خود محسوس کریں کہ جب کبھی کسی ملک میں کوئی بھی حادثہ رونما ہوتا ہے تو بیک وقت ساری عالمی برادری تخلیقی سطح پر صف آرا ہو جاتی ہے یہ معاملات صرف اردو میں نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ادیب بھی ہماری طرح ہی سوچتا ہے اس لیے مجھے ملک زادہ منظور احمد کا یہ شعر بے حد Relevent معلوم ہوتا ہے:

ایک عجب درد کا رشتہ ہے ساری دنیا میں
کہیں ہو جلتا مکاں اپنا گھر لگے ہے مجھے

ق ا : ادب میں رائج لابی نے ہمیں کس حد تک نقصان پہنچایا ہے؟

قاسم خورشید: دیکھیے! جو لوگ ادب میں چور دروازے کے قائل ہیں ان کے لیے لابی ہی واحد راستہ ہے۔ اس سے ادب کے ساتھ قاری کا بڑا نقصان ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایسے ہی لوگوں کے فروغ کی وجہ سے ادب اور زبان کا خسارہ ہو جاتا ہے۔ آج اگر لوگ ادب سے دور ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ لابی کے پیش نظر ایسا ادب پروسا جا رہا ہے جو فرد واحد یا متعلق گروپ کو فائدہ تو پہنچا سکتا ہے لیکن زبان اور قاری کے نقصان کو کبھی پورا نہیں کر سکتا۔ جو لوگ پُر اعتماد ہیں وہ خاموشی سے ادب تشکیل کر رہے ہیں۔ انھیں قطعی طور پر صلے کی کوئی پروا نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کا ادب حساس آبادیوں تک یقیناً پہنچ رہا ہے اور یہی آبادیاں مستقبل میں صحت مند ادب کا پتہ دیں گی۔ لابی کے نام نہاد تخلیق کار نیوز میں تو رہ سکتے ہیں، انعام بھی مل سکتا ہے، سیمناروں اور جلسوں کی رونق بھی بن سکتے ہیں لیکن ان کی معتبریت ہمیشہ مشکوک ہی رہتی ہے۔

ق ا : اخیر میں میرے ذہن میں یہ خیال آرہا ہے کہ آپ کے جو حالات تھے اگر انھیں پیش نظر رکھیں تو آپ کے لیے اتنا کچھ کر پانا کیسے ممکن ہو پایا۔

قاسم خورشید : میں مانتا ہوں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے جسے یاد رکھا جاسکے۔ میرا سفر تو جاری ہے۔ آپ اگر مانتے ہیں کہ میں نے بہت کچھ کر لیا ہے او رجسے آپ میرے حالات کے تحت اہم مان رہے ہیں تو یہ اور بات ہے۔ دراصل ہوا یوں کہ جب مجھے کچھ حاصل ہوا تو میرے لیے اس کی زیادہ اہمیت اس لیے نہیں رہی ہے کہ مزدور جب بہت زیادہ محنت کرنے کے بعد اجرت پالیتا ہے تو جلد ہی تھکن کی وجہ سے اس پر نیند حاوی ہو جاتی ہے۔ پھر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ شروع ہوتی ہے اس کی جدوجہد۔ اس کی اجرت سے تو دوسرے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ وہ نیند پر ہی اکتفا کر لیتا ہے کیونکہ آنے والے کل کی حقیقت سے وہ بخوبی واقف ہوتا ہے اور ایک اہم بات میرے ساتھ اور بھی ہے کہ جب اور جن لمحوں میں مجھے کسی کامیابی کی اشد ضرورت رہی، اس وقت حالات کی مہربانیوں سے جب یہ ممکن نہیں ہو پایا اور پھر جو حاصل ہوا وہ بھی میرے لیے نہیں رہا۔ کیونکہ کھلونوں سے بچپن میں تفریح کرنے کا وقت ہوا کرتا ہے۔ پھر بھی جستجو پر مجھے یقین ہے۔

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہوتا ہے

ق ا : اس انتہائی خوبصورت گفتگو کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ!

قسیم اختر

Qaseem Akhtar
At: Bahadur Pur, Post- Amour
Distt- Purnia Pin-854315 (Bihar)
Mob.: 9470120116
Email.: qaseemakhtar786@gmail.com

محمد افروز عالم

معاشرتی تربیت میں تعلیمی اداروں اور اساتذہ کا کردار

انسان فطرتاً معاشرہ پسند ہے۔ انسان اور دوسری مخلوقات میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ معاشرے میں رہے بغیر نہ تو وہ خوش رہ سکتا ہے اور نہ ہی اپنی صلاحیتوں کو فروغ دے سکتا ہے۔ ہر انسان کی یہ اوّلین خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک وسیع تر معاشرے کا رکن ہو۔ اس خواہش کی تسکین وہ مختلف قسم کی اجتماعی سرگرمیوں سے کرتا ہے۔ تربیت ان توقعات، معیار، اقدار اور طرزِ عمل کے مخصوص معمولات کو سیکھنے کا عمل ہے۔ تربیت ایک عمل ہے جس کے ذریعے ایک انسان کو اس کے گرد و پیش کے معاشرتی، ثقافتی اثرات کے توسط سے معاشرتی انسان بنایا جاتا ہے۔ کسی فرد کے معاشرتی انسان بنائے جانے کے عمل کو سماجی تربیت کہا جاتا ہے۔ معاشرے کے نقطۂ نظر سے یہ ایک ایسا طریقۂ عمل ہے جس کے ذریعے معاشرہ اپنی مخصوص ثقافت ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرتا ہے اور فرد ایک باضابطہ زندگی گزارنے کے قابل ہوتا ہے۔

معاشرتی تربیت ایک یا دو دن کا معاملہ نہیں بلکہ یہ مسلسل عمل ہے۔ یہ ایک طویل عمل ہے جو پیدائش سے لے کر فرد کی ساری عمر تک جاری رہتا ہے۔ اس طرح معاشرتی تربیت سے مراد وہ تربیت ہے جو فرد کو اپنے مخصوص معاشرے کے معیارات، طور طریقوں، اقدار، رسم و رواج سے واقفیت پہنچا کر ان کی اہمیت کو واضح کرے۔ معاشرتی تربیت کے لیے معاشرتی اداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ معاشرتی ادارے وہ ادارے ہوتے ہیں جو فرد کو اپنے سماج میں مطابقت دیں اور اسے معاشرے کے لیے مفید اور کارآمد بنا سکیں۔ یوں تو معاشرے میں ایسے متعد ادارے ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلیم و تربیت کے امور انجام دیتے ہیں لیکن عمرانیات کے ماہرین نے ان اداروں کو واضح عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ ایک کا تعلق غیر رسمی جیسے خاندان، پڑوسی، کھیل کے گروہ وغیرہ سے ہے۔ یہ افراد کو ثقافت اور شراکتی توقعات منتقل کرنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں جیسے رسمی ادارے پیچیدہ اور مخصوص قسم کے مسائل اپنے ذمے لیتے ہیں۔

اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ تعلیمی ادارے سیکھنے کا اہم وسیلہ ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ طلبہ مستقبل کے معمار ہیں۔ ملک کی ترقی اور خوش حالی کا دار و مدار ہی طلبہ پر ہوتا ہے کیونکہ انھیں آگے چل کر ملک و قوم کی باگ ڈور سنبھالنی ہوتی ہے۔ ایک طرف تو طلبہ ملک و قوم کے مستقبل کی تقدیر ہوتے ہیں تو دوسری طرف اپنے والدین کی امنگوں اور آرزوؤں کا مرکز بھی ہوتے ہیں۔ یہ دونوں نکات طلبہ کو معاشرے میں ایک مقام عطا کرتے ہیں۔ اس لیے عام طور پر طلبہ کی موزوں ترین و مناسب تعلیم و تربیت معاشرے کا اہم تقاضا ہے۔

تعلیم سے مراد بچے کو محض لکھنے پڑھنے اور حساب و کتاب کی تعلیم دینے تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس سے بچوں اور نوجوانوں کی پرورش اور تربیت ہوتی ہے۔ تربیت سے مراد وہ منظم سرگرمیاں ہیں جو کسی فرد کی متوازن نشو و نما کے لیے عمل میں لائی جاتی ہیں اور جس کے لیے معاشرتی اداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسکول کی جماعتوں میں ہی معاشرتی تربیت ملتی ہے جس سے بچے زندگی گزارنا سیکھتے ہیں۔ آج اس حقیقت کو اکثریت قبول کرتی ہے کہ اسکول میں جماعتوں کے کردار کی بہت اہمیت ہے۔ ان جماعتوں میں ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی ادارے شامل ہیں جو فرد میں معاشرتی شعور پیدا کرتے ہیں۔ ان میں ایسے اعمال کو فروغ دیتے ہیں جن کی بدولت طلبہ اپنے کردار اور شخصیت کو فروغ دیتے ہوئے تعلیم و تربیت کے عمل میں فعال کردار ادا کرتے ہیں۔

معاشرتی تربیت کے فروغ میں تعلیمی اداروں کا

کردار بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ ان اداروں کی بدولت طلبہ درسیات اور نصاب میں شامل سرگرمیوں کو سیکھتے ہیں۔ ان سرگرمیوں میں معاشرتی امور بھی شامل ہوتے ہیں جس کی تربیت سے طلبہ معاشرے میں مطابقت حاصل کرتے ہیں اور معاشرے میں مثبت تبدیلی کے ذمے دار ہوتے ہیں۔

تعلیمی اداروں میں اسکول کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ ان ہی کی بدولت طلبہ کو آگے بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ استاد جماعت کے اندر طلبہ کی تعلیم و تربیت کرتا ہے اور یہ نگرانی کرتا ہے کہ طلبہ کو کن مضامین میں دشواری ہے اور ان کو کس طرح حل کیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی دیکھتا ہے کہ طلبہ کن مضامین میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں تاکہ انھیں زیادہ محنت کرکے اس قابل بنایا جائے کہ وہ آگے چل کر انھیں مضامین میں ترقی کریں اور معاشرے کا اہم رکن بن کر معاشرے کو ترقی اور خوش حالی کی طرف گامزن کریں۔

> **معاشرتی تربیت ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے سے فرد کے کردار میں ایسی خوبیاں اور اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو اسے ایک اجتماعی یا معاشرتی ماحول میں مطابقت دیتے ہیں جن کے ذریعے سے وہ اپنی معاشرتی زندگی بسر کرتا ہے۔ لہٰذا معاشرتی تربیت سے مراد معاشرتی شعور کی تربیت ہے تاکہ فرد کو معاشرے میں رہنے سہنے کا شعور پیدا ہوجائے، وہ معاشرے میں مل جل کر رہے اور ایک دوسرے سے محبت، تعاون، ہمدردی اور اخوت و مساوات کا برتاؤ کرے۔**

معاشرتی عمل میں تعلیم کے کردار اور اس کے مقاصد نے تعلیم کو خود بھی ایک معاشرتی قوت بنا دیا ہے، جس کے ذریعے فرد کو معاشرے کے لیے فعال اور کارآمد کارکن بنایا جاسکتا ہے۔ اس طرح تعلیم معاشرے کے فرائض کی بجا آوری کا ذریعہ بنتی ہے۔ معاشرہ اپنے افراد کی تربیت کے لیے تعلیم کو بحیثیت وسیلہ اختیار کرتا ہے اور تعلیم معاشرتی تربیت کے عمل کی تکمیل کرتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

معاشرتی تربیت کا تصور

ماہرین نفسیات نے معاشرتی تربیت سے مراد فرد کی ان صلاحیتوں اور کردار کی تربیت لی ہے جو فرد کو معاشرتی مطابقت سے ہمکنار کرتی ہے۔ فرد کو معاشرے میں ملنسار بنانا اور اسے مل جل کر رہنے کی صلاحیت سے ہمکنار کرنا ہے۔ معاشرتی تربیت ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے سے فرد کے کردار میں ایسی خوبیاں اور اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو اسے ایک اجتماعی یا معاشرتی ماحول میں مطابقت دیتے ہیں جن کے ذریعے سے وہ اپنی معاشرتی زندگی بسر کرتا ہے۔ لہٰذا معاشرتی تربیت سے مراد معاشرتی شعور کی تربیت ہے تاکہ فرد کو معاشرے میں رہنے سہنے کا شعور پیدا ہوجائے، وہ معاشرے میں مل جل کر رہے اور ایک دوسرے سے محبت، تعاون، ہمدردی اور اخوت و مساوات کا برتاؤ کرے۔

ماہرین نفسیات نے فرد کی معاشرتی تربیت کے مندرجہ ذیل معیارات کو بیان کیا ہے۔ اگر ہمیں اپنے بچوں کو بہتر تربیت دینی ہے تو ہمیں ان باتوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

i) فرد کا کردار اور تربیت معاشرتی اقدار سے ہم آہنگ ہو۔
ii) اپنے ذاتی مفاد پر معاشرے کے مفاد کو ترجیح دینا۔
iii) معاشرتی تربیت میں وطن و قوم کے اتحاد کو مدنظر رکھنا۔
iv) تربیت معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔
v) دوسروں کے کاموں کی ہمت افزائی کا جذبہ پیدا ہو۔
vi) فرد میں اچھے اوصاف پیدا کیے جائیں۔
vii) فرد کی خواہشات اور مقاصد معاشرتی اقدار سے ہم آہنگ ہوں۔

تعلیم بحیثیت معاشرتی عمل

معاشرتی نوعیت کے اعتبار سے تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے۔ بقول خواجہ غلام السیدین "تعلیم اور تمدن ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ تعلیم کوئی ایسا نظام نہیں ہے جس کو بعض ضروریات کے تحت انسان نے قائم کرلیا ہو، وہ تو دراصل تمدنی زندگی کے رگ و ریشے میں پیوست ہے۔ ہم اس کے ذریعے سے آنے والی نسلوں کو بہترین معاشرتی اقدار اور اصولوں سے روشناس کرتے ہیں اور اس کے وسیلے سے معاشرہ فلاح و بہبود سے ہمکنار ہوتا ہے اور بچوں میں ایک بہتر معاشرے کی تخلیق کا جذبہ اور صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔''

جان ڈیوی نے تعلیم بحیثیت معاشرتی عمل کے سلسلے میں کہا ہے کہ ''تعلیم بنیادی طور پر ایک معاشرتی عمل یا شے ہے اور معاشرے کو ضبط میں لانے کے لیے ایک قوی محرکہ ہے۔ معاشرے اور تعلیم میں گہرا ربط ہے اور دونوں ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا نصاب معاشرتی تقاضوں اور اقدار کو مدنظر رکھ کر بنایا جاتا ہے۔ نصاب تعلیم میں معاشرتی تغیرات کے تحت تبدیلیاں ہوتی ہیں اور اس طرح تعلیم برابر متحرک رہتی ہے۔''

> **تعلیم بنیادی طور پر ایک معاشرتی عمل یاشے ہے اور معاشرے کو ضبط میں لانے کے لیے ایک قوی محرکہ ہے۔ معاشرے اور تعلیم میں گہرا ربط ہے اور دونوں ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا نصاب معاشرتی تقاضوں اور اقدار کو مدنظر رکھ کر بنایا جاتا ہے۔ نصاب تعلیم میں معاشرتی تغیرات کے تحت تبدیلیاں ہوتی ہیں اور اس طرح تعلیم برابر متحرک رہتی ہے۔**

تعلیمی عمل کی نوعیت معاشرتی عمل کے لحاظ سے حرکی بھی ہے۔ کیونکہ تعلیم سے فرد میں معاشرتی تقاضوں کے تحت اس کے کردار اور شخصیت میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں جو کہ فرد کو معاشرے کے تغیرات کے تحت مطابقت فراہم کرتا ہے۔ غرض یہ کہ تعلیم کے توسط سے ایک نسل دوسری نسل کے ثقافتی ورثے، قیمتی تجربات کے نتائج، تخلیقی صلاحیتوں اور بہتر معاشرتی مطابقت سے ہمکنار کرتی ہے۔

تعلیمی اداروں میں معاشرتی تربیت کے اصول

تعلیمی اداروں میں معاشرتی تربیت مندرجہ ذیل اصول کے تحت ہوسکتی ہے:

i) بقول ہاورتھ، اسکول میں وہ تمام عمدہ اثرات مشاغل مہیا کیے جائیں جو تمدنی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔ یعنی اسکول معاشرے کے مطابق ہو اور اس میں معاشرتی زندگی کا نمونہ اپنایا جائے۔

ii) اسکول کی تنظیم بیرونی دنیا کی بنسبت زیادہ سادہ اور واضح ہونی چاہیے تاکہ اس کا نظم و نسق اور اصول بچوں کو سمجھ میں آسکے۔ موجودہ زمانے کا نظام اتنا پیچیدہ اور وسیع ہے کہ بچے کو اُسے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ لہٰذا اسکولوں میں وہ عناصر اپنائے جائیں جو بچوں کی زندگی

کے ساتھ ہم آہنگ ہوں دلچسپ مشاغل رکھے جائیں جس سے طلبا کو مسرت حاصل ہو اور ان کی پوشیدہ صلاحیتیں بھی بیدار ہوں۔

(iii) برے اثرات سے تمدنی عناصر پاک ہوں۔ مفکرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ تمدنی ورثے سے وہ چیزیں لیں جو ترقی کے لیے مفید ہوں اور ہمارے معاشرہ و ملک کے شایانِ شان ہوں۔

(iv) معاشرتی زندگی کی تنظیم میں طلبہ کو اختیار حاصل ہو کیونکہ جب تک طلبا کو اسکول کے معاشرتی معاملات میں آزادیِ عمل حاصل نہ ہوگی تو وہ اتفاق رائے سے زندگی کے مسائل کو طے کرنا نہ سیکھیں گے نہ ان میں اعتماد پیدا ہوگا اور نہ مفاہمت کی عادت پیدا ہوگی یہی وہ چیزیں ہیں جن پر معاشرتی زندگی کا انحصار ہے۔

معاشرتی تربیت میں تعلیمی اداروں کا کردار

یوں تو بچے کی معاشرتی تربیت کو متاثر کرنے میں متعدد ذرائع اپنا کردار ادا کرتے ہیں مثلاً مذہبی ادارے، حکومت، الیکشن، سماجی ادارے، زبان اور تعلیم وغیرہ۔ لیکن ان تمام ذرائع میں تعلیم بچے کی معاشرتی تربیت پر شدید اثر انداز ہوتی ہے۔ بچوں کی معاشرتی تربیت میں تعلیمی اداروں کا خاص مقام ہے۔ اسی کے ذریعے معاشرتی اقدار بچوں میں منتقل کی جاتی ہیں۔

Ivor Morrish نے اپنی کتاب تعلیم کی عمرانیات میں تعلیمی ادارے کے معاشرتی عوامل کی نوعیت پر بخوبی روشنی ڈالی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسکول ایک مخصوص قسم کا تعلیمی ادارہ ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی ایک قسم بھی ہے۔ جس طرح جماعت یا طبقہ بذاتِ خود معاشرہ ہے اسی طرح اسکول بھی ایک طرح کا معاشرہ ہے۔ سوسائٹی اور طبقے کی طرح اسکول میں بھی اجتماعی احساسات و تعلقات اور مشترکہ عمل کی روح ملتی ہے اور اس معاشرے کی ترقی کا انحصار صدر، ادارہ، اسٹاف ممبران اور تعلیمی مقاصد کی نوعیت اور نظریات پر ہے۔

لہٰذا معاشرتی تربیت میں تعلیمی ادارے بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں جسے ہم یوں بیان کر سکتے ہیں:

(i) فرد کی شخصیت کی تعمیر کرنا
(ii) عملی زندگی کی تربیت دینا
(iii) معاشرے کے روایات و اقدار کا تحفظ کرنا
(iv) نظم و ضبط کا عادی بنانا
(v) پیشہ ورانہ تربیت فراہم کرنا، وغیرہ

معاشرتی تربیت میں اساتذہ کا کردار

اساتذہ معاشرتی تربیت کا وہ اہم عنصر ہے جسے تعلیمی اداروں میں بھی مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور معاشرے میں بھی نمایاں مقام۔ وہ نہ صرف درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں بلکہ معاشرتی تربیت بھی طلبا کو فراہم کرتے ہیں۔ معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشرے کی بہترین اقدار کو طلبا کے اذہان میں منتقل کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں معاشرتی قدروں کے تحفظ کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

اساتذہ تعلیمی اداروں میں نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعے طلبا میں معاشرتی شعور کو اجاگر کرتے ہیں۔ اساتذہ نہ صرف تدریسی فریضہ انجام دیتے ہیں بلکہ وہ معاشرے کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کے لیے معاشرتی تقاضوں کو نصاب میں شامل کرنا ہے

دور حاضر کا تقاضا ہے کہ معاشرتی تربیت کے فروغ میں تعلیمی ادارے اس بنیاد پر قائم کیے جائیں کہ طلبا کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں کے عمل میں تمدنی زندگی کی روح پائی جاتی ہو۔ معاشرتی تربیت کے فروغ میں تعلیمی ادارے کی حیثیت بڑی دنیا کے مقابلے میں ایک چھوٹی دنیا کی سی ہوتی ہے جہاں طلبا معاشرے میں رہنے کے طور طریقے سیکھتے ہیں۔ اساتذہ کی نگرانی میں مختلف مشاغل و امور سیکھتے ہیں اور اس طرح وہ معاشرتی تربیت حاصل کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔

لیکن اس اہم کام کے لیے خود اساتذہ کو معاشرتی تقاضوں اور روایات سے اچھی طرح آگاہ رہنا ہوگا جس قدر اساتذہ اپنی تدریس میں معاشرتی قدروں سے تعلق و مطابقت پیدا کریں گے اسی قدر ان کی تدریس بہتر اور موثر ہوگی اور ایسی تدریس طلبا کو معاشرتی ہم آہنگی سے ہمکنار کر سکتی ہے اور تمدنی زندگی کا اہل بنا سکتی ہے۔

بقول پروفیسر فنڈلے: تعلیم ان تدابیر اور وسائل کے مجموعے کا نام ہے جو نو عمر طلبا کو تمدنی زندگی کا اہل بنانے کے لیے بلا ارادہ کام میں لائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے سے ان کے دماغوں کو بعض خاص اثرات اور مقاصد سے متاثر کیا جاتا ہے۔ یہ عمل اسی وقت بہتر ہوسکتا ہے جب معلم کا معاشرے سے رابطہ قائم ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کے جدید تقاضوں اور قدروں کے مطابق طلبا کے ذہن پر اچھے اور نئے اثرات ڈال سکے۔

اساتذہ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر اسکول کے علاوہ دوسرے معاشرتی ادارے بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور طلبا ان سے بھی متعدد قسم کی آموزش حاصل کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ان معاشرتی اداروں سے استاد واقف نہ ہوگا اور ان کی کارگزاریوں پر نظر نہ رکھے گا تو ہوسکتا ہے کہ اس کی تعلیم و تدریس طلبا کے لیے متضاد معلومات کی حامل ہو اور اس طرح طلبا میں ذہنی الجھنیں پیدا ہوں۔

خلاصہ

دورِ حاضر کا تقاضا ہے کہ معاشرتی تربیت کے فروغ میں تعلیمی ادارے اس بنیاد پر قائم کیے جائیں کہ طلبا کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں کے عمل میں تمدنی زندگی کی روح پائی جاتی ہو۔ معاشرتی تربیت کے فروغ میں تعلیمی ادارے کی حیثیت بڑی دنیا کے مقابلے میں ایک چھوٹی دنیا کی سی ہوتی ہے جہاں طلبا معاشرے میں رہنے کے طور طریقے سیکھتے ہیں۔ اساتذہ کی نگرانی میں مختلف مشاغل و امور سیکھتے ہیں اور اس طرح وہ معاشرتی تربیت حاصل کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا معاشرتی تربیت کے فروغ میں اساتذہ طلبا میں ایسے احساسات اور جذبات کی پرورش کریں جن سے ان میں انسانیت، اخوت، محبت، ہمدردی، مساوات، عدل، نظم و ضبط اور خود اعتمادی جیسے اوصاف پیدا ہوں۔ استاد بچے کا روحانی باپ ہوتا ہے، اس لیے اساتذہ کو چاہیے کہ طلبا پر بھرپور توجہ دیں اور اس میں ایسی صلاحیتیں اجاگر کریں جو اس کو معاشرے کا مفید رکن بننے میں مدد دیں۔

حوالہ جات:

(1) خواجہ غلام السیدین: اصول تعلیم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
(2) ڈی ایس گورڈن: اصول تعلیم اور عمل تعلیم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
(3) جان ڈیوی: اسکول اور سوسائٹی
(4) ہاورتھ: آرٹ آف ایجوکیشن
(5) آئیور مارش: تعلیم کی عمرانیات
(6) فنڈلے: تعلیم کی بنیادیں

■

Md. Afroz Alam ...
Assistant Professor, Dept of Education & Training, Maulana Azad National Urdu University, Gachibowli, Hyderabad - 500032 (Telangana)
E-mail: afrozmanuu@gmail.com

مولانا آزاد کے روشن افکار

امام اعظم

مولانا ابوالکلام آزاد بنیادی طور پر ایک دانشور اور متبحر عالم تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی وزارت میں مولانا آزاد کو وزیر تعلیم کا عہدہ دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جانتے تھے کہ مولانا کو اپنے ملک، اس کی تہذیب، قومی یکجہتی اور تعلیم کے فروغ و اشاعت سے گہری دلچسپی ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد انگریزوں نے جو کچھ چھوڑا تھا، اس میں نفرت زیادہ تھی اور آپسی اعتماد و اعتبار گم ہوتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں ایک ایسی تعلیمی پالیسی کی ضرورت تھی جس سے انگریزوں کی نفرت انگیز پالیسی کو ختم کیا جا سکے تاکہ تعلیمی اداروں سے صرف کلرک نہ پیدا ہوں بلکہ بدلے ہوئے حالات میں ملک کی ضرورت کی تکمیل اور ملک کی ترقی کے لیے کام کرنے والے لوگ نکلیں، ساتھ ہی ملک کو خود کفیل بھی بنانا تھا۔ اس لیے بہت باشعور آدمی ہی اس اہم موڑ پر ملک کے لیے اس کی ضرورتوں کے مطابق بہتر تعلیمی پالیسی کی تشکیل اور تنفیذ کر سکتا تھا۔ رادھا کرشنن جو بعد میں ہندوستان کے صدر بھی ہوئے ان کی کتاب "Eastern & Western History of Philosophy" میں مولانا آزاد نے جو تمہید لکھی اس میں اس بات کو واضح طور پر بتایا ہے کہ مشرق اور مغرب کی ملی جلی جانکاری سے ہی صحیح علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے انسان اور سماج کی ترقی ہو سکتی ہے۔

مولانا کے ذہن میں یہ بات بالکل صاف تھی کہ تعلیم صرف کاروباری یا اقتصادی معاملہ نہیں ہے کہ وہ لفظ پڑھ کر آدمی روزی روٹی کمانے لگے۔ یہ تو صرف اس کا ایک پہلو ہے۔ آدمی کو جدید بنانے میں اور آزاد شخصیت کو نکھارنے میں تعلیم کا اہم رول ہے اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہی اصل تعلیم ہے۔

ملک کی تہذیب کے مطابق مولانا تعلیم میں یہاں بسنے والے مختلف مذاہب، ذات اور زبان کے بولنے والوں کے جذبات کی بھی جھلکیاں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے دور وزارت میں ان ساری باتوں کا خاص خیال رکھا۔

پنڈت نہرو کے افکار سے وہ متفق تھے۔ ملک میں بڑے بڑے کارخانے لگانے کی بات کرتے تھے جس سے ایک نئے سماج کی تعمیر ہو سکے۔ ظاہر ہے اگر بڑے کارخانے ہمیں لگانے ہیں تو ان کے لیے سائنس داں اور تربیت یافتہ لوگوں کی ضرورت بھی ہوگی۔ اسی کے ذریعے ہم جدید عہد میں داخل ہو سکتے ہیں اور بے روزگاری کے مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔ مولانا نے ملک کے لیے جو تعلیمی پالیسی وضع کی، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آج ہمارا ملک سائنسی اعتبار سے ایشیا کے ترقی یافتہ ممالک میں سے ایک ہے۔ یہ وقت کی اہم ضرورت تھی، لہٰذا انھوں نے وقت کے مطالبات کے مدنظر اس طرف خاص توجہ دی۔ ملک کا پورا تعلیمی ڈھانچہ مولانا آزاد ہی کا بنایا ہوا ہے۔

مولانا نے سائنسی تعلیم کی ترقی کے لیے شانتی سروپ بھٹناگر جیسے سائنس داں کی قیادت میں سائنس کی اعلیٰ تحقیقات کا ادارہ بنایا اور نیوکلیائی ایٹمی توانائی کے لیے الگ سے ایک ادارہ قائم کرایا۔ صنعت و حرفت، زراعت اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں کام کرنے والے سائنس دانوں کے لیے ایک طرف 'انڈین کاؤنسل فار ایگری کلچرل اینڈ سائنٹفک ریسرچ' قائم کیا تو دوسری طرف طبّی ترقی کے لیے 'انڈین کاؤنسل فار میڈیکل ریسرچ' بنائی گئی یعنی ملک میں اعلیٰ تکنیکی اور سائنسی تحقیق کی مولانا کے زمانے میں بنیاد ڈالی گئی تاکہ ریسرچ کے ذریعے زراعت و صنعت اور سائنس و ٹکنالوجی کو نئی سمت دی جا سکے۔

سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم اور اس کے استعمال کے معاملے میں مولانا آزاد کا نظریہ بالکل واضح تھا۔ انھوں نے خود خالص مشرقی تعلیم پائی تھی مگر انگریزی تعلیم پر زیادہ زور دیا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ نہ صرف مغربی علوم اور سائنس کے لیے بلکہ بین الاقوامی تعلقات کے لیے بھی ایک زنجیر کا کام دیتی ہے۔ مولانا جانتے تھے کہ سائنس کے خطرات اور غلط استعمال سے بچنے کے لیے اسے تہذیبی اور مذہبی کنٹرول میں رہنا چاہیے۔ سائنس کی خوبیوں، کمالات اور خدمات کو وہ سراہتے تھے لیکن یہ بھی چاہتے تھے کہ ہمارے سماج میں عوام و خواص جدید تعلیم سے آراستہ ہوں اور اپنی قومی میراث سے بے تعلق نہ ہوں۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی سطح کو بلند کرنے کے لیے مولانا بہت زور دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر بنیادی تعلیم پر محنت ہوگی تو ثانوی تعلیم کے لیے اچھے طلبا ملیں گے اور ثانوی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جا سکے گی تب ہی اعلیٰ تعلیم کی سطح بلند ہوگی۔

مولانا نے اپنی تعلیمی پالیسی میں اس بات کا بھی خیال رکھا کہ سماجی علوم اور فنونِ لطیفہ کو بھی ساتھ ساتھ فروغ دیا جائے۔ سماجی علوم کے لیے انڈین کاؤنسل فار ہسٹوریکل ریسرچ اور انڈین کاؤنسل فار سوشل سائنس ریسرچ کا ادارہ قائم کیا گیا جس کا دائرہ تاریخ سے لے کر اقتصادیات اور سماجی میدان تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دو اور ادارے ایک انڈین کاؤنسل فار کلچرل

ریلیشنز اور دوسرا انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز مولانا کی سرپرستی میں 'سپرو ہاؤس' میں کھولا گیا۔

مولانا آزاد نے مذہب اور تعلیم کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھا بلکہ ایک مکمل نظام حیات کے حصول میں ان کے مشترکہ رول کی اہمیت بیان کی ہے۔ مولانا آزاد کے تعلیمی فلسفے کا ایک رخ مشرق جدید کو ایک اکائی کے طور پر دیکھنے میں مضمر ہے۔ انھوں نے اپنے کانگریسی خطبات میں بار بار مشرق کو ایک طاقتور سیاسی، سماجی اور تہذیبی یگانگت کے روشن مینار کے طور پر دیکھا ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد انسان کو اس کے ماحول کے ساتھ اور ماحول کو انسان کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے۔ ہندوستان کی مخصوص تہذیب و کلچر کو وہ جس قدر عزیز رکھتے تھے اسی کے پیش نظر بطور وزیر تعلیم انھوں نے فنون لطیفہ کے تحفظ کے لیے عملی اقدامات اٹھائے۔ ساہتیہ اکیڈمی، سنگیت ناٹک اکیڈمی اور للت کلا اکیڈمی کے جو کارنامے آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں وہ سب مولانا آزاد کے تصورات کے عملی نمونے ہیں۔ وہ تعلیم کے شعبے میں حکومت کی دخل اندازی کے مخالف تھے۔ بالخصوص اعلیٰ تعلیم و تحقیق کو بالکل آزادانہ طور پر چھوڑ دینے کے ہم خیال تھے۔ اس لیے یونیورسٹی کی آزادی کے تحفظ کے پیش نظر انھوں نے UGC جیسا عظیم الشان ادارہ قائم کیا تاکہ اعلیٰ تعلیم کو مزید وسائل میسر آسکیں اور سرکاری مداخلت کم ہو۔ ان اکادمیوں کا کام صرف یہ نہیں تھا کہ وہ ملک کے مشہور فن کاروں کو انعام دیں بلکہ یہ تھا کہ ملک کے مختلف حصوں کے ادب و فن کے مختلف Talents کو سمیٹ کر انھیں قومی منچ پر ایک اکائی کی شکل میں پیش کیا جائے۔

مولانا نے اپنی تعلیمی پالیسی کے ذریعے مغربی ایشیا کے مسلم ممالک سے تہذیبی اور سیاسی تعلقات کو مستحکم کرنے کی راہ نکالی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے عربی کا ایک رسالہ 'ثقافت الہند' اپنے دوست عبدالرزاق ملیح آبادی کی دیکھ ریکھ میں نکالا، جس میں تعلیم کے ذریعے مسلم ملکوں اور ہندوستان کی اہمیت پر اور ان سے تعلیم کے میدان میں کیا کچھ تعاون لیا جاسکتا ہے یا تعاون دیا جاسکتا ہے اس سلسلے میں مولانا نے بہت کچھ لکھا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مشرقی تعلیم کے ادارے، حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں اسلامی تعلیمی ادارہ کے فروغ میں مولانا آزاد کا بڑا اہم رول ہے۔

مولانا کو تاریخ سے خاص لگاؤ تھا، اس لیے انھوں نے نیشنل آرکائیوز اور نیشنل میوزیم پر خصوصی توجہ دی جہاں ماضی کے بیش قیمت مخطوطے اور نقوش محفوظ رکھے جاسکیں۔ مولانا نے سنسکرت کی قدیم وراثت کو بچائے رکھنے اور اس کی توسیع واشاعت پر بھی پورا زور دیا۔

مولانا نے وزارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد مسلمانوں کے مذہبی اداروں اور تعلیم کے میدان میں کام کرنے والوں کی ایک کانفرنس بلائی۔ لکھنؤ کی اس کانفرنس میں انھوں نے مدرسوں کے نصاب کو جدید بنانے پر زور دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سائنس، ٹکنالوجی اور سماجی میدان میں جو ترقی ہورہی ہے وہ مدرسوں کے نصاب میں شامل ہو تاکہ دینی اور دنیاوی تعلیم کا سنگم ہوسکے۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کا جدید تعلیم پر بھی خاصا زور تھا۔

مولانا آزاد ملک کو ہر میدان میں آگے بڑھانا چاہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ تعلیمی پالیسی ایسی ہونی چاہیے جو زمانے کا ساتھ دے سکے۔ ہمارے ملک کی تہذیب و ثقافت کی مناسبت سے ہو اور وہ تعلیم جو ملک کے اندر انگریزوں کی پھیلائی ہوئی ہے اور جس میں غلط نظریے سموئے ہوئے ہیں، اس کا خاتمہ ہونا چاہیے۔

مولانا اپنی علمی بصیرت، ذہنی کشادگی اور ملک سے والہانہ لگاؤ کے سبب ہمہ جہت ترقی کے لیے انسانوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو جدید عہد کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسی کے پیش نظر مولانا نے نہایت جامع تعلیمی پالیسی وضع کی، مگر ہمیں اس بات پر بے انتہا حیرت ہوتی ہے کہ مولانا جیسے بلند پایہ ماہر تعلیم کے انتقال کے برسوں بعد مرکزی حکومت کو یہ خیال آیا کہ ملک میں قومی یوم تعلیم منانے کے لیے کسی ایک دن کا انتخاب کیا جائے اور یہ دن مولانا آزاد کی ولادت باسعادت کے دن سے بہتر اور کون سا ہوسکتا ہے۔ لہٰذا گزشتہ کئی برسوں سے ہم ۱۱؍نومبر کو قومی یوم تعلیم منارہے ہیں۔

مولانا کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ علم و فضل اور سیاسی سوجھ بوجھ میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ صحافت اور سیاست ان کی زندگی کے دو نمایاں پہلو تھے۔ 'الہلال' اور 'البلاغ' کی اشاعت کا طنطنہ اس کا شاہد ہے۔ مجاہدِ آزادی بھی تھے اور شہر بدر ہونا اور سلاخوں کے پیچھے رہنا ان کے معمولاتِ زندگی میں شامل تھا۔ وسیع النظر ہونا اور عالمی سطح پر علمی کوششوں کو جس میں سائنسی کوششیں بھی شامل ہیں' پر مضامین لکھنا ان کی وسیع النظری اور وسیع القلبی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ ان کی انشاء پردازی، ان کی تحریری لطافت، ان کا Sense of Humour بامِ عروج پر تھا۔ 'الہلال' 13 جولائی 1912ء میں افقِ صحافت پر نمودار ہوا تو اس کی تیز کرنیں پورے ملک میں پھیل گئیں جنھوں نے عوام الناس کو بیدار کردیا۔ 'الہلال' کی اشاعت صحافت کی ترقی کا مسئلہ تھا' نہ ہی قلم کی جولانی دکھانے کا کوئی آلہ، یہ تو قومی ترقی کو فروغ دینے کا ترجمان تھا۔ یہاں عقل کی گنجائش تھی نہ نفع کا سودا۔ 'الہلال' کے تیسرے شمارے کے شذرات میں مولانا لکھتے ہیں:

''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاشِ زیاں ونقصان میں آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے

> مولانا آزاد ملک کو ہر میدان میں آگے بڑھانا چاہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ تعلیمی پالیسی ایسی ہونی چاہیے جو زمانے کا ساتھ دے سکے۔ ہمارے ملک کی تہذیب و ثقافت کی مناسبت سے ہو اور وہ تعلیم جو ملک کے اندر انگریزوں کی پھیلائی ہوئی ہے اور جس میں غلط نظریے سموئے ہوئے ہیں، اس کا خاتمہ ہونا چاہیے۔

پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیائے سیم وزر کو قربان کرنے کے لیے بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے آئے ہیں......

بدہ بشارتِ طوبیٰ کہ مرغِ ہمتِ ما
براں درخت نشیند کہ بے ثمر باشد

('الہلال' جلد:1، شمارہ:3، صفحہ 2)

'الہلال' کی اشاعت نے سوتے کو جگایا۔ اس سے صرف صحافت کی دنیا ہی میں انقلاب نہیں آیا بلکہ ملکی، ملی اور سیاسی روشن خیالی بھی عام ہوئی۔ جذبۂ حریت کو فروغ دینے میں اس اخبار نے جو کردار ادا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ 'الہلال' مولانا آزاد کی علمی، ادبی، دینی اور سیاسی بصیرت کا آئینہ دار تھا۔ اس پر ان کی شخصیت کی چھاپ تو تھی ہی لیکن سب سے بڑھ کر ہندوستانیوں کے سوئے ہوئے ذہن کو جگانے کا ایک پیغام تھا۔ مولانا کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کو علمی، فکری اور عملی سطح پر بیدار کرنا

تھا اور ہندوستانیوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص، غلامی کی زنجیر کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر یکجا کرنا تھا۔ انھوں نے ہر ہر لفظ کو جذبۂ حریت کا ایک جام اور آزادی کی جدوجہد کا پیغام بنا دیا تھا۔ ہر لفظ جذبے کی تیز و تند آنچ میں ڈھلا ہوا ایک شعلہ تھا۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں میں نہ صرف محبت کی جوت جگائی بلکہ انھیں تازیانے بھی لگائے۔ مسلمانوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ بھی اس جہدِ آزادی میں اپنا فرض ادا کریں۔ وہ قومیں جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہیں' صفحۂ ہستی سے مٹادی جاتی ہیں۔ ان کا پیغام غیر متزلزل تھا۔ اس میں کوئی تذبذب نہ تھا۔ وہ آزادی کا پیغام دینے کے لیے جیل جانے کو تیار تھے۔ گھر کے زیورات گروی رکھے گئے لیکن پیغام کا سلسلہ جاری رہا۔ ''الہلال' 18 دسمبر 1912 کے شمارے میں کہتے ہیں:

''ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے کہا تھا...... جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جاچکا ہے اور اس کی زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں...... اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلوتہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمھارے گروہ نے جو 7 کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا' ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے مٹ جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان کا جھنڈا پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے پر تمسخر کیا کرتے تھے۔''

انھوں نے کلکتہ سے اس ہفت روزہ اخبار کا اجراء کر کے اردو صحافت کی تاریخ میں ایک شان دار باب کا اضافہ کیا۔ 'الہلال' مولانا آزاد کی تعلیمی، ادبی، دینی و سیاسی بصیرت کا عکس تھا۔ اس پر ان کی شخصیت کی پوری چھاپ ملتی ہے۔

مولانا کی صحافت سے مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑ گئی اور وہ آزادی کی راہ میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ شانہ بشانہ گامزن ہوگئے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تین ماہ کے اندر اس کے تمام شماروں کو دوبارہ طبع کرانا پڑا۔ اتنا ہی نہیں 'الہلال' کی اشاعت پچیس ہزار کی حد کو پار کر گئی جو اس وقت کے لحاظ سے ایک بڑی بات تھی۔ 'الہلال' کی امتیازی خصوصیت اس کے عالمانہ مضامین اور مولانا آزاد کا انفرادی اسلوب تھا۔

مولانا آزاد کی پرورش و پرداخت خالص دینی ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کی فطرت شروع سے باغیانہ رہی جو غلامی کو قبول نہیں کرسکتی تھی۔ اس کا ثبوت ان کا اسلوب نگارش ہے۔ ان کی نگارشات کا اسلوب و آہنگ جداگانہ ہے۔ پسِ دیوارِ زنداں لکھے جانے والے 'غبارِ خاطر' کے خطوط ہوں یا 'الہلال' و 'البلاغ' کا خطیبانہ اور پرشکوہ انداز' ان کی انفرادیت ہر جگہ قائم رہتی ہے۔ مولانا کی یہ صلاحیت خدائے بخشندہ کی بخشی ہوئی تھی اور انھوں نے عوام کے اندر قوم پرستی کے جذبات کو بیدار کرنے اور اسے غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکنے پر آمادہ کرنے کے لیے اپنی اس خداداد صلاحیت کا بھرپور استعمال کیا۔ اپنے دونوں اخبارات کے ذریعے انھوں نے خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے کا فریضہ انجام دیا نیز برطانوی حکومت کی پالیسیوں اور اس کے مظالم کے خلاف جہاد چھیڑ دیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران جب ہندوستانی اخبارات پر سنسر لگا اور 'الہلال' پر پابندی لگا دی گئی تو اس کے بعد انھوں نے 'البلاغ' کو جہاد کا وسیلہ بنایا۔ اس کے ذریعے بھی انھوں نے ملک و قوم کی وہ عظیم الشان خدمات انجام دیں جن کے ذکر کے بغیر اردو صحافت کی تاریخ نامکمل ہے۔ 12 نومبر 1915 میں 'البلاغ' جاری ہوا تو حق کی اس آواز کو دبانے کے لیے برطانوی قہر و غضب کی بجلیاں گریں اور چھ ماہ کے اندر ہی اسے بھی بند کر دینا پڑا۔ یہ مولانا کے اسلوبِ نگارش کا کمال تھا کہ بقول سعید الحق دسنوی ان کے جملے آگ بن کر ان کے قلم سے نکل پڑتے تھے۔ مولانا نے اسلام کی تاریخ کو دہراتے ہوئے مسلمانوں کو آزادی کی تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں وہ صدا کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کردے۔ میں اپنے ہاتھوں سے وہ قوت کیسے پیدا کروں کہ ان کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خوابِ موت سے ہوشیار ہوجائیں۔ دشمن شہر کے دروازے توڑ رہے ہیں۔ اہلِ شہر رونے میں مصروف ہیں۔ ڈاکوؤں نے قفل توڑ دیے ہیں اور گھر والے سوئے ہوئے ہیں۔ لیکن اے رونے کو ہمت اور مایوسی کو زندگی سمجھنے والو! یہ کیا ہے کہ تمھارے گھر میں آگ لگ چکی ہے، ہوا تیز ہے اور شعلوں کی بھڑک سخت ہے، مگر تم میں سے کوئی نہیں جس کے ہاتھ میں پانی ہو۔''

مولانا کا کمال یہ تھا کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے وہ دماغ کے ذریعہ دل میں اتر جاتا تھا۔ ان کی نگارشات کی تہوں میں آتش فشاں موجود تھا جو بارود کی صورت میں جب پھٹتا تھا تو برطانوی حکومت کے ہوش ٹھکانے لگ جاتے تھے۔ مولانا کے 'الہلال' و 'البلاغ' کی تحریروں میں جو زیرو بم تھا، جو رعب و داب تھا اور جو شان و شوکت تھی' شاید اسی سے متاثر ہو کر رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ ''مولانا کا

> مولانا کے 'الہلال' و 'البلاغ' کی تحریروں میں جو زیر و بم تھا، جو رعب و داب تھا اور جو شان و شوکت تھی' شاید اسی سے متاثر ہو کر رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ ''مولانا کا اسلوبِ تحریر ان کی شخصیت تھی۔ ان کی شخصیت اور ان کا اسلوب دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا...... ''مولانا پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے باقاعدہ قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔

اسلوبِ تحریر ان کی شخصیت تھی۔ ان کی شخصیت اور ان کا اسلوب دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا...... ''مولانا پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے باقاعدہ قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔

مولانا آزاد نے اپنے اخبار 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے جن مقاصد پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی تھی' 19 ویں صدی کے اواخر اور 20 ویں صدی کے اوائل کے حالات و حوادث ان کے پیشِ نظر تھے۔ انھوں نے امتِ مسلمہ میں باہمی نزاعات اور مناقشات، پریشان خیالی اور یاس و حرماں کی وجہ سے مذہبی خیالات سے بحث کی تھی اور برگزیدہ بندہ کے اعمالِ حسنہ کو اپنے سیرت و کردار کا حصہ بنانے کی دعوت دی تھی۔ تمدنی اور ثقافتی افکار نے جو نئے باب کھولے تھے' اس کی ضرورت آج 21 ویں صدی میں بھی ہے۔

■

Dr. Imam Azam, Rigional Director (MANUU), Kolkata Rigional Center, 71 G, Tiljala Road, Kolkata 700046 (WB)

فاروق اعظم قاسمی

سید سلیمان ندوی

(نقوشِ سلیمانی کے حوالے سے)

علامہ سید سلیمان ندوی (22 نومبر 1884 - 22 نومبر 1953) مرحوم ایک مایۂ ناز عالم دین، اسلامی تاریخ کے ماہر اور زبان و ادب کے محقق و ناقد ہیں۔ ان کا اصل میدان تو اسلامی تاریخ ہے اور اردو ادب سے ان کا تعلق ثانوی ہے۔ تاہم اس باب میں بھی ان کا نام بڑی عظمت سے لیا جاتا ہے۔

اس نقطے پر تو تمام ارباب نظر متفق نظر آتے ہیں کہ علامہ سید سلیمان ندوی اسلامی علوم کے ماہر اور اس کے اسرار و رموز سے واقف و باخبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی جیسی تاریخ ساز ہستی کی شاگردی نصیب ہوئی، پھر بعد میں یہی شاگرد شبلی کے علوم و معارف کا حقیقی وارث و امین بھی ٹھہرا۔ شبلی 1914 میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے ان کی وفات کے بعد نومبر 1914 کو دارالمصنفین اعظم گڑھ کی بنیاد ڈالی گئی اور جولائی 1916 میں سید صاحب نے ماہنامہ 'معارف' کے اجرا کی شکل میں اپنے استاذ کے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جس کا شاندار سلسلہ اب ایک صدی عبور کرنے کو ہے۔ علامہ شبلی کا ایک عظیم خواب 'سیرت النبیؐ' کی تکمیل بھی ہے۔ اس کے علاوہ سیرتِ عائشہؓ، حیاتِ شبلی، حیاتِ امام مالک، خیام، تاریخ ارض القرآن، اور ایک معروف اسکول ٹیکسٹ بک رحمتِ عالم وغیرہ ندوی صاحب کی علمی، تحقیقی اور تاریخی قد آوری کی زندہ تصویریں ہیں۔

نقوشِ سلیمانی کا شہرہ اس لیے بھی ہے کہ اردو زبان کے آغاز کے سلسلے میں سید صاحب کا جو 'نظریۂ سندھ' ہے، اس کا انکشاف پہلی بار اسی کتاب کے ذریعے ہوا۔ سید صاحب اپنے اس دعویٰ کے پیچھے مضبوط دلائل بھی رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔'' (نقوشِ سلیمانی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (1993) چوتھا ایڈیشن، ص 31)

یہ الگ بحث ہے کہ اس باب میں ان کے اس نظریے کو زیادہ اعتبار حاصل نہیں ہے لیکن سرے سے اس نظریے کو مسترد کرنا بھی آسان نہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے: ''اردو زبان کے آغاز اور ابتدائی نشو و نما سے وابستہ مباحث کے لحاظ سے بیشتر ماہرین لسانیات میں اسے کسی خاص خطے سے مشروط کرنے کا رجحان قوی تر نظر آتا ہے۔ چنانچہ پنجاب، دکن، اور سندھ کو اردو کی جنم بھومی ثابت کرنے کے لیے جو نظریات پیش کیے گئے انھیں خصوصی شہرت حاصل ہے بلکہ بیشتر لسانی مباحث بھی انھیں نظریات کی ضمنی پیداوار قرار پاتے ہیں''۔ (اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (2013) دوسرا ایڈیشن، ص 64-63)

عرب و ہند کے تعلقات بھی چوں کہ سید صاحب کا موضوع رہا ہے اور اس سلسلے میں ان کی ایک مستقل کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' بھی ہے۔ اس لیے وہ اپنے 'نظریۂ سندھ' کی دلیل یوں پیش کرتے ہیں: ''ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں، مختلف قوموں، مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا، ناگزیر ہے کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو۔ وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اردو ہے''۔ (نقوش، ص 5)

سید صاحب کا خیال ہے کہ اردو کا نام اردو بھی غلط ہے۔ فرماتے ہیں: ''ہندوستان کی اس مشترک زبان کو اردو کہنا، میں اصطلاح کی غلطی سمجھتا ہوں۔ اردو کے ابتدائی مصنفین نے اس کو ہمیشہ ہندی کہا ہے اور انگریزوں کی زبان میں اب تک اس کا نام ''ہندوستانی'' ہے''۔ (نقوش، ص 7) اسی کی وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ اس زبان کا نام 'اردو' تیرہویں صدی کے اوائل کی بات ہے یعنی آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے کا یہ نام ہے۔

سید سلیمان ندوی اس بات پر بہت مصر نظر آتے ہیں کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کا نام اردو غلط ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح عرب کی زبان عربی، چین کی زبان چینی، جاپان کی جاپانی اور روس کی زبان روسی کہلاتی ہے اسی طرح ہندوستان کی اس مشترکہ زبان کا نام بھی ہندوستانی ہونا چاہیے۔ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں: ''ایک شائستہ اور مہذب زبان کا خاصہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آجائے۔... لفظِ اردو سے اس قسم کی کوئی مدد ذہن انسانی کو نہیں ملتی اس لیے اس کی جگہ اس کے اصلی نام 'ہندوستانی' کو رواج دینا چاہیے''۔ (نقوش، ص 105)

انھوں نے اس سلسلے میں اہلِ وطن کے سامنے بڑی قیمتی تجاویز بھی رکھیں اور انھیں نظر انداز کرنے کی صورت میں اس کے خطرناک انجام سے بھی آگاہ کیا۔ سید صاحب اس ہندوستانی کے قائل تھے جس کا رسم خط فارسی تھا لیکن وہ اس بات کے سخت مخالف تھے کہ اس پیاری اور شیریں زبان کو عربی و فارسی اور سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ سے بوجھل کر دیا جائے۔ 'ہماری زبان بیسویں صدی میں' میں سید صاحب نے پورے ملک میں اردو زبان کی وسعت و ترقی، مختلف تحریکوں کے زیر اثر اردو زبان و ادب کے قائم ہونے والے نئے جزیروں، اردو کی جامعات اور اداروں، اردو کو عالمگیر حیثیت عطا کرنے میں دینی مدارس کے کرداروں اور مختلف اردو اخبارات و رسائل کے اجرا کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اخیر میں مختلف موضوعات پر مشتمل اردو کی مطبوعہ کتابوں کی ایک طویل فہرست بھی درج کی گئی ہے۔

ایسے ہی مشمولہ 'ہماری زبان' میں بھی اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے کی سید صاحب نے پرزور وکالت کی ہے۔ یہ مضمون درحقیقت اردو ہندی تنازع کے سلسلے میں اردو کے خلاف اٹھائے گئے چند سوالات کا جواب ہے جس میں سید صاحب نے بڑی دردمندی کے ساتھ اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ اگر اس مشترکہ وراثت 'ہندوستانی' کو نظر انداز کیا گیا تو ملک کے ہزار سالہ

تہذیب وتمدن کا بیڑا غرق ہوجائے گا۔

سید صاحب کے خطبات کی روشنی میں اردو زبان کے تئیں ان کے نظریات کے ذکر کے بعد اب ان کی تحقیق وتنقید کی طرف قلم کا رخ موڑا جاتا ہے۔ سید صاحب نے اپنے تحقیقی مقالات اور تقریظ ومقدمے میں جو ادبی گفتگو یا آرا پیش کی ہیں انھی تحریروں کے تناظر میں ان کے تحقیقی و تنقیدی مقام ومرتبے کو متعین کرنے کی سعی کی جائے گی۔

مقالات کے ضمن میں پندرہ مضامین شامل کتاب ہیں۔ ان میں بیشتر مضامین کا رنگ تحقیقی ہے۔ ان کے خطبات کا رنگِ تحقیق بھی خاصا شوخ ہے لیکن خطبات کے مقابلے میں مقالات زیادہ مفصل اور مدلل ہیں۔ متذکرہ مقالات میں 'اکبر کا ظریفانہ کلام'، 'ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی' کے سوا بقیہ کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ تحقیق ہی سے ہے بطور خاص 'بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق'' (بالاقساط) 'تمہید' اور' جواہر الاسرار میں کبیر کی بات چیت'۔ ان مقالات میں 'انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ' کو سفرِ انگلینڈ کا اور 'سفرِ گجرات کی چند یادگاریں' کو سفرِ گجرات کا رپورتاژ کہنا چاہیے۔

''انجمن اردوئے معلی کے چند سوالوں کا جواب' اور 'زبانِ اردو کی ترقی کا مسئلہ'۔ اردو ہندی تنازع کے تصفیے اور اردو کو قومی زبان کا مقام دینے کے سلسلے میں رشید احمد صدیقی نے مختلف اصحابِ نظر اور دانشوران سے چند سوالات کیے تھے۔ سوالنامہ سید صاحب کے پاس بھی آیا تھا۔ اول الذکر انھیں سوالات کے جواب پر مشتمل مضمون ہے۔ کسی بھی زبان کی ترقی کے حوالے سے پروفیسر براؤن (مستشرق) نے چند معروضات پیش کیے تھے۔ ان ہی معروضات کی روشنی میں مہدی حسن صاحب نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سامنے کچھ تجاویز رکھی تھیں۔ آخر الذکر اسی تجویزی خط کا مدلل جواب ہے۔ اس سے قبل سید صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اردو میں ایک جامع انسائیکلو پیڈیا تیار کرنے کی تجویز رکھی تھی اور اردو ادب میں انسائیکلو پیڈیا کا یہ تصور شاید پہلا تھا۔ اس کی ترتیب کی معقول دلیل بھی انھوں نے پیش کی تھی لیکن قوم کی بہت سی محرومیوں کے ساتھ ایک اور محرومی کا اضافہ ہوا کہ سید صاحب کا یہ خواب خواب ہی رہا۔ مہدی حسن صاحب کو انھوں نے اس مضمون کا بھی حوالہ دیا کہ بازار میں ڈیمانڈ نہ ہونے کی وجہ سے وہ منصوبہ ناکام رہا اس لیے کہ پروفیسر براؤن کے یہ مشورے یہاں کی فضا کے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ سید صاحب فرماتے ہیں:

''ہمارے نزدیک یہ اس وقت تک ناقابلِ عمل ہیں جب تک ملک میں اس کی مانگ اور اس کی قدر دانی کا جذبہ نہ پیدا ہو''۔ (نقوش سلیمانی، ص 184)

اپریل 1692 میں شاید کانگریس کی طرف سے 'ہوم رول' کی تجویز آئی تھی تو سید صاحب نے یہ مضمون ''ہوم رول سے پہلے ہوم لنگویج'' تحریر کیا تھا جس میں انھوں نے کہا کہ ہوم رول کے تخیل سے پہلے کم از کم ساتھ ساتھ ہوم لنگویج کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ (نقوش، ص 194) اس مضمون میں بھی ملکی زبان میں تعلیم دیے جانے پر سید صاحب نے خاصا زور دیا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ ہمارے نزدیک تو صرف اس کا علاج اردو زبان ہے جس کی عملاً ہمہ گیری اور عمومیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ (نقوش، ص 98-197) 'اردو کیوں کر پیدا ہوئی' میں السنۂ عالم کے جملہ خاندانوں کا جائزہ لیا گیا ہے، اردو کی پیدائش کے اسباب وعوامل اور پس منظر سے بھی بحث کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اسلامی عہد کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبے میں الگ الگ پیدا ہوئی''۔ (نقوش، ص 251) ایک لسانی اصول کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''ہر زبان تین قسم کے لفظوں سے بنتی ہے۔ اسم، فعل، حرف۔ اس بولی میں جس کو اب اردو کہنے لگے ہیں، فعل جتنے ہیں وہ دہلوی ہندی کے ہیں۔ حرف جتنے ہیں ایک دو کو چھوڑ کر وہ ہندی کے ہیں البتہ اسم میں آدھے اس ہندی کے اور آدھے عربی، فارسی، اور ترکی کے لفظ ہیں''۔ (نقوش، ص 255)

اردو لسانیات کے باب میں یہ مضمون بہت وقیع ہے۔ یہ خیال کہ سید صاحب علم لسانیات سے سرے سے واقف نہیں تھے زیادہ صحیح نہیں ہے البتہ عالمی سطح پر لسانیات کی مہارت ان کے یہاں ڈھونڈنا مشکل ہے تاہم مشرقی زبانوں بطورِ خاص عربی، فارسی اور ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں میں سید صاحب کو دسترس حاصل تھی اور وہ بحسن وخوبی ان زبانوں کی باریکیوں سے باخبر تھے۔ 'بہار کے نوجوان اور ادب کی خدمت' کو اسّی سال قبل کی اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم جز قرار دیا جاسکتا ہے۔ آٹھ دہائیوں پہلے کا لکھا ہوا یہ ایک تجزیاتی مضمون ہے لیکن آج کے تناظر میں بھی اگر اس مضمون کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سید صاحب کے پیش کردہ یہ سارے نکات اور مفید مشوروں کی معنویت علی حالہ برقرار ہے۔ نئے شعرا وادبا کے لیے انھوں نے جو رہنما خطوط پیش کیے تھے وہ سب کے سب آج بھی منتظرِ عمل ہیں۔

'بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق' دو قسطوں کا ایک طویل مضمون ہے جس میں بالدلیل قدیم الفاظ کی دل چسپ تحقیق پیش کی گئی ہے۔ علامہ ندوی کو چوں کہ عربی، فارسی اور انگریزی پر یکساں عبور حاصل تھا اور اردو تو ان کی مادری زبان تھی اس لیے لفظوں کی تحقیق میں مزید دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ 'تمہید' کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے بلکہ بعض اعتبار سے یہ مضمون اول الذکر سے زیادہ جامع اور پرلطف ہے۔ 'تمہید' میں یہ بتایا گیا ہے کہ عربی، فارسی اور سنسکرت سے 'ہندوستانی' تک کس طرح لفظوں کا سفر طے ہوا اور بالآخر یہاں آکر ان کی حتمی شکل کیا بنی۔ اس باب میں سید صاحب کا خیال یہ ہے کہ جس طرح سے ایک مہاجر ہجرت کر کے جس خطۂ ارضی کو اپنا مستقل مسکن بناتا ہے اور اسے وہیں کے قانون کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے اسی طرح لفظوں کی ہجرت کا حال ہے۔ اس ردو بدل اور شکست وریخت کو سید صاحب نے ہر زندہ زبان کا حق قرار دیا ہے۔

'اکبر کا ظریفانہ کلام' میں علامہ مرحوم نے اکبرالہ آبادی کی ظریفانہ شاعری پر بھرپور گفتگو کی ہے۔ اہلِ ادب واقف ہیں کہ اکبر مرحوم نے ہندی معاشرے کو مغربی طرزِ زندگی کی خرابیوں سے آگاہ کر کے اس کے نقصانات سمجھائے بلکہ مغرب کا کھلم کھلا مذاق بھی اڑایا۔ سید صاحب نے اپنے سات نکات کے ذریعے اکبر کی شعری خصوصیات وامتیازات کو بیان کیا ہے اور مثالوں کے ذریعے کلامِ اکبر کی تفہیم کو آسان کرنے کی خوب صورت کوشش کی ہے۔ 'جواہر الاسرار میں کبیر کی بات چیت' یہ ایک تشنہ اور ادھورا تاثراتی مضمون ہے۔ 'ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی' یہ مضمون بظاہر ہاشم علی کے مرثیوں کے مجموعے پر ایک تبصراتی مضمون ہے لیکن اس ضمن میں سید صاحب کی دکنی زبان پر دسترس اور اس پر گہری نظر کا بخوبی علم ہوجاتا ہے۔

اردو میں تعمیری ادب میں بھی سید صاحب کا نام نمایاں ہے۔ غیر افسانوی نثر میں سوانح نگاری اور سفرنامہ نگاری میں بطورِ خاص انھوں نے اپنی توجہ صرف کی۔ ادبی صحافت سے بھی ان کی گہری وابستگی رہی ہے جس کی گواہی 'معارف' اعظم گڑھ سے بآسانی لی جاسکتی ہے۔ انور سدید مرحوم نے انھیں شبلی اسکول کا رکن رکین قرار دیا ہے۔ انور سدید لکھتے ہیں: ''وہ اعلیٰ پائے کے نقاد تھے۔ حالی وشبلی، جگر اور شاد پر ان کے مضامین جمالیاتی تنقید کی مثالیں ہیں''۔ (تاریخ اردو ادب، ص 387)

سید صاحب کی اس کتاب میں مکتوب نگاری پر بھی دو اہم مضامین شامل ہیں۔ اول 'مکاتیبِ شبلی' دوسرا

'مکاتیب مہدی'۔ اول الذکر میں شبلی کے اولین مجموعۂ خطوط کی جمع آوری اور خطوط کی خصوصیات و امتیازات پر عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ آخر الذکر میں خط کی تاریخ و تعریف اور اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے مہدی افادی کے خطوط کے امتیازات بھی بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''مرحوم کا قلم حد سے زیادہ چلبلا اور البیلا تھا۔ نوکِ قلم پر جو بات آگئی وہ ناگفتنی بھی ہوتی تو گفتنی ہو کر نکل جاتی اور پھر اس طرح نکلتی کہ شوخی صدقہ ہوتی اور متانت مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیتی''۔ (نقوش، ص: 385) لیکن کہیں کہیں سید صاحب کا قلم تنقید کرتے کرتے ذاتی یادوں اور محبت و عقیدت کی سرحد میں جا گھستا ہے جو تنقید کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس کے باوجود یہ مضمون سید صاحب کی تنقیدی بصیرت کا واضح ثبوت ہے اور اردو مکتوب نگاری کے باب میں ایک خاصے کی چیز بھی۔

عبادت بریلوی نے سید صاحب کی عملی تنقید پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: ''سید سلیمان ندوی کی عملی تنقید کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی خصوصیات تو بیان کر دیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں محض اصولوں سے کام نہیں لیتے۔ اسی وجہ سے کوئی معقول تجزیہ ان کے یہاں نہیں ملتا''۔ (اردو تنقید کا ارتقا، ص 269)

حق یہ ہے کہ سید صاحب کا اصل میدان تحقیق ہے خواہ اس کا تعلق ادب سے ہو یا تاریخ سے، تاہم اردو تنقید میں بھی وہ اپنی ایک نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ مشرقی تنقید کے حوالے سے عبادت بریلوی خود لکھتے ہیں: ''تنقید کی مشرقی اصطلاحات سے وہ اپنی تنقیدی تحریروں میں ضرور کام لیتے ہیں۔ فصاحت و بلاغت، تشبیہات و استعارات، لطافت و روانی، بے ساختگی، آمد، آورد، جدتِ ادا، غرض یہ کہ اس قسم کی تمام اصطلاحات ان کی تنقید میں ملتی ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے سادگی اور جوشِ بیان وغیرہ کی اصطلاحات سے بھی کام لیا ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی عہدِ تغیر کی تنقید سے متاثر ہیں''۔ (اردو تنقید کا ارتقا، ص 269)

حالی کی مسدس ایک نظم ہی نہیں اسے مسلم معاشرے کے مختلف طبقوں میں در آنے والی خرابیوں کی اصلاح کا ایک جامع انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ حالی نے روایت سے بغاوت کر کے اردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی۔ 'مسدس حالی' یہ مضمون دراصل مسدس پر لکھا سید صاحب کا دیباچہ ہے۔ مسدس کا اتنا خوب صورت تجزیہ شاید ہی اس سے قبل کسی نے کیا ہو۔ اس مضمون میں مسدس کی تالیف کے پس پردہ اس کے اسباب و محرکات، مقاصد اور موضوعاتی و فنی پہلو سے اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس تجزیاتی مضمون کے مطالعے سے حالی کے مسدس پڑھنے کا اشتیاق مزید بڑھ جاتا ہے اور جو اس کا مطالعہ کر چکا ہے اس کے دل میں دوبارہ اس کے پڑھنے کا جذبہ انگڑائی لینے لگتا ہے۔

سید صاحب نے کلام شاد پر جو مقدمہ تحریر کیا ہے وہ ایک انتہائی تشنہ تبصراتی مضمون ہے۔ وہ شاد کو ایک عظیم شاعر ضرور تسلیم کرتے ہیں تاہم مدلل انداز میں ان کے کلام پر گفتگو کرنے سے سید صاحب کا قلم جھجک محسوس کرتا ہے۔ اس کی وجہ بھی سید صاحب خود ہی 'عدیم الفرصتی' بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس پر اظہار افسوس بھی کرتے ہیں کہ اب تک 'کلیاتِ شاد' منظرِ عام پر نہیں آپایا ہے لیکن اس سے وہ مایوس بھی نہیں ہوتے۔ چناں چہ سید صاحب کی وفات کے 22 سال بعد 1975 میں بہار اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام کلیم الدین احمد نے تین ضخیم جلدوں میں کلیاتِ شاد مرتب کر کے شائع کیا۔

> 'تہنید' میں یہ بتایا گیا ہے کہ عربی، فارسی اور سنسکرت سے 'ہندوستانی' تک کس طرح لفظوں کا سفر طے ہوا اور بالآخر یہاں آکر ان کی حتمی شکل کیا بنی۔ اس باب میں سید صاحب کا خیال یہ ہے کہ جس طرح سے ایک مہاجر ہجرت کر کے جس خطۂ ارضی کو اپنا مستقل مسکن بناتا ہے اور اسے وہیں کے قانون کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے اسی طرح لفظوں کی ہجرت کا حال ہے۔ اس ردو بدل اور شکست و ریخت کو سید صاحب نے ہر زندہ زبان کا حق قرار دیا ہے۔

'شعلۂ طور' یہ جگر مراد آبادی کا شعری مجموعہ ہے۔ 'تعارف نو وارد شاعر' یہ مضمون دراصل اسی مجموعے کا دیباچہ ہے۔ اس میں تنقید کم اور تعارف و تبصرہ زیادہ ہے۔ جگر کا تعارف کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں: ''جگر شاعر ہے مگر کیسا شاعر؟ تنہا شاعر، بلکہ ہمہ شاعر، ان کا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ، لکھنؤ اور دہلی دونوں حکومتوں سے آزاد، موزوں الفاظ اور دل کش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، ہر تکلف، تعمق اور آورد سے پاک، طلسم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا''۔ (نقوش، ص 429) یہ تحریر جگر اور کلامِ جگر کے مختصر تعارف پر مشتمل ہے اور انداز ایسا کہ اسے جگر کا خاکہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ 'خیابان' یہ تحریر محمود اسرائیلی کے مجموعۂ غزل 'خیابان' کا مقدمہ ہے۔ اس میں غزل گوئی پر سید صاحب نے بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ فنِ غزل پر گفتگو کرتے ہوئے معاصر شاعری کے بدلتے ہوئے منظر نامے کا جائزہ بھی لیا ہے اور ساتھ ہی اسرائیلی کی شاعری کو شبلی و ظفر علی خان اور اقبال کے رنگِ سخن کا حسین سنگم قرار دیا ہے۔ یہاں بھی تنقید کے بجائے تقریظ کا رنگ غالب ہے۔ 'کلیاتِ عشق' ایک طویل مضمون ہے جو شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی کے کلیات کا مقدمہ ہے۔ عشق صاحب ایک صوفی شاعر تھے۔ اس دیباچے کا تقریباً نصف حصہ تصوف اور اس کے مختلف سلسلوں کے بیان میں صرف کیا گیا ہے۔ نصفِ ثانی میں بھی آدھا حصہ کلامِ عشق پر معروضی گفتگو کی گئی ہے اور بقیہ حصے میں عشق و جذب سے معمور شاعر کے اشعار درج کیے گئے ہیں۔

'خمستان' عبد السمیع تال اثر صہبائی کا مجموعۂ کلام ہے۔ صہبائی پنجاب کے معروف شاعر تھے اور مختلف اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کے ساتھ رباعی گوئی میں سندِ امتیاز رکھتے تھے۔ 'خمستان' ہی کے عنوان سے سید صاحب نے اس کا دیباچہ تحریر کیا تھا۔ اس میں انھوں نے شاعر کے گرد و پیش کے حالات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے کلام پر خاطر خواہ گفتگو کی ہے۔ لکھتے ہیں: ''صہبائی کے فطری شاعر ہونے میں کلام نہیں، ان کا دل عشق و محبت سے لبریز اور نالہ و شیون سے معمور ہے''۔ (نقوش، ص 434) اس میں نوجوان شعرا کو کچھ مشورے اور پنجاب کے دیگر شعرا کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔

'گلستانِ امجد' کے بشمول اخیر میں دو مضامین اور ہیں۔ 'عطرِ سخن' اور 'حقیقتِ علمی شاعری' جو انتہائی سرسری اور تشنہ ہیں۔ الحاصل علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم جہاں ایک طرف جہاں دیدہ عالمِ دین اور اسلامی علوم کے ماہر و دانشور تھے وہیں علم و قلم کے شناور بھی۔ ان کے قلم سے علم و ادب کے کئی آبشار نکلے ہیں اور تشنگانِ علم و ادب نے ان سے اپنی پیاس بجھائی ہے۔

کتابیات:

- اردو تنقید کا ارتقا، عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (2013) پانچواں ایڈیشن
- اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، سلیم اختر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (2013)، دوسرا ایڈیشن
- اردو ادب کی مختصر تاریخ، انور سدید، عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ دہلی (2014)
- نقوش سلیمانی، دارالمصنفین شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ (1993) چوتھا ایڈیشن

■

Mohd Farooque Azam Room No.: 160
JNU, New Delhi - 110067
Periyar Hostel

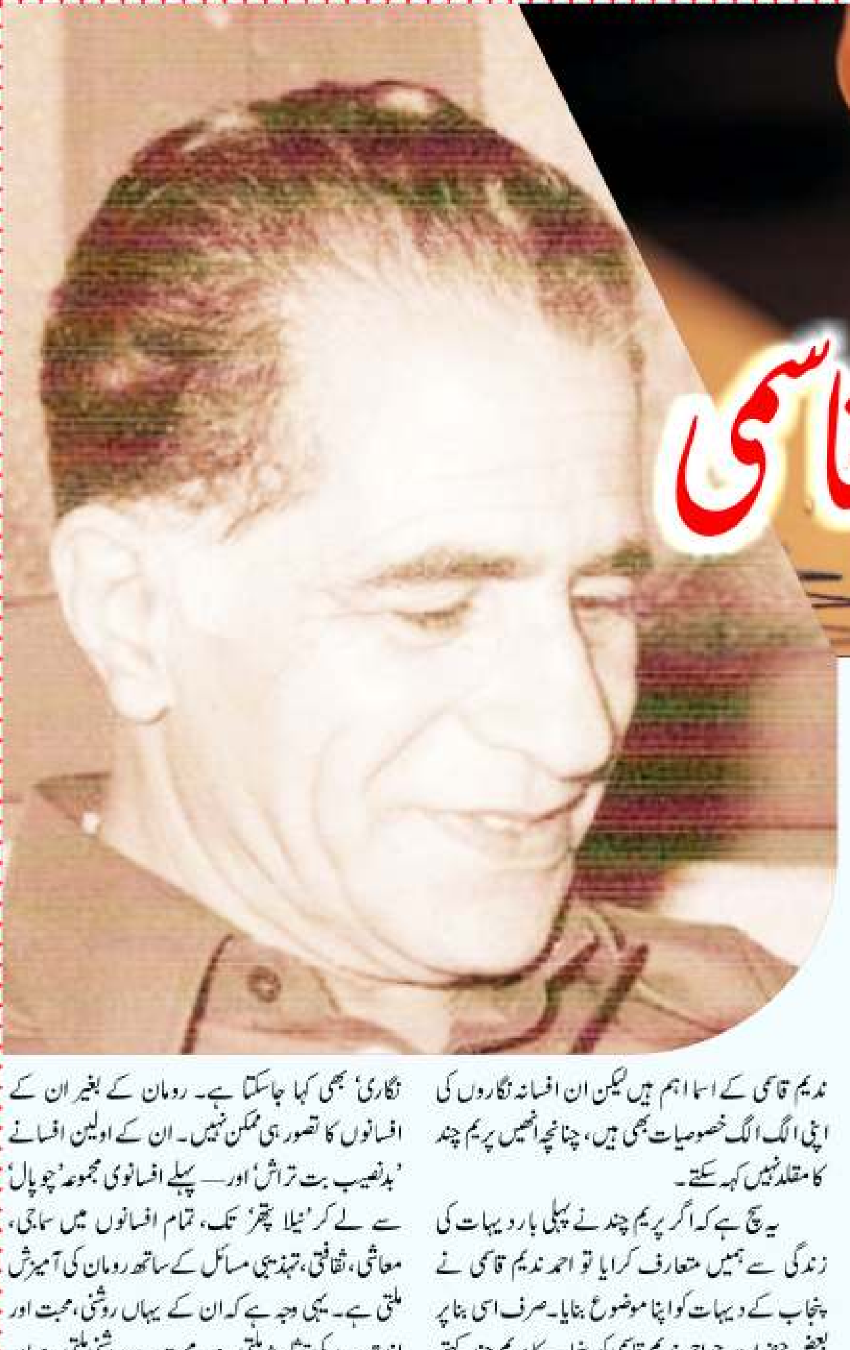

ارتضیٰ کریم

احمد ندیم قاسمی

انسانی ذات کا افسانہ — جس قدر دلچسپ ہے، اتنا ہی پیچیدہ بھی۔ چنانچہ اس 'افسانہ خوانی' میں اور اس کی 'تفہیم و تفہم' میں مورخین اپنے نقطۂ نظر سے، ماہرین نفسیات اپنے طور پر، تہذیبی ارتقا پر نظر رکھنے والے اپنے انداز سے، دانشور اور مفکرین اپنے اعتبار سے مسلسل کوشاں اور سرگرداں ہیں۔ انھیں کے ساتھ فنکار، ادیب اور شاعر بھی انسانی حیات کے ظاہر و باطن میں جھانکنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔

اردو ادب جس کا قدیم افسانوی سرمایہ طلسماتی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ جہاں حقائق سے چشم پوشی ملتی ہے اور زندگی سے فرار کی کیفیت — لیکن بعض فنکاروں نے محسوس کیا کہ ہمیں ایسی کہانیاں لکھنی چاہیے، جن میں ہمارے اردگرد کے انسانوں کے مسائل، ان کے شب و روز کا بیان ہو۔ یوں تو اس نوع کی کوشش نذیر احمد کے ناولوں سے قبل بھی ملتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی واضح شکل 1936 کے بعد سامنے آئی۔ جب انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدارتی خطبے میں پریم چند نے کہا کہ "ہمیں ایسا ادب چاہیے، جو ہمیں سلائے نہیں، کیونکہ اب زیادہ سونا ہمارے لیے موت کے مترادف ہوگا۔"

پریم چند نے اپنے افسانوں میں سامنے کے انسان کے مسائل کو پیش کیا۔ انھوں نے ہندوستان کی دیہی زندگی کو عموماً اور یوپی کے کسانوں کے شب و روز کو خصوصاً اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ بعد میں ان کی بنائی ہوئی راہ پر اردو کے کئی دوسرے اہم افسانہ نگار بھی چلے — ان میں سدرشن، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی اور احمد ندیم قاسمی کے اسما اہم ہیں لیکن ان افسانہ نگاروں کی اپنی الگ الگ خصوصیات بھی ہیں، چنانچہ انھیں پریم چند کا مقلد نہیں کہہ سکتے۔

یہ سچ ہے کہ اگر پریم چند نے پہلی بار دیہات کی زندگی سے ہمیں متعارف کرایا تو احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کے دیہات کو اپنا موضوع بنایا۔ صرف اسی بنا پر بعض حضرات جو احمد ندیم قاسمی کو پنجاب کا پریم چند کہتے ہیں، میرے خیال سے زیادہ صحیح نہیں۔ ندیم اور پریم چند میں اس حد تک مماثلت اور مشابہت ہے کہ دونوں نے 'دیہی زندگی' پر قلم اٹھایا لیکن اس کے علاوہ دوسری اور کوئی بات ان میں مشترک نہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا مطالعہ اور بہ نظر غائر مطالعہ کرنے والے اہلِ نظر میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ندیم پر سب سے زیادہ اثر کرشن چندر کا ہے۔ کرشن چندر کی طرح ان کے یہاں بھی رومان اور حقیقت نگاری کا رجحان ملتا ہے جسے 'رومانوی حقیقت نگاری' بھی کہا جاسکتا ہے۔ رومان کے بغیر ان کے افسانوں کا تصور ہی ممکن نہیں۔ ان کے اولین افسانے 'بدنصیب بت تراش' اور — پہلے افسانوی مجموعہ 'چوپال' سے لے کر 'نیلا پتھر' تک، تمام افسانوں میں سماجی، معاشی، ثقافتی، تہذیبی مسائل کے ساتھ رومان کی آمیزش ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں روشنی، محبت اور اندھیرے کی تثلیث ملتی ہے۔ محبت سے روشنی ملتی ہے اور اندھیرے نفرت کی پیداوار ہیں۔ ان کا پورا افسانوی سرمایہ محبت کی تبلیغ اور انسانیت کی ترویج سے عبارت ہے۔ ان کے نزدیک محبت تمام نفرت، انتقام اور جنگ کی آگ سرد کردیتی ہے۔ اس کی مثال ان کے افسانے 'جوانی کا جنازہ' میں بھی مل جاتی ہے۔ غونث اپنی بہادری طاقت اور غصے کے لیے پورے علاقے میں مشہور تھا۔ بیل کو گھونسہ مارتا تو بیل اپنی جگہ اکڑ کر رہ جاتا۔ جس نے عطا کی پٹائی معمولی بات پر کردی تھی۔ لیکن یہی غونث جب مہتاب کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اسے زندگی کی

معنویت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب عطا اسے پتھر سے زخمی کر دیتا ہے تو ٹھیک ہونے کے بعد اس سے انتقام بھی نہیں لیتا۔

ایک اور افسانہ 'طلوع و غروب' میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے۔ غضنفر جو شہر کا رئیس ہے اور شکار کی غرض سے سنبل کے گاؤں میں خود سنبل کے یہاں قیام پذیر ہے۔ لیکن شہر کا یہ رئیس اس کی معشوقہ پر ڈورے ڈالتا ہے اور نرگس بھی غضنفر کو چاہنے لگتی ہے لیکن غریب سنبل اس راز کو جاننے کے باوجود کہتا ہے کہ— ''غضنفر اگر تمھیں نرگس پیار کرتی ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ میں اپنی محبت سے زیادہ دوسروں کی محبت کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں'' جہاں محبت میں یہ جذبہ نہایت غیر معمولی ہے۔ اس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ حالانکہ پنجاب کے اس سادہ لوح انسان کی شرافت اور نیکی کے بدلے میں نرگس اس رئیس شہر غضنفر کی ہوس کاری کا شکار ہو کر عصمت فروشی پر مجبور ہو جاتی ہے۔ شہر اور دیہات کے کردار، ایک کی سادہ لوحی اور دوسرے کی عیاری اور تصنع کو اس افسانے میں خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

'کفارہ' ان کی طویل کہانی ہے، لیکن تاثر سے بھرپور۔ یہاں بھی محبت کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔ مگر 'طلوع و غروب' سے قدرے مختلف طور پر۔ وہاں سنبل کی محبت کو شہر کے ایک رئیس کی نظر بد کھا گئی، تو یہاں سماج کے رسوم اور طبقاتی تنازع نے اسے پروان نہ چڑھنے دیا— پیرو یعنی پیر محمد زمیندار کا بیٹا تھا لیکن باپ کے انتقال کے بعد حالات بدل گئے تھے۔ پیرو کا کردار دراصل زوال پذیر زمیندار کی نمائندگی کرتا ہے۔ جب پیرو اپنا مکان فروخت کرکے دو بیل خریدتا ہے اور اپنی تھوڑی سی زمین کے جوتنے میں لگ جاتا ہے۔ راتیں جس کی آسمان کے نیچے گزر جاتی ہیں لیکن اسے اپنے 'سفیدے' کی فکر ہوتی ہے۔ ان کی حفاظت کی خاطر وہ اپنے دھوبی کے گھر میں رہنا شروع کر دیتا ہے۔ وہاں دھوبی کی بیوی بڑھیا، بڑھیا کی بیٹی کموں اور بیٹا میرا بھی تھے۔ ان کے خلوص اور ان کی محبت میں وہ اس قدر بھیگ چکا تھا کہ کہانی جہاں ختم ہو جاتی ہے، قاری ششدر اور انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ محبت اور انسانیت کا پیغام اس افسانے میں بھی اسی شدت کے ساتھ ملتا ہے۔ پیرو صرف محبت کے سہارے اس گھر میں رہتا ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی اچھی بری باتیں برداشت کرتا ہے۔ مگر جب گاؤں کے ایک نوجوان نے کموں کے متعلق نازیبا بات کی تو اسے بھری محفل میں چانٹا رسید کرتا ہے اور ''دھوبیوں کے پاس رہنا ہی گاؤں

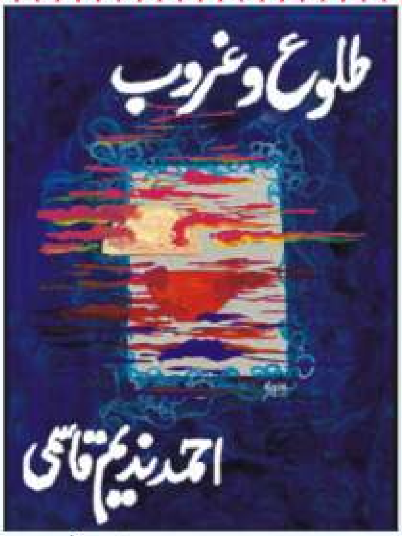

کے زمینداروں کے نزدیک پیرو کا ناقابل معافی جرم تھا، اب ایک ہم مرتبہ نوجوان کے منہ پر چانٹا جلتی پر تیل بن کر گرا اور پیرو گاؤں بھر میں اچھوت بن گیا۔'' حالانکہ اس کی پیش گوئی افسانہ نگار نے بڑھیا کی زبانی شروع میں ہی کر دی تھی۔ یہ گفتگو ملاحظہ ہو جس میں ایک تہذیب کی شکست جھلکتی ہے:

''بڑھیا بولی۔ میرے بیٹے، بات یہ ہے کہ، یہ بڑی عجیب سی بات ہے، ایک زمیندار ایک دھوبی کے گھر میں رہے۔ لوگ باتیں بنائیں گے... وقت وقت کی بات ہے۔ کل گاؤں بھر میں تم ہی تم تھے اور آج تم دو بیلوں کے ٹھور ٹھکانے کے لیے اپنے غریب دھوبیوں کے ہاں آئے ہو، خوش رہو، آنکھوں میں بسو، مگر دیکھو ہم کوڑی کوڑی کے محتاج ہیں، بکریوں کا دودھ بیچ کر گذارہ کرتے ہیں، تم زمینداروں کی تو ننھی ننھی باتیں بڑی بڑی دشمنیوں میں بدل جاتی ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ، گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔''

اور پیرو یہ سب سن سن کر سوچا کرتا تھا ''آخر انسانوں میں جماعت بندیاں کیوں ہیں وہ کموں کو چاہتا تھا، اور شاید کموں کو بھی اس چاہت پر اعتراض نہ ہو، پھر اس کی ماں اور اس کا گاؤں اور اس کا سماج کیوں اس کی راہ میں حائل ہونے لگے۔''

کیا پیرو کے مقابلے میں ایک بھی کردار اردو فکشن نگاروں نے پیش کیے ہیں؟ ایک زمیندار کردار نے کبھی اس نہج سے سوچا ہے؟ پیرو کہانی کے اختتام تک نفس اور ضمیر کی جنگ لڑتا رہا اور آخر کار نفس کی شکست ہوئی۔ اس نے اپنی محبت کی قربانی دی اور کموں کی شادی پر توڑا جوڑا سب کچھ دینے کے لیے اپنی جان سے پیارے ''سفیدے'' کو فروخت کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ

آخری بار ان بیلوں سے اپنے کھیت جوت لینا چاہتا تھا۔ ایسی صورت میں جب کہ سرکار کی طرف سے کھیت میں ہل ڈالنا قانونی جرم تھا لیکن کسان کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ اس نے اس کام کے لیے رات کا وقت چُنا۔ جب وہ کھیت میں ہل چلا رہا تھا عین اسی وقت تھانیدار آ جاتا ہے اور اسے گرفتار کر لیتا ہے۔ اس عالم میں بھی اسے اپنی فکر نہیں ہوتی، خیال آتا ہے تو کموں کا، جس کی شادی رک جائے گی اور وہ اسے جوڑا توڑا نہ دے سکے گا۔ اسی لیے وہ ان سے گزارش کرتا ہے اور گڑگڑا کر کہتا ہے کہ تم میری بوٹیاں نوچ ڈالو۔ لیکن سفیدے کو چھوڑ دو۔ اس لیے کہ سفیدے فروخت نہیں ہوں گے تو اس کی کموں کی شادی پھیکی پڑ جائے گی۔ وہ کہتا ہے:

''یہ صرف دو بیل نہیں، یہ ایک گھر کی آبرو ہیں، یہ ایک معصوم جان کی خوشیوں کا اکلوتا سرمایہ ہیں۔ سفیدے کو گاؤں واپس بھگا دو اور مجھے ساتھ لے چلو، میں تمھارے ساتھ چلوں گا، سفیدے نہیں آئیں گے، کہہ دو کہ سفیدے نہیں آئیں گے۔''

اس افسانے میں طبقاتی کش مکش کے ساتھ محبت کی شہادت کو جس المناکی سے بیان کیا گیا ہے، پیرو کو جس شکل میں اپنی محبت کا کفارہ ادا کرنا پڑا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

قاسمی کا دل انسانیت کے زوال پر روتا ہے اور محبت کی فتح پر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ محبت اس کے یہاں تمام

> ندیم پر سب سے زیادہ اثر کرشن چندر کا ہے۔ کرشن چندر کی طرح ان کے یہاں بھی رومان اور حقیقت نگاری کا رجحان ملتا ہے جسے 'رومانوی حقیقت نگاری' بھی کہا جا سکتا ہے۔ رومان کے بغیر ان کے افسانوں کا تصور ہی ممکن نہیں۔ ان کے اولین افسانے 'بدنصیب بت تراش' اور— پہلے افسانوی مجموعہ 'چوپال' سے لے کر 'نیلا پتھر' تک، تمام افسانوں میں سماجی، معاشی، ثقافتی، تہذیبی مسائل کے ساتھ رومان کی آمیزش ملتی ہے۔

قدروں کی اساس ہے۔ اردو کے معتبر ناقد پروفیسر قمر رئیس ان کی کہانیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس نے اپنی ہر نئی کہانی میں انسان کی اس ازلی معصومیت، آسودگی، مسرت اور محبت کو تلاش کیا ہے جس کے لیے خود اس کی روح تڑپ رہی ہے۔ اس کی پچھلی کہانیوں کے کردار اگلی کہانیوں میں جنم لیتے اور اس ابدی

تلاش کو جاری رکھتے ہیں۔ بدلتے ہوئے پیچیدہ حالات اور حقائق میں ان کے جذبہ و احساس اور شعور کی کائنات بھی بدلتی اور زیادہ تہہ دار ہوتی جاتی ہے۔ 'چوپال' اور 'بگولے' میں ندیم نے جو کردار تخلیق کیے ہیں وہ معصوم سادہ، جذباتی اور جنوں پرور ہیں اور زندگی کے حشر خیز تضادات کا احساس رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا ذہن زندگی کے اس مقدس شعور سے محروم ہے جو احساس کو عمل اور کشاکش کی راہ دکھاتا ہے۔ وہ جاگیرداروں اور تھانیداروں کے روز افزوں مظالم اس طرح گوارا کرتے ہیں، جیسے وہ ناگزیر ہیں... ان کے عمل کا محرک، منزل اور جائے پناہ عشق ہے 'طلائی مہر' کا فیض اپنی محبت اور سونی کی مسرت کے لیے کیسی کیسی اذیتیں سہتا ہے۔ 'بھوت' کا ولی محمد ایک چمارن کی خاموش محبت میں خود کو فنا کر دیتا ہے۔ 'میرا ارا نجھا' کی اماں پیار کی تند و تیز مدوراپی کر ہیر بن جاتی ہے۔ 'بچپنہ' کا 'میں' عشق کے بھنور میں ڈوب کر ابھرا تو سسکتا ہوا اپنی ماں کے ماتا بھرے گرم آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ 'ماں' کی گلابو اپنے بچے کی محبت کے لیے دنیا کی ہر شے، ہر خطرے یہاں تک کہ بیمار شوہر کی فکر سے بھی بے نیازانہ گزر جاتی ہے۔ 'بچہ' میں زندگی کی جو گہما گہمی ہے۔ اس کا محور بھی محبت ہے۔ ماں کی ماتا اور باپ کی محبت۔ بھونڈے، کالے، گندے، روتے، بسورتے، چپٹی ناک والے بچوں کی محبت۔ محبت جو زندگی کی علامت ہے۔ اس کا سرچشمہ اس کی محافظ ہے۔ ان افسانوں میں اسی محبت کی ساری نرمی، شدت، لطافت اور حلاوت سمٹ آئی ہے۔

'چوپال' اور 'بگولے' میں ندیم نے جو کردار تخلیق کیے ہیں وہ معصوم سادہ، جذباتی اور جنوں پرور ہیں اور زندگی کے حشر خیز تضادات کا احساس رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا ذہن زندگی کے اس مقدس شعور سے محروم ہے جو احساس کو عمل اور کشاکش کی راہ دکھاتا ہے۔

... یہ محبت ماورائی یا سماوی نہیں۔ ارضی اور حقیقی ہے۔ ایک طبقاتی سماج کی معذور مجبور، مجروح اور گھٹی گھٹی محبت۔ جو انسان کی معصومیت اور بشریت کا جوہر ہے۔''

اس اقتباس میں بھی ناقد نے ندیم کے افسانوں میں محبت کی پیش کش کو ہی دریافت کیا ہے۔ دراصل احمد ندیم قاسمی ذہنی، فکری اور نظریاتی اعتبار سے ترقی پسندی پر یقین رکھتے ہیں۔ زندگی کی بنیادی سچائیوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ زندگی کو ان سچائیوں سے الگ کرکے دیکھنا نہیں چاہتے بلکہ وہ ان سے نبرد آزما ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔ 'پکا مکان' کا یارو زندگی کے متعلق یوں سوچتا ہے ''جانتے ہو زندگی کیا ہے؟ زندگی چند سانسوں سے بنی ہوئی ایک گیند ہے، جو تقدیر کے شریر بچے کے ہاتھوں میں اچھلتی ہے، لڑھکتی ہے، ناچتی ہے اور جانتے ہو ہر گیند کی قسمت میں گھسنا اور پھٹنا لکھا ہے۔ اگر تم اس گیند کو تقدیر کے ہاتھوں سے چھین کر اپنے بس میں کرلو تو تمھارا جینا سچا جینا ہے۔''

یہ خیالات یارو کے نہیں، خود افسانہ نگار کے فکری رویے کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ زندگی کے متعلق کس طرح سوچتا ہے۔ اپنے پورے افسانوی سرمایہ میں انھوں نے زندگی کی اس گیند کو بس میں کرنے اور 'سچے جینے' کی ترغیب دی ہے۔ اسی لیے ندیم نے ادب برائے ادب، یا ادب برائے زندگی جیسی اصطلاحوں سے بلند ہوکر غریب اور محنت کش طبقوں کے افراد کے احساسات و جذبات کو زبان دی ہے۔

ان کے افسانوں میں انسانی ذات کا درد سمٹ آیا ہے۔ ان میں ایک تہذیب و تمدن کے زوال کی تصویر اور آنے والے انقلاب اور تبدیلیوں کی چاپ صاف سنائی دیتی ہے۔ 'ووٹ' ان کی ایسی ہی کہانی ہے جس میں ملک صاحب ایک مٹتی ہوئی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں اور گاؤں کے افراد آنے والے انقلاب، سیاسی و سماجی شعور کی بیداری کا پتہ دیتے ہیں۔ اس میں بھی طبقاتی کش مکش کو پیش کیا گیا ہے۔ ملک صاحب، جو ووٹ حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرنا جانتے ہیں اور کسانوں کو ڈرا، دھمکا کر یا ان کی لڑکیاں اٹھوا کر ان کو خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں مگر اب یہ کسان نئی تبدیلیوں سے آشنا ہو چکے ہیں۔ وہ اب ظلم کو کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتے۔ چنانچہ کسان کی لڑکی کو وہ کوٹھے پہ قید کر لیتے ہیں لیکن محسوس کرتے ہیں کہ: وہ بھی کیا کسان عورتیں تھیں: بے چاریاں بالکل بھیڑیں، سیدھی، سادی، ڈری ڈری، سہمی سہمی، بات بات پر جی جی کی رٹ اور یہ یہ نئی کسان لڑکی دیکھو، ایسی دلیر اور بہادر شہزادیاں ضرور گزری ہیں مگر کسان ماؤں نے ایسی بیٹیاں کہاں جنی تھیں۔''

احمد ندیم قاسمی، پریم چند سے اسی مقام پر بالکل الگ کھڑے نظر آتے ہیں۔ پریم چند نے اپنی کہانیوں میں نسوانی کردار کو ترقی پسند یا باغی نہیں دکھایا ہے۔ جب کہ ندیم قاسمی کی اکثر کہانیوں میں ترقی پسند نسوانی کردار نظر آتے ہیں۔ مثلاً 'میرا دیس' کی سونی، کسان کی جوان بیٹی ہے اور زر خرید لونڈی کی طرح زمیندار کی خدمت کرتی

احمد ندیم قاسمی کے یہاں انسان دوستی کا رجحان بالکل واضح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی مثبت قدروں پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا ذہن پوری طرح مشرقی تہذیب کا تربیت یافتہ ہے۔ وہ زندگی کے مصور بھی ہیں، مفسر بھی اور ناقد بھی۔

ہے لیکن یہی سونی 'ووٹ' میں کسان کی غیرت مند اور سرکش لڑکی حلیماں اور ''کہانی لکھی جا رہی ہے'' کی فاطمہ بن جاتی ہے، جس کا یقین ہے کہ ''اب ہمارا وقت ہے، اور ہم تم سے اپنا حق مانگیں گے نہیں، چھین لیں گے، جھپٹ لیں گے'' اور یہی باغی لڑکی بعد میں ''ست بھرائی'' بن کر اپنی دنیا آپ پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ندیم کے افسانوں کے یہ نسوانی کردار مائل بہ ارتقا نظر آتے ہیں۔ ان کی سادگی اور معصومیت میں خود اعتمادی، ہوش مندی اور ذہنی بیداری کے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ندیم کے افسانوں کی بڑی نمایاں خصوصیت ہے جو اسے اردو کے افسانہ نگاروں میں ممتاز کر دیتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے یہاں انسان دوستی کا رجحان بالکل واضح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی مثبت قدروں پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا ذہن پوری طرح مشرقی تہذیب کا تربیت یافتہ ہے۔ وہ زندگی کے مصور بھی ہیں، مفسر بھی اور ناقد بھی۔

میں اپنی بات 'آنچل' کے دیباچے کی اس عبارت پر ختم کرنا چاہوں گا جس میں ''میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں؟'' کے تحت انھوں نے بڑی اہم بات کہی ہے کہ:

''میں پھولوں کے انبار کو پسند نہیں کرتا... میں انسانوں کے ہجوم کو پسند نہیں کرتا... مجھے ایک پھول، ایک ستارہ، ایک انسان چاہیے اور اس وحدت کو صرف افسانہ ہی سہارا دے سکتا... میں ایک انسان کو اپنے فن کا مرکز بناؤں گا تو ہبوط آدم سے لے کر موجودہ دور تک کا انسانی سفرنامہ سامنے آجائے گا۔ مجھے وحدت سے محبت ہے... مجھے ایک خدا چاہیے۔ ایک کائنات اور ایک انسان... متفق اور مجتمع...''

اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں 'انسانی سفرنامے' کو نہایت فن کاری سے پیش کیا ہے۔

■

Prof. Irteza Karim, Director NCPUL, New Delhi - 110025

احمد ندیم قاسمی

احوال وکوائف

افشاں ملک

کسی فنکار کی شخصیت پر گفتگو کرنے کے لیے اس وقت کے قومی اور بین الاقوامی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہوجاتا ہے جس میں فنکار پرورش پاکر بڑا ہوتا ہے اور اس کے عقل وشعور کو پہنچنے کا موقع ملتا ہے۔ انفرادی طور پر کوئی شخص اتنا منفرد نہیں ہوتا جتنا عام طور پر اسے سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ منفرد ہونا اور فرد کی حیثیت سے تشکیل پانا دونوں ہی باتیں مختلف ہیں۔ ایک فرد یا فنکار جب کسی معاشرے میں پل بڑھ کر جوان ہوتا ہے تو اس کی شخصی تعمیر میں گھریلو ماحول، سماجی ومعاشرتی رسم وروایات، معاشی اور تہذیبی محرکات اور تعلیمی فضا وغیرہ بہت سی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ یہ سارے عوامل جب ایک فرد کی شخصیت کو بطور فنکار مکمل کر چکے ہوتے ہیں تو فرد کی حیثیت سے فنکار اپنی انفرادیت کا احساس دلاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصی تعمیر میں بھی یہ سارے عوامل یقیناً کارفرما رہے ہوں گے۔ ان کی پیدائش کا عہد وہ ہے جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوچکی تھی اور انگریز دنیا کے بیشتر حصے پر اپنا تسلط قائم کر چکے تھے۔ ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد شروع ہوگئی تھی، اور ملک میں بیداری کی لہر پیدا ہورہی تھی۔ انگریز سامراج کی پالی ہوئی جماعتیں آزادی کی تحریک کو صدمہ پہنچانے کے لیے عوام کو فرقوں میں بانٹنے کی مذموم کوشش میں لگ گئی تھیں۔ ساتھ ہی ملک کا ادبی منظر نامہ بھی بدل رہا تھا۔ مسلم معاشرہ اگرچہ قدامت پسندانہ طرز زندگی میں جکڑا ہوا تھا پھر بھی دھیرے دھیرے سرسید کی تحریک کے زیر اثر یہ جکڑ ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ ایسے سماجی اور ملکی حالات میں احمد ندیم قاسمی 'احمد شاہ' نام لے کر پیدا ہوئے۔ آپ کی جائے پیدائش موضع 'انگہ' ضلع' خوشاب' پنجاب ہے جو اب پاکستان کا حصہ ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام 'غلام نبی' عرف 'نبی چن' تھا۔ ان کا انتقال 1924 میں ہوگیا تھا جبکہ ان کی والدہ 1956 تک حیات رہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی تاریخ پیدائش 20 نومبر 1916 ہے۔ اپنی حیات کے بارے میں خود احمد ندیم قاسمی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کے افراد اپنی روایتی وضع داری نبھانے کے لیے ریشم تک پہنتے تھے اور خالی پیٹ سو جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مدرسہ جانے سے پہلے میرے وہ آنسو بڑی احتیاط سے پونچھے جاتے تھے جو اماں سے محض ایک پیسہ حاصل کرنے میں ناکامی کے دکھ پر بہہ نکلتے تھے۔ لیکن میرے لباس کی صفائی، میرے بستے کا ٹھاٹھ اور میری کتابوں کا 'گیٹ اپ' کسی سے کم نہ ہوتا تھا۔ گھر سے باہر احساس برتری رہتا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سارے آبگینے چور چور ہوجاتے جنھیں میری طفلی کے خواب تراشتے تھے۔ پیاز، سبز مرچ یا نمک مرچ کے مرکب سے روٹی کھاتے وقت زندگی بڑی سفاک معلوم ہونے لگتی تھی— خاندان کے باقی سب گھرانے کھاتے پیتے تھے، زندگی پر ملمع چڑھائے رکھنے کا تکلف ہمارے ہی نصیب میں تھا۔ والد گرامی پیر تھے یاد الٰہی میں کچھ ایسی استغراق کی کیفیتیں طاری ہونے لگی تھیں کہ مجذوب ہوگئے اور جن عزیزوں نے ان کی گدی پر قبضہ جمایا انھوں نے ان کی بیوی ایک بیٹی اور دو بیٹوں اور خود ان کے لیے کل مبلغ ڈیڑھ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ تین پیسے روزانہ کی اس آمدنی میں اماں مجھے روزانہ ایک پیسہ دینے کی بجائے میرے آنسو پونچھ لینا زیادہ آسان سمجھتی تھیں... گھرانے کی عزت کے اس احساس نے مجھے وقت سے پہلے حساس بنادیا اور ممکن ہے اسی گداز نے مجھے فنکار بنایا ہو اگر بچپن میں مجھے ماں کی محبت نہ ملتی تو ممکن ہے میں نہایت خطرناک کلبی اور قنوطی ہوتا۔''

(ماخوذ: احمد ندیم قاسمی نمبر، مضمون 'چند یادیں' ص 20-19، عالمی اردو ادب 1996، مدیر نند کشور وکرم)

جیسا کہ احمد ندیم قاسمی نے تحریر کیا ہے کہ شاید انھیں کربناک حالات نے انھیں فنکار بنایا، یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن ایک اور بات ہے جو قاسمی صاحب کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے وہ یہ کہ احمد ندیم قاسمی کی جگہ کوئی معمولی اور عمومی ذہن کا بچہ انھیں حالات میں اگر پرورش پاتا تو وہ مجرمانہ زندگی کی طرف بھی بڑھ سکتا تھا یا مایوس کن زندگی سے سمجھوتا نہ کرسکتے ہوئے کوئی منفی قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کو شروع ہی سے عام بچوں سے زیادہ حساس ذہن ملا تھا اور ایسا ذہن جن ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو ودیعت ہوتا ہے وہ عام بچوں کی طرح ان دردناک حالات میں ٹوٹ کر بکھرتے نہیں بلکہ اوائل عمر کی ان تلخیوں اور محرومیوں کا ازالہ اپنے فن کے ذریعے ہی کرتے ہیں۔ 1921 میں احمد ندیم قاسمی موضع انگہ کی ہی ایک مسجد سے ملحق مکتب میں قرآن کا درس لینے کے لیے داخل کیے گئے۔ تقریباً ایک سال درس قرآن لینے کے بعد 1921 کے اواخر میں گورنمنٹ اینڈ نارمل اسکول کیمبل پور میں داخل ہوئے اور یہیں سے 1931 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد صادق ایجرٹن کالج بھاولپور سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ اسی دوران وہ شفیق چچا چل بسے جو ان دونوں بھائیوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ 1935 میں احمد ندیم قاسمی پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کی سند حاصل کرنے کے بعد ایم۔اے

انگلش میں داخلے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور کی میرٹ لسٹ میں نامزد ہوئے لیکن فیس نہ ہونے کی وجہ سے داخلے سے محروم رہ گئے۔ ان نامساعد حالات میں بھی احمد ندیم قاسمی نے تعلیم کا جو بھی سلسلہ جاری رکھا وہ صرف ان کی اپنی لگن اور محنت کا ہی نتیجہ تھا کسی مالی فراغت یا اعانت کے بل پر نہیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ قدرت جب کسی کے راستے میں مشکلات پیدا کرتی ہے تو اس سے عہدہ برآ ہونے کا راستہ بھی نکال دیتی ہے۔ عسرت کی زندگی میں احمد شاہ کا واحد سہارا ان کی والدہ رہیں۔ انھوں نے بارہا اپنی تحریروں میں ذکر کیا ہے کہ ''میری زندگی پر سب سے عظیم اثر میری ماں کا ہے۔'' یوں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ احمد ندیم قاسمی کی ذہنی ترغیبات کا سب سے پہلا منبع ان کی والدہ رہیں۔ وہ نو برس کی عمر میں ہی اپنے بڑے بھائی محمد شاہ کے ساتھ اپنے چچا کے پاس کیمبل پور چلے گئے تھے۔ ان کے چچا وہاں سول افسر تھے۔ پر اتنی چھوٹی عمر میں والدہ سے جدائی ان پر بڑی شاق گزرتی تھی۔ اس زمانے کا تذکرہ کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی نے تحریر کیا ہے:

''مجھے یاد ہے کہ بعض سنسان دوپہر کو ہم دونوں بھائی ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ جاتے اور رو رو کر اماں کی باتیں کرتے پھر اچانک بھائی جان کو یاد آ جاتا کہ

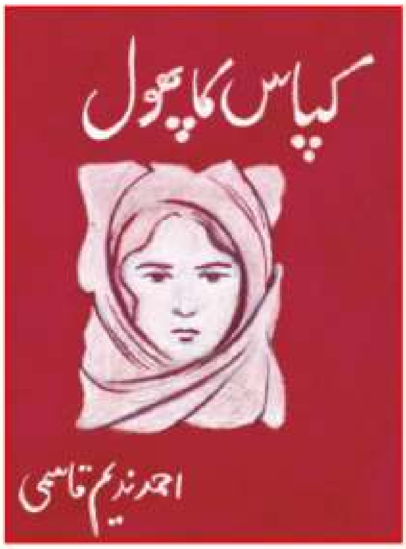

وہ مجھ سے دو سال بڑے ہیں۔ وہ میرے آنسو پونچھتے، مجھے تسلیاں دیتے، مجھ پر زیادہ رقت طاری ہو جاتی تو غصہ بھی ہو جاتے اور پیٹ بھی ڈالتے۔''

(بحوالہ: 'مضمون چند یادیں' ص 20، احمد ندیم قاسمی نمبر، عالمی اردو ادب 1996، مدیر نند کشور وکرم)

'احمد شاہ' نے 'احمد ندیم قاسمی' بننے سے پہلے گاؤں کی مفلوک الحال زندگی اور برسات میں ٹپکتی ہوئی گھر کی چھت دیکھی تھی اور ساتھ ہی سول افسر چچا کا پرآسائش گھر بھی دیکھا تھا۔ ان متضاد زندگیوں سے گزرتے ہوئے احمد شاہ کا حساس ذہن جیسے جیسے بالیدہ ہوتا گیا ویسے ویسے ان کی شخصیت میں دردمندی اور گداز بھی پیدا ہوتا گیا یہی دردمندی اور دل سوزی ان کے شعری اور افسانوی ادب (دونوں میں) شدت کے ساتھ اُبھری ہے۔ ماں کے ساتھ ہی احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کی تعمیر میں ایک اور سب سے اہم رول نیچر کا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں:

''میں جب اپنے بچپن کا تصور کرتا ہوں تو ماں کے بعد جو چیز میرے ذہن پر چھا جاتی ہے وہ حسن فطرت ہے۔ یقیناً یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مظاہر فطرت سے موانست کا یہ جذبہ کب کیسے اور کیوں پیدا ہوا؟ مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ جب بھی میں اپنا ماضی یاد کرتا ہوں تو لہلہاتے ہوئے کھیتوں، اُمڈتے ہوئے بادلوں، ڈھلی ہوئی پہاڑیوں اور چکراتی، بل کھاتی اور قدم قدم پر پہلو بچاتی ہوئی پگڈنڈیوں کی ایک دنیا میرے ذہن میں آباد ہو جاتی ہے۔ بھکیڑے کے پھول کی جڑیں، مٹھاس کا موتی، لانبی لچکتی گھاس کی چوٹی پر جانے کی کوشش میں چیونٹی سے بھی کہیں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی استقامت، چٹختی ہوئی چٹانوں کی جھریوں میں پھوٹتے ہوئے جنگلی پھولوں کے پودھے، گھنی پھلاہیوں کے سائے میں دھرتی کی بھینی بھینی خوشبو، دور نیلے پہاڑ کے دامن میں آئینے کی طرح چمکتی ہوئی جھیل پر سورج کی کرنوں کی سڑک، بادل کی گرج کے ساتھ تانبے کی چادروں کی طرح بجتے ہوئے پہاڑ، مکّی کے بھٹوں کے لانبے سنہرے بالوں میں مکّی کی مہک یہ اور دوسری تفاصیل جو کبھی کبھی میرے افسانوں اور شعروں کا پس منظر بن جاتی ہیں، میری زندگی کے اسی دور کا جمع کیا ہوا اثاثہ ہے۔ جب میں وادیوں اور گھاٹیوں میں اپلے چننے نکلتا تھا یا اپنے میلے کپڑوں کی پوٹلی لیے اونچی پہاڑیوں پر پیالوں کے سے تالابوں میں کپڑے دھونے جاتا تھا۔''

(ماخوذ: احمد ندیم قاسمی نمبر، ص 23، عالمی اردو ادب 1996، مدیر نند کشور وکرم، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائیزرس، بے 6، کرشنا نگر دہلی)

فطرت کے ساتھ والہانہ تعلق نے ان میں ایک طرح کی سادہ مزاجی، وسیع القلبی اور کشادہ ذہنی پیدا کی جہاں ایک طرف ماں کے آنچل اور بچپن کی تنگ حالی نے انھیں دل گداز بنایا وہیں انسانیت کے تئیں ہمدردی، اور دردمندی کا احساس بھی دیا ساتھ ہی شہری زندگی نے انھیں اس طبقے سے روشناس کرایا جس سے ان کا بچپن واقف نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی مظاہر فطرت نے انھیں سادگی، کشادہ دلی اور حسن پرستی کے جوہر بھی عطا کیے۔ اسی لیے احمد ندیم قاسمی معاشرے کے لاکھوں کروڑوں لوگوں کے دکھ درد سے جڑے ہوئے، طبقاتی سماج کی نفسیات سے واقف اور فطرت کی سادگی کے دلدادہ فنکار بن کر ابھرے۔ اپنے ایک مضمون ''چند یادیں'' میں لکھتے ہیں کہ:

''میں نے جب پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تو مناظر فطرت کے حسن اور اسلامی روایات کے طنطنے کے ساتھ مجھے اس معاشرتی اور معاشی تفاوت نے بھی متاثر کیا اور میں رومانوں اور خوابوں سے اٹے ہوئے ذہن کا وہ چور دروازہ بند نہ کر سکا جس میں سے

> میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا منکر نہیں ہوں۔ میں داڑھی مونچھیں منڈوا دینے یا کوٹ پتلون پہن لینے کو مشرقی اخلاق کی بے حرمتی نہیں سمجھتا۔ لیکن انسان سے محبت کرنے، سچ بولنے، خلوص برتنے، بے تعصب اور بے ریا رہنے، نڈر ہو کر سچائی کا اعلان کرنے اور ظالم کی طرف سر بازار انگلی اٹھا کر اسے ظالم کہہ دینے کو بہترین اخلاق تصور کرتا ہوں۔

آنکھوں دیکھی سفاک حقیقتیں اندر سرک آتی تھیں۔ مگر اس وقت یہ حقیقتیں مجھ پر محض رقت کی کیفیت طاری کر سکتی تھیں اور میں اس کیفیت کو اپنی کہانیوں میں منتقل کر دیتا تھا۔ بہت بعد میں مجھے یہ خیال آیا کہ فلاں غریب ہے تو آخر کیوں غریب ہے؟ فلاں نے اپنی بیٹی بیچ دی تو کیوں بیچ دی؟ فلاں نے چوری کی ہے تو کیوں کی ہے؟ فلاں بے گناہ نے تھانے دار کے سامنے ناک سے لکیریں کھینچی تو کیوں کھینچیں؟ اور فلاں چپکے سے بیگار پر کام کرنے چلا گیا تو کیوں چلا گیا؟ اور جب میں نے بہت کچھ سوچا تو ہر حقیقت کے پیچھے مجھے روپوں کی تھیلی چھنچھناتی سنائی دی۔ میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا منکر نہیں ہوں۔ میں داڑھی مونچھیں منڈوا دینے یا کوٹ پتلون پہن لینے کو مشرقی اخلاق کی بے حرمتی نہیں سمجھتا۔ لیکن انسان سے محبت کرنے، سچ بولنے، خلوص برتنے،

بے تعصب اور بے ریا رہنے، نڈر ہوکر سچائی کا اعلان کرنے اور ظالم کی طرف سر بازار انگلی اٹھا کر اسے ظالم کہہ دینے کو بہترین اخلاق تصور کرتا ہوں۔"

(بحوالہ مضمون 'چند یادیں' ص25، احمد ندیم قاسمی نمبر، عالمی اردو ادب 1996، مدیر نند کشور وکرم)

درج بالا اقتباس میں 'کیوں' کی تکرار سے جتنے سوال احمد ندیم قاسمی نے اٹھائے ہیں یہ سارے سوال ان کے اس ادبی سفر کی نشاندہی کرتے ہیں جو انھوں نے رومان سے تعلق توڑتے ہوئے حقیقت کی طرف شروع کیا

احمد ندیم قاسمی کو قدرت نے بڑی صلاحیت عطا کی تھی۔ان کی ذہانت نے متعدد تخلیقی پیرایوں میں بڑی آسانی سے اپنا جوہر دکھایا۔ وہ ہمارے سامنے اپنی شخصیت میں صرف شاعر اور افسانہ نگار کا ہی رُوپ لے کر نہیں ابھرتے بلکہ ایک مشاق اور دوررس مدیر اور صحافی کی حیثیت سے بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ اگرچہ عام طور پر ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ایک منفرد ادیب اور معتبر شاعر عمیق نظر رکھنے والا اچھا مدیر بھی ہو۔لیکن احمد ندیم قاسمی نے ادارت کے فرائض بھی احسن طریقے سے ادا کیے۔سب سے پہلے انھوں نے لاہور سے نکلنے والے بچوں کے رسالے 'پھول' کی ادارت کی۔ جس سے وہ 1941 سے 1945 تک جڑے رہے۔

تھا اور یوں اس سفر میں وہ ایک حقیقت پسند فنکار بن کر ہمارے سامنے اُبھرے۔احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کا معروضی اور دیانت دارانہ مطالعہ کرنے سے جو خاص اور اہم پہلو نظر آتے ہیں ان میں سب سے اہم اور اپنی طرف توجہ مبذول کرانے والا پہلو ان کی انفرادی اور شخصی زندگی کا فعال ہونا ہے۔ عام طور پر ذہنی سرگرمی میں مبتلا لوگ عملی اور دنیاوی زندگی کے معاملات میں ضرورت سے زیادہ لاپرواہ اور بے نیازانہ رویہ اختیار کیے رہتے ہیں۔ انھیں کے عصر کے سعادت حسن منٹو، اختر شیرانی اور ان کے بعد اسرار الحق مجاز جیسے تخلیقی فنکاروں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عام طور پر اپنی سماجی اور اجتماعی زندگی سے کنارہ کش رہے۔ زندگی کے عملی میدان میں ان کا کوئی حصہ نہیں رہا۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کے معاملے میں یہ استثنا ہے کہ وہ ایک خلاق ذہن رکھتے ہوئے بھی اپنی روز مرّہ کی عملی اور اجتماعی زندگی سے اسی طرح وابستہ رہے جس طرح معاشرے کا کوئی اور ذمے دار شخص۔ اسی لیے وہ ہمیں سماج کے ایک ذمّے دار فرد، خاندان کے سرپرست، ایک شفیق باپ، محبت کرنے والے شوہر اور اس کے ساتھ ہی معاشی ضرورتوں کے لیے اکتساب کرنے والے ایک مرد باعمل کی طرح نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کی سوانح ہماری نظر سے گزرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ 1935 میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کی سند حاصل کرنے والے احمد ندیم قاسمی صرف ایک سال کے بعد ہی ریفارمز کمشنر لاہور کے دفتر میں محرر کی حیثیت سے صرف 20 روپیہ ماہوار کی ملازمت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ اسے ان کی مجبوری بھی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ ان کی صرف مجبوری ہی نہیں تھی بلکہ ان ذمے داریوں کو پورا کرنے کا احساس تھا جو زندگی نے ان پر ڈالی تھیں۔ ان کے زمانے میں علم وادب کے شعبے میں جو شاعرانہ لاابالی پن آگیا تھا اور جسے شاعر اور افسانہ نگار اپنا طرّۂ امتیاز سمجھنے لگے تھے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ احمد ندیم قاسمی بھی اپنے عصر کے دوسرے ادیبوں کی طرح شاعرانہ لاابالی پن کا شکار ہو جاتے۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں کیا اور محرّر کی حیثیت سے 20 روپیہ ماہ کی وہ چھوٹی سی ملازمت اس لیے اختیار کر لی کہ وہ زندگی کی تجربہ گاہ میں تپ کر بہت اچھی طرح یہ سمجھ گئے تھے کہ زندگی لااُبالی پن کا نام نہیں ہے۔ اس دفتر میں انھوں نے محرر کی حیثیت سے تین سال تک کام کیا اور ان تین سالوں میں جہاں انھوں نے ادب وفن کے شعبے میں اپنا اکتساب جاری رکھا وہیں اس بات کی کوشش بھی کرتے رہے کہ وہ کسی بہتر معاشی مصروفیت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ 1939 میں انھوں نے محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹر کی ملازمت حاصل کر لی۔ جس سے وہ اگلے دو برس تک منسلک رہے۔ یہاں پر ایک اور بات موضوع بحث ہو سکتی ہے وہ یہ کہ کیا اپنی ذہنی ترغیبات سے بالکل برعکس روزگار یا پیشہ اختیار کرنے سے کسی ادبی تخلیقی ذہن پر مخالف یا معکوس اثرات مرتب ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں؟ یہاں پر احمد ندیم قاسمی نے اس مفروضے کو بھی غلط ثابت کر دیا۔ 1936 سے 1941 تک وہ جن ملازمتوں سے اپنی روزی روٹی کماتے رہے وہ ان کے ذہن سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ پانچ سال تک غیر ادبی پیشوں سے جڑ کر بھی اگر وہ اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھ سکے تو یا تو ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ غیر موزوں معاشی وابستگیاں تخلیقی ذہن پر بہت زیادہ ناگوار اثر نہیں ڈالتیں یا پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ احمد ندیم قاسمی ایک ایسے غیر معمولی فنکار ہیں جو ناموافق حالات میں بھی اپنے تخلیقی جوہر دکھانا نہیں چھوڑتے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ یہ دوسری بات احمد ندیم قاسمی کے معاملے میں بالکل صحیح ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی یہ دوسری غیر ادبی سب انسپکٹر والی ملازمت بھی ان کا ساتھ بہت دیر تک نہیں دے سکی اور صرف پانچ سال کی مدت کے بعد 1946 میں انھوں نے ریڈیو پاکستان کے پشاور اسٹیشن پر اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ ان کا یہ نیا ذریعہ معاش ان کے ادبی رجحان سے کافی حد تک میل کھاتا تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ احمد ندیم قاسمی ملازمتیں حاصل کرنے سے بہت پہلے ہی اپنا شعری سفر نہ صرف شروع کر چکے تھے بلکہ خاموشی کے ساتھ اپنے ادبی اور تخلیقی رویّوں کی پرورش بھی کر رہے تھے۔ ان کا شعری سفر کچھ آگے تب بڑھا جب ان کی ایک مرثیہ نما نظم جو انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر کہی تھی 1931 میں لاہور سے نکلنے والے روزنامہ 'سیاست' میں شائع ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی کی ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز اسی نظم سے مقرر کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے انھوں نے جو کچھ بھی کہا ہوگا اسے سلسلۂ مشق کے خانے میں ڈالنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

احمد ندیم قاسمی کی تخلیقیت کا دوسرا پہلو ان کی افسانہ نویسی ہے۔ کسی بھی فنکار کی شخصیت کا جائزہ لینے کے لیے اس کی سبھی تخلیقی جہات کو سامنے رکھنا ہوگا کیونکہ تخلیق کار کا کوئی بھی پہلو ایک دوسرے سے بہت زیادہ الگ کر کے نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ پرکھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک احمد ندیم قاسمی کے افسانوں اور ان کی شعری تخلیقات کا معاملہ ہے یہ دونوں ایک دوسرے کی خلا کو پُر کرنے والے ہیں۔ میری اس بات کو خود احمد ندیم قاسمی کے ادبی اور تخلیقی سفر نے بخوبی ثابت کیا ہے۔ کیونکہ ایک طرف 1942 میں جب ان کا پہلا شعری مجموعہ طبع ہو کر سامنے آتا ہے تو دوسری طرف ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'چوپال' بھی 1939 میں دارالاشاعت لاہور سے شائع ہو چکا ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے یہاں شعری اور افسانوی عمل دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے، اپنے تخلیقی اظہار کے لیے جو موضوع انھوں نے

افسانے کے لیے مناسب نہیں سمجھا اسے شعر کے حوالے سے اظہار کے پیرائے میں ڈھال دیا اور جس تجربے کو انھوں نے شاعری کے لیے موزوں نہیں سمجھا اسے افسانے کی شکل دے دی۔

احمد ندیم قاسمی کو قدرت نے بڑی صلاحیت عطا کی تھی۔ ان کی ذہانت نے متعدد تخلیقی پیرایوں میں آسانی سے اپنا جوہر دکھایا۔ وہ ہمارے سامنے اپنی شخصیت میں صرف شاعر اور افسانہ نگار کا ہی روپ لے کر نہیں ابھرتے بلکہ ایک مشاق اور دوررس مدیر اور صحافی کی حیثیت سے بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ اگر چہ عام طور پر ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ایک منفرد ادیب اور معتبر شاعر عمیق نظر رکھنے والا اچھا مدیر بھی ہو۔ لیکن احمد ندیم قاسمی نے ادارت کے فرائض بھی احسن طریقے سے ادا کیے۔ سب سے پہلے انھوں نے لاہور سے نکلنے والے بچوں کے رسالے ’پھول‘ کی ادارت کی۔ جس سے وہ 1941 سے 1945 تک جڑے رہے۔ اس کے فوراً بعد ہی وہ خواتین کے ہفت روزہ مجلّہ ’تہذیب نسواں‘ سے وابستہ ہوگئے۔ لیکن یہ وابستگی بھی لمبے عرصے تک نہیں چل سکی۔ اس کے بعد وہ ماہ نامہ ’ادب لطیف‘ (لاہور) سے 1941 سے 1945 تک وابستہ رہے لیکن ایک سال کے بعد ہی انھوں نے برصغیر کے مشہور و معروف ادبی رسالہ ’سویرا‘ (لاہور) سے اپنی ادبی ادارت کا آغاز کیا اور اپنی ادارت میں اس معتبر ادبی رسالے کے چار شمارے مرتب کیے۔ یہاں بھی وہ بہت عرصے تک نہیں رہ پائے۔ ان کا اگلا ادبی پڑاؤ عالمی سطح پر مشہور اردو کا ادبی رسالہ ’نقوش‘ کے خیمہ میں ہوا۔ یہاں انھوں نے 1950 تا 1948 تک ماہنامہ ’نقوش‘ کے ابتدائی دس شمارے ترتیب دیے۔ برصغیر میں پاکستان کا یہ واحد ادبی رسالہ تھا جس نے اپنی ایک تاریخی حیثیت بنائی۔ سمجھا جاسکتا ہے کہ ایسے معتبر، مستند، اور ہمہ گیر رسالے سے وابستگی نے احمد ندیم قاسمی کو ذہنی طور پر جتنا فائدہ پہنچایا ہوگا اتنا ہی فائدہ ان کی ذہنی بالیدگی سے نقوش کو بھی پہنچا ہوگا۔ ماہنامہ ’سحر‘ لاہور کے صرف ایک شمارے کی ادارت کی۔ 1977 سے 1988 تک رسالہ ’اقبال‘ لاہور کے اعزازی مدیر رہے۔ 1974 سے 2006 تک رسالہ ’صحیفہ‘ لاہور کی ادارت کی۔ 1963 میں انھوں نے اپنا ذاتی ادبی رسالہ ’فنون‘ نکالا جس کی ادارت وہ تا حیات کرتے رہے، احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں 2006 تک اس موقر ادبی رسالے کے 126 شمارے منظر عام پر آئے۔

’نقوش‘ کی ادارت سے دست بردار ہو کر احمد ندیم قاسمی لاہور کے مشہور روزنامہ ’امروز‘ سے وابستہ ہوئے تو

انھوں نے مستقل طور پر ’پنج دریا‘ نام سے روزانہ ایک کالم لکھنا شروع کیا جو 1959 تک چلتا رہا۔ کالم کا نام ’’پنج دریا‘‘ شاید اسی لیے رکھا تھا کہ پنجاب پانچ دریاؤں کا صوبہ ہے اور پاکستان انھیں پانچ دریاؤں کے باعث ایک خصوصی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کالم میں احمد ندیم قاسمی نے اپنے ملک کی معاشی، سیاسی معاشرتی، مذہبی اور جماعتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہوگا۔ روزمرہ کے واقعات پر ایسے ایسے شذرات لکھے ہوں گے جو پاکستان کے حالات کا گہرائی سے جائزہ لینے والے ہوں۔ ’امروز‘ سے الگ ہونے کے بعد انھوں نے روزنامہ ’ہلال‘ میں ایک کالم ’موج در موج‘ کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ ساتھ ہی ’پنج دریا‘ کے نام سے لکھا جانے والا فکاہی کالم بھی جاری رکھا۔ جب یہ سلسلہ ٹوٹا تو احمد ندیم قاسمی نے روزنامہ ’احسان‘ سے وابستگی اختیار کرلی اور اس میں بھی وہ کالم نویسی کرتے رہے۔ جب ’امروز‘ سرکاری سے نیم سرکاری ہوگیا تو 1964 میں احمد ندیم قاسمی نے دوبارہ اپنا روزانہ کا کالم ’’حرف وحکایت‘‘ کے عنوان سے شروع کیا۔ یہ سلسلہ 1970 تک جاری رہا۔ اسی دوران ان کی وابستگی کراچی سے نکلنے والے مشہور روزنامہ ’جنگ‘ سے ہوگئی۔ جس میں وہ ’لاہور — لاہور ہے‘ کے نام سے کالم نویسی کرتے رہے لیکن یہ سلسلہ بہت لمبے عرصہ تک جاری نہیں رہ سکا۔ بعد میں وہ ایک اور روزنامہ ’حریت‘ سے وابستہ ہوگئے۔ یہاں انھوں نے ’موج در موج‘ اور ’لاہوریات‘ کے نام سے ایک ہفتہ وار فکاہی کالم شروع کیا۔ اپریل 1972 میں ان کی وابستگی ایک بار پھر روزنامہ ’امروز‘ سے ہوگئی۔ روزنامہ ’جنگ‘ لاہور میں آخری کالم ’رواں دواں‘ ان کی وفات سے پانچ روز پہلے شائع ہو...!!!

درج بالا تفصیلات پہلے مرحلے میں ہی یہ حقیقت منکشف کردیتی ہیں کہ احمد ندیم قاسمی کی ادبی اور ذہنی ترغیبات صرف شاعری اور افسانہ نگاری تک ہی محدود نہیں تھیں۔ وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، کالم نویس، تنقید نگار اور بچوں کا ادب لکھنے والے ادیب تو تھے ہی ساتھ ہی خواتین کی نمائندگی کے لیے بھی ان کا قلم اسی تیزی سے چلتا رہا جیسا دوسری اصناف کے لیے۔ انھوں نے ادبی رسائل اور سیاسی اخبارات دونوں کی ادارت کے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کیے اور ایک مدیر اور صحافی کی حیثیت سے بھی اپنی انفرادیت قائم کی۔

احمد ندیم قاسمی کی تخلیقی جہات کا احاطہ کرنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔ ان کی تصنیف و تالیف میں افسانوں کے 17 مجموعے اور شاعری کے 12 مجموعے شائع ہو کر اردو ادب کا حصہ بنے۔ تنقید نگاری سے بھی انھوں نے پرہیز نہیں کیا، ’تہذیب و فن‘، ’ادب اور تعلیم کے رشتے‘، ’اقبال: ایک محاکمہ‘، ’پس الفاظ‘ اور ’معنی کی تلاش‘ وغیرہ اہم تنقیدی کتابیں ہیں۔ سوانحی خاکوں پر مبنی دو کتابیں ’میرے ہمسفر‘ 2002 میں اور ’میرے ہم قدم‘ 2006 میں شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ بچوں کے ادب میں ’آسمان کے گوشے میں‘ (ڈرامے) اور ’دوستوں کی کہانیاں‘ 1943 میں اور ’نئی نویلی کہانیاں‘ 1944 میں شائع ہوئیں۔ ترتیب و تدوین کے حوالے سے بھی احمد ندیم قاسمی کا طبع شدہ کام بہت اہمیت کا حامل ہے، ’انگڑائیاں‘ مرد افسانہ نگاروں کا انتخاب، ’نقوش لطیف‘ خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب اور ’کیسر کیاری‘ منتخب طبع زاد اور ماخوذ تحریروں کا مجموعہ‘ یہ تینوں کتابیں 1944 میں شائع ہوئیں۔ علاوہ ازیں ’منٹو کے خطوط بنام ندیم‘ 1966 میں، ’پاکستان کی لوک کہانیاں‘ (ترجمہ) 1972 میں، ’نذر حمید احمد خان‘ ترتیب 1977 میں شائع ہونے والی کتب ہیں۔ ان کے علاوہ بھی احمد ندیم قاسمی نے مختلف کتب و رسائل تحریر اور مرتب کیے۔

احمد ندیم قاسمی کی ادبی خدمات کے سلسلے میں حکومت پاکستان نے پہلی بار 1963 میں ان کے شعری مجموعے ’دشت وفا‘ کے لیے ’آدم جی ادبی ایوارڈ‘ سے نوازا۔ 1968 میں پرائیڈ آف پرفارمینس کا سول اعزاز، 1976 میں ’آدم جی ادبی ایوارڈ‘ برائے ’محیط‘ اور 1979 میں شعری مجموعہ ’دوام‘ پر ایک بار پھر ’آدم جی ادبی ایوارڈ‘ سے سرفراز کیا گیا۔ پاکستان کے ادبی اعزازات میں یہ

حکومت پاکستان کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ 1980 میں حکومت پاکستان نے 'ستارۂ امتیاز' جیسے وقیع اعزاز سے نوازا۔ 98-1997 میں کمال فن ایوارڈ، اور 1999 میں پاکستان حکومت نے 'نشان امتیاز' سے سرفراز کیا۔ 2002 میں 'اے۔آر۔وائی گولڈ ادبی ایوارڈ'، 'دوحہ ادبی ایوارڈ' (یو۔اے۔ای) اور 'غالب ایوارڈ' (دہلی، بھارت) نے بھی احمد ندیم قاسمی کی ادبی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اعزازات سے نوازا۔

1948 میں احمد ندیم قاسمی کی والدہ نے اپنی پسند سے خاندان میں ہی ان کی شادی کی، آپ کی شریک حیات کا اسم گرامی 'رابعہ' تھا۔ اولادوں میں بیٹا 'نعمان قاسمی' اور دو بیٹیاں 'ناہید قاسمی' اور 'نشاط قاسمی' ہیں۔ 'ناہید' ان کی سب سے بڑی بیٹی ہیں جو شاعرہ بھی ہیں۔ 'ناہید قاسمی' کے نام سے مشہور ہیں۔ 'نشاط ندیم' بھی شعر کہتی تھیں شادی شدہ تھیں 1995 میں خالق حقیقی سے جاملیں۔ احمد ندیم قاسمی اور 'فنون' کی معاون مدیرہ 'منصورہ احمد' کے گزر جانے کے بعد 'فنون' نکلنا بند ہوگیا تھا لیکن خوشی کا مقام ہے کہ آج کل محترمہ 'ناہید قاسمی' اور ان کے بڑے بیٹے محترم 'نیر حیات قاسمی' (جو خود بھی شاعر ہیں) کی ادارت میں اردو کا یہ تاریخی ادبی جریدہ دوبارہ بڑی آب و تاب سے نکل رہا ہے۔ نیز فنون کے شیدائی قارئین، ناقدین، ادبا اور شعراء کا وسیع حلقہ جو رسالہ بند ہوجانے سے مایوس ہوچلا تھا اسی محبت وعقیدت کے ساتھ پھر سے جڑ گیا ہے۔ نیر حیات قاسمی اپنے نانا احمد ندیم قاسمی کی ادبی وراثت کو بہ حسن خوبی سنبھال کر ان کے لگائے ہوئے اس ادبی شجر کی آبیاری میں جی جان سے جٹ گئے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کی زندگی میں کئی لوگ جو ان کے بہت قریب رہے انھیں بے حد عزیز تھے، اپنی اولادوں کے علاوہ 'منصورہ احمد' جو ان کی منہ بولی بیٹی تھیں اور 'فنون' میں احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ہی مدیرہ کے فرائض بھی انجام دیتی تھیں ان کو بے حد عزیز تھیں، اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، تسنیم سلیم چھتاری وغیرہ ان کی بہت ہی عزیز منہ بولی بہنیں ہیں۔ آپ کی بڑی بہن سعیدہ کے بیٹے 'ظہیر بابر' جن کا شمار پاکستان کے مشہور صحافیوں میں کیا جاتا ہے آپ کے اکلوتے بھانجے ہیں اور 'خدیجہ مستور' کے شوہر بھی۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کا ایک اور پہلو جو انھیں منفرد بناتا ہے کہ وہ عورت کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ جذبہ عبادت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ ان کی زندگی میں عورت ہر شکل میں موجود ہے۔ ماں، بیوی، بہن، بیٹی اور دوست کوئی بھی ہو عزیز اور محترم ہے۔ ویسے تو احمد ندیم قاسمی کا تعلق پیروں کے خاندان سے تھا لیکن وہ فطرتاً کسان تھے۔ انھیں اپنی زمین سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اپنی زمین کے ہر ذرّے سے انھیں محبت تھی۔ وہ اسے (زمین کو) ماں سے تشبیہ دیتے تھے اور ویسی ہی محبت بھی کرتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی ان بہت تھوڑے لوگوں میں سے تھے جو اپنے آپ پر ہنس کر اپنا مذاق خود اڑا کر اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک افسانہ نگار، ایک شاعر اور ایک صحافی تھے بلکہ ادبی، ثقافتی اور سماجی قدروں کے امین بھی تھے۔ انھوں نے ہمیشہ نو آموز ادیبوں اور شاعروں کی رہنمائی کی لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ اس عظیم فنکار کا کوئی شاگرد نہیں ہے۔ انھوں نے ہمیشہ سب کو دوست سمجھا اور ادب کے میدان میں

> احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کا ایک اور پہلو جو انھیں منفرد بناتا ہے کہ وہ عورت کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ جذبہ عبادت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ ان کی زندگی میں عورت ہر شکل میں موجود ہے۔ ماں، بیوی، بہن، بیٹی اور دوست کوئی بھی ہو عزیز اور محترم ہے۔

سب کے لیے راستے ہموار کیے۔ 'فنون' جیسے معیاری جریدے میں نو آموز شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شائع کرکے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ادب کے فروغ کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے اور کبھی کسی ادبی تحریک سے ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔

ایک فنکار کی حیثیت سے احمد ندیم قاسمی کی ادبی حیثیت اور عظمت کا اعتراف صرف حکومت پاکستان کی طرف سے ہی نہیں کیا گیا بلکہ غیر سرکاری تنظیموں، ادبی اشاعتی گھرانوں اور دیگر ادبی ہستیوں اور مدیروں نے ان پر خصوصی نمبر شائع کرکے ان کے ادبی قامت کی پزیرائی کی۔ ان پر ان کی زندگی میں ہی تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ ہندوستان کی کئی یونیورسٹیز بشمول علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان پر ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالے لکھے جاچکے ہیں۔ خاکسار نے بھی 2004 میں 'احمد ندیم قاسمی: شاعر اور افسانہ نگار (تجزیاتی مطالعہ)' کے عنوان سے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ احمد ندیم قاسمی پر انڈیا اور پاکستان میں شائع ہونے والی کچھ خصوصی کتب درج ذیل ہیں:

'ندیم نامہ' (ترتیب محمد طفیل اور بشیر موجد) 1976، 'ندیم کی شاعری اور شخصیت' (جمیل ملک)، رسالہ 'افکار' کراچی کا ندیم نمبر (مدیر صہبا لکھنوی) 1975، 'احمد ندیم قاسمی: شاعر اور افسانہ نگار' (پروفیسر فتح محمد ملک) 1991، 'مٹی کا سمندر' (مرتب ضیا ساجد) 1991، 'گل پاشی' (مرتب منصور آفاق: منصورہ احمد) 1996، رسالہ 'عبارت' ندیم نمبر 1966، جریدہ عالمی اردو ادب 'ندیم نمبر' (مدیر نند کشور وکرم، دہلی بھارت) 1996، 'ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ' (ڈاکٹر ناہید قاسمی) 2002، 'احمد ندیم قاسمی: ایک لیجینڈ' (ڈاکٹر شکیل الرحمٰن) 2003، 'افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی: آثار و افکار' (ڈاکٹر افشاں ملک) 2007۔ اس کے علاوہ انڈو پاک کے متعدد رسائل و اخبارات میں مختلف مواقع پر احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن پر گوشے شائع ہوچکے ہیں۔

ایک فنکار کی حیثیت سے احمد ندیم قاسمی کی شخصیت ہمہ گیر ہے اور اس کا احاطہ کرنا بہت آسان نہیں ہے۔ بحیثیت تخلیقی فنکار ان کی سب سے پہلی اور سب سے مظبوط وابستگی انسان اور انسانی زندگی سے ہے۔ ان کے فنی اور تخلیقی زاویہ نظر میں جو عناصر شامل ہیں ان میں سماجی عدم مساوات کے خلاف قلم کی جد و جہد، غریبی، مفلسی اور کم مائیگی کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے تخلیقی کارگزاری، انسانی زندگی کے مثبت پہلوؤں کی عکاسی، تہذیبی قدروں کی پاسداری، مناظر فطرت سے لگاؤ، محبت و اخوت اور غیر طبقاتی سماج کے لیے فنکارانہ سروکار یہ سب مل کر احمد ندیم قاسمی کے تخلیقی رجحان کی تعمیر کرتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون 'میرا نظریہ فن' میں لکھتے ہیں کہ:

''فنکار کا محبوب انسان ہے اور جب تک انسان مضطرب اور بیقرار ہے فنکار کی آسودہ خاطری بددیانتی ہے''

زندگی کے آخری پڑاؤ تک احمد ندیم قاسمی نے اپنا تخلیقی عمل جاری رکھا اور اپنے فن کو اس کرۂ ارض پر رہنے والے انسانوں کے لیے وقف کردیا۔ شہرت دوام حاصل کرنے والا یہ عظیم فنکار 10 جولائی 2006 کو ابدی نیند سوگیا۔

■

Dr. Afshan Malik Azeem State 2, New Sir Sayyed Nagar, Aligarh - 202002
Mob.:95576654926

شہناز رحمن

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں عورت

اردو افسانہ نگاری کی روایت میں احمد ندیم قاسمی ایک ایسا نام ہے جس کے بغیر ترقی پسند تحریک کی تاریخ نامکمل سمجھی جائے گی۔ جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پریم چند کے بعد نئی نسل میں اگر کسی نے دیہی زندگی کو افسانے میں زندہ رکھا تو وہ احمد ندیم قاسمی ہیں۔ انھوں نے اتنی کثیر تعداد میں افسانے لکھے کہ انھیں زود نویس بھی کہا جانے لگا۔ لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ اب تک ان کے افسانوں کے موضوعات اور فکری و فنی گہرائیوں پر اس طرح تفصیلی گفتگو نہیں کی گئی جیسا کہ ان کے ہم عصروں یعنی کرشن چندر، منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی وغیرہ کے فن پر کی گئی ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مطالعے و تجزیے کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا جائے جس میں احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع، کرداروں کی نفسیات، زبان و بیان اور اسلوب میں کیے گئے تجربوں کا احاطہ کیا جا سکے۔ لیکن ایک مختصر مضمون میں ان تمام عناصر کا احاطہ کرنا مشکل ہے اس لیے اس مضمون میں ان کے مختلف النوع موضوعات میں کسی ایک موضوع تک گفتگو محدود رکھی جائے گی۔

ایسا نہیں ہے کہ احمد ندیم قاسمی کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہو کیوں کہ تلاش و جستجو کے بعد قمر رئیس کی کتاب میں ایک مضمون 'احمد ندیم قاسمی بحیثیت افسانہ نگار' عبادت بریلوی کی کتاب میں 'احمد ندیم قاسمی کے افسانے: برگ حنا' کے عنوان سے شامل مضمون میں اس مجموعے کے افسانوں کا خلاصہ، انوار احمد کی کتاب 'اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ' میں شامل احمد ندیم قاسمی، 'اردو افسانے کی تاریخ کا اہم کردار' کے عنوان سے ایک مضمون، اور وقار عظیم کی کتاب 'نیا افسانہ' میں، پروفیسر صادق کی کتاب میں دو چار صفحات میں افسانوں کے تذکرے، اسلوب احمد انصاری کا مضمون 'احمد ندیم قاسمی اور اردو افسانہ' اور افشاں ملک کی کتاب 'احمد ندیم قاسمی آثار و افکار' میں احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری پر گفتگوئیں موجود تو ہیں مگر ان سب کے مطالعے کے باوجود بعض چیزیں ایسی ہیں جو تشنہ رہ جاتی ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس کے مضمون سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے احمد ندیم قاسمی اور پریم چند کے درمیان مماثلتیں تلاش کی ہیں۔ انوار احمد نے تمام مجموعوں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ اور وقار عظیم نے بھی مجموعی طور پر ان کے موضوعات کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ جبکہ موضوعات کے ضمن میں بہت سے ایسے پہلو نکل آتے ہیں جو ان کے افسانوں میں موجود ہیں اور ان پر تفصیلی گفتگو بھی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہی مناظر کی عکاسی، شہری زندگی کے مسائل، معاشی نابرابری، طبقاتی جبر پر مبنی نظام کی خامیاں، انسان دوستی اور رشتوں کے اتار چڑھاؤ پر مبنی افسانے، فسادات کی افراتفری، کرداروں کی نفسیات سے متعلق افسانے اور عورتوں کے جنسی استحصال کے محرکات، عورتوں کے مختلف روپ وغیرہ موضوع قائم کر کے اس زمرے میں آنے والے افسانوں کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فنی گفتگو میں زبان و بیان کے مسائل پر طویل بحث کی جا سکتی ہے۔ مذکورہ بالا تمام مضامین اور کتابوں کے مطالعے کے دوران ایک نکتہ ذہن میں یہ آیا کہ احمد ندیم قاسمی نے عورت کے کردار کو ایک مختلف و منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ جو نہ تو منٹو کی طرح بالکل بے باک، اور نہ ہی بیدی کی طرح مصلحت شناس، اور نہ کرشن چندر کی طرح رومانی جذبات سے لبریز۔ بلکہ ایک الگ تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں نسائی حسن اپنے پورے خد و خال کے ساتھ موجود ہے لیکن وہ عورتیں قیمتی زیورات اور لباس فاخرہ میں ملبوس نہیں ہوتی ہیں بلکہ

غربت کے آسیبی گھیروں سے پریشان حال ہوتی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں حقیقت نگاری کا وہ رجحان غالب ہے جس سے انسانی مسائل کے حل کی تدبیریں سامنے آتی ہوں۔ جب وہ اپنے پہلے مجموعے 'چوپال' (جس میں سولہ افسانے شامل ہیں) کے افسانوں میں دیہی زندگی کی عکاسی رومان پرور فضاؤں میں کرتے ہیں تو ان کا مقصد یہ واضح کرنا ہوتا ہے کہ زندگی اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے باوجود ناقابل حل مسائل کی وجہ سے بدصورت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کے دیہاتوں میں موجود کسانوں اور مزدوروں کی محنت و مشقت کی زندگی کو پیش کیا ہے کہ وہ کس طرح خون پسینہ ایک کر کے غلہ پیدا کرتے ہیں۔ جو بڑی آسانی سے جاگیرداروں کے قبضے میں آجاتی ہے۔

احمد ندیم کے بیشتر افسانوں کے واقعات مناظر فطرت کی خوشگواری اور سرسبز و شاداب وادیوں میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ جن میں ایک عدد الہڑ اور حسین دوشیزہ ضرور موجود ہوتی ہے مگر جب وہ اپنے افسانوں میں عورت کے کردار کو پیش کرتے ہیں تو ان کا مقصد یہ واضح کرنا ہوتا ہے کہ عورت صنف نازک، سنوارنے اور سراہے جانے کے قابل ایک ہستی اور وفا کی دیوی ضرور ہے مگر حالات کا جبر اسے بھاری بوجھ اٹھانے، دھول مٹی، عیاری، مکاری اور چالبازی کے کیچڑ میں لت پت ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور بعض دفعہ اسے معاشرتی درندگی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی اس فنکاری کو ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی دلیل قرار دیتے ہوئے انیس ناگی لکھتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی کے بارے میں اہم بات یہ ہے کہ وہ ترقی پسند ادیب ہیں اس لیے وہ انسان کی تشریح اس کے مادی ماحول سے کرتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ریلسٹ افسانہ نویس ہیں، اس لیے معاشرتی حقائق کی ترجمانی کو افسانے کی بنیاد قرار دیتے ہیں''

(پاکستانی اردو ادب کی تاریخ، ڈاکٹر انیس ناگی، جمالیات، لاہور، 2004ء ص 198)

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں عورت کا ذکر بھی مادیت کے شکنجے میں قید ہوتا ہے۔ روحانی جذبے کے تحت یا اس کے حسن پر فریفتہ ہو کر جینے مرنے کی قسمیں اور وعدے لے کر ان عورتوں کو کوئی اپناتا نہیں بلکہ سب وقتی ضرورت اور ہوس کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ اس ضمن میں 'سفید گھوڑا' کی بلقیس خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس

احمد ندیم قاسمی نے عورت کے کردار کو ایک مختلف و منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔جو نہ تو منٹو کی طرح بالکل بے باک، اور نہ ہی بیدی کی طرح مصلحت شناس، اور نہ کرشن چندر کی طرح رومانی جذبات سے لبریز۔ بلکہ ایک الگ تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں نسائی حسن اپنے پورے خد و خال کے ساتھ موجود ہے لیکن وہ عورتیں قیمتی زیورات اور لباس فاخرہ میں ملبوس نہیں ہوتی ہیں بلکہ غربت کے آسیبی گھیروں سے پریشان حال ہوتی ہیں۔

افسانے میں ایک عورت اپنی بیٹی کو خود اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنی عصمت کا سودا کرے۔ افسانے کی وہ سطریں ملاحظہ ہوں جس میں افسانے کا واحد متکلم کہتا ہے۔

''میں نے بڑا ظلم کیا تھا کہ الیاس کے کمرے میں اس لڑکی کے داخل ہوتے ہی اسے رخصت نہ کر دیا تھا۔ الیاس یقیناً برا مانتا مگر وہ میری نیت پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً میری بات مان لیتا اور ایک معصوم لڑکی ہمیشہ کے لیے تباہ ہونے سے بچ جاتی۔ وہ لڑکی جوان سب لڑکیوں کی نمائندہ تھی جن کے والدین اپنی بیٹیوں کے مستقبل کی خاطر اپنے آپ کو بیچ ڈالتے ہیں مگر جب یہ ذریعہ بھی کارگر نہیں ہوتا تو اپنے مستقبل کی خاطر بیٹیوں کو بیچ ڈالتے ہیں۔''

(مجموعہ احمد ندیم قاسمی، پبلیشر نیاز احمد، سنگ میل پبلیشرز، لاہور، 2008، ص 332)

'والدین خود کو بیچ دیتے ہیں یا بیٹیاں بیچ ڈالتے ہیں' دونوں ہی صورتیں نام نہاد شرفاء و امراء کی شبیہ پر شدید طنز کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ یوں تو بظاہر خود کو بیچنے والے خطاوار نظر آتے ہیں لیکن مصنف کا مدعا بین السطور میں پوشیدہ ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے کہ اصل مجرم وہ معاشرہ ہے جس نے اپنے سے کمتر لوگوں، مزدوروں اور غریبوں کی آمدنی کے تمام ذرائع مسدود کر رکھے ہیں۔ افلاس زدہ زندگی سے تنگ آ کر ان کے گھروں کی عورتیں ایسے اقدام کرنے پر مجبور ہیں جس سے ان کی زندگی کچھ دنوں کے لیے خوشحال تو ہو جاتی ہے مگر اندر ہی اندر وہ روز مرتی ہیں۔ اور ان کی دنیا جہنم سے بدتر ہو جاتی ہے۔

بے ضمیر شرفاء انھیں اپنی عیاشیوں اور جنسی ہوس کے لیے استعمال کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس افسانے کے آخر میں مصنف یہ راز فاش کرتا ہے کہ وہ عورت کوئی اور نہیں بلقیس کی ماں ہے جو دلالہ کے طور پر بلقیس کو شہر بہ شہر لے جاتی ہے۔ جب وہ بلقیس کو لے کر الیاس کے کمرے میں داخل ہوتی ہے تو یہ مژدہ سناتے ہوئے کہتی ہے کہ ''ابھی نئی نویلی ہے''۔ تاکہ گاہکوں کی اشتہاء اور بڑھ جائے۔ جبکہ نہ وہ نئی نویلی ہے اور نہ ہی اس کا شرمانا لجانا فطری ہے۔ بلکہ اسے شرمانے، لجانے اور الہڑ پن دکھانے کی پریکٹس کرائی گئی ہے۔ خواہ مخواہ دلالہ اسے جھڑکتے ہوئے کہتی ہے کہ جس بات کے لیے اتنا سمجھایا تھا تو وہی کر رہی ہے۔ اس سے بھی زیادہ تلخ لمحہ اس وقت آتا ہے جب الیاس، ماں اور بیٹی دونوں کے درمیان بیٹھ کر ایک ساتھ دونوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کچھ دنوں تک لاہور میں رہنے کے بعد جب گاہک ختم ہو جاتے ہیں تو وہ ماں اور بیٹی کراچی چلی جاتی ہیں۔ کیوں کہ جنس کے بھوکے گاہک ایک عورت کے ساتھ رات گزارنے کے بعد دوسری بار نئی عورت کا تقاضا کرنے لگتے ہیں ایسی صورت میں زیادہ دنوں تک ایک ہی شہر میں قیام کرنے سے دھندا ختم ہونے اور بھوکے رہنے کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اس لیے وہ شہر بدل دیتی ہیں۔ پھر نئے شہر میں نئے نام اور نئے گاہک تلاش کر لیتی ہیں۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی یہ کہ بعض دفعہ کھوئے ہوئے اور بھولے بسرے لوگ دوبارہ مل جاتے ہیں۔

اس میں مصنف کہیں بھی یہ واضح نہیں ہونے دیتا کہ یہ جسم فروشی پر کیوں کر آمادہ ہوئیں اور نہ ہی کوئی کردار اس بات پر تبصرہ کرتا ہے۔ اس افسانہ 'سفید گھوڑا' میں وہ خامی پیدا نہیں ہونے پائی ہے جو ان کے ابتدائی مجموعے 'چوپال' کے ایک افسانہ 'وہ جا چکی ہے' میں تھی جس میں مرکزی کردار کی زبان سے اس کی غربت کا رونا رلا دیتے ہیں۔ جو کہ بالکل اضافی معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ ان کے رہن سہن سے ان کی خستہ حالی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ افسانہ 'سفید گھوڑا' اس خامی سے مبرا ہے۔ افسانے کی آخری سطروں سے ان کی بے بسی قاری پر واضح ہوتی ہے۔

''عورت ایک دم بولنے لگی۔ ''ذرا جلدی سے جاؤ مشتاق بھائی۔ کچھ تکے کباب بھجوا دو۔ اور دیکھو کباب ذرا تیز مرچوں والے ہوں جو مجھے بالکل رلا دیں۔''

مشتاق چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ عورت کبابوں کے آنے سے پہلے ہی رو رہی ہے۔ اس نے لپک کر چٹنی چڑھا دی اور پلٹ کر میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔ وہ

اپنے بھیگے ہوئے گال میرے پاؤں سے رگڑنے لگی اور فریاد کرنے لگی۔ میرا پردہ رکھ لیجیے صاحب! میرا اور میری بیٹی کا پردہ خدا اور آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں کیا کروں صاحب! میری ایک ہی بیٹی ہے مگر سب نئی بیٹی مانگتے ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو کیسے بدلوں صاحب! اسی لیے شہر بدل لیتی ہوں... مجھ نگوڑی کو کیا پتہ تھا کہ آپ لوگ بھی شہر بدل لیتے ہیں۔ خدا کے لیے صاحب، خدا کے لیے میرا اور میری بیٹی کا پردہ رکھ لیجیے ورنہ کوئی ہمیں دو پیسے کو بھی نہیں پوچھے گا۔''

(مجموعہ احمد ندیم قاسمی، پبلشر نیاز احمد، سنگ میل پبلشرز، لاہور، 2008)

احمد ندیم قاسمی نے عورت کے جسمانی استحصال کے ساتھ ساتھ جذباتی اور روحانی استحصال کو بھی موضوع بنایا ہے۔ توہم پرستی ہمارے معاشرے میں پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے۔ خصوصاً عورتیں مزاروں کی بڑی قائل ہوتی ہیں، پیروں کے مزاروں پر تکیہ کرنے والے ڈھونگیوں کی کرامات پر انھیں بڑا بھروسہ ہوتا ہے۔ اس لیے بنا سوچے سمجھے ان کی باتوں پر بھروسہ کر لیتی ہیں اور حکم کی تعمیل کرنے لگتی ہیں۔ افسانہ 'بین' کی رانو اور اس کے والدین بھی اسی نوعیت کے توہم پرست افراد ہیں۔ اس افسانے میں واحد حاضر کی زبانی یہ معلوم ہوتا ہے کہ رانو ایک بہت ہی معصوم، شریف اور فرمانبردار لڑکی ہے۔ بڑے ہی ناز و نعم سے اس کی پرورش کی جاتی ہے۔ جب اس کی شادی طے ہوتی ہے تو مزار کے ایک پیر کو یہ خوشخبری دی جاتی ہے۔ دعائیں دینے کے بجائے خوبصورت رانو کے لیے اس کی نیت خراب ہو جاتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ مجھے خواب میں یہ الہام ہوا ہے کہ رانو سے خدمت لی جائے اس لیے کچھ دنوں کے لیے اس کے والدین رانو کو مزار کے حضرت شاہ سائیں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر حضرت شاہ اپنی جنسی ہوس پوری کر کے مزار چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس حادثے کی وجہ سے رانو ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے۔ جب اس کے والدین اسے لینے آتے ہیں تو انھیں دیکھتے ہی وہ غضب ناک ہو جاتی ہے تب حضرت شاہ کا خادم انھیں بتاتا ہے کہ اچانک کسی جن بھوت نے اس پر قبضہ کر لیا ہے اس لیے یہ چیخ و پکار کر رہی ہے۔ جن اتارنے کے لیے حضرت شاہ خاص وظیفہ کر رہے ہیں اس لیے نہیں مل سکتے اور حکم ہوا ہے کہ رانو کو ابھی درگاہ شریف کی نگرانی میں رہنے دیا جائے، جب جن اتر جائے گا تو آپ کی امانت پہنچا دی جائے گی۔ لیکن رانو کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر کوئی جن نہیں بلکہ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی ہے۔

''اب تم جاؤ' ہمارے سروں پر تمھاری آواز تھی اور ہم نے سر اٹھا کر دیکھا تھا کہ تمھاری آنکھیں تالابوں کی طرح بھری ہوئیں تھیں۔ اب تم جاؤ میرے بابا۔ جاؤ میری اماں۔ اب تم جاؤ۔ مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دست مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہوگا۔ فیصلہ ہو جائے گا تو میں سیدھی تمھارے پاس پہنچوں گی۔''

(مجموعہ احمد ندیم قاسمی، پبلشر نیاز احمد، سنگ میل پبلشرز، لاہور، 2008، ص 385)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بعد بھی وہ حضرت سائیں کو خود سے سزا دینے کے حق میں نہیں ہے بلکہ کسی غیبی فیصلے کے انتظار میں ہے۔ اس کے والدین اس کی حرکتوں سے متحیر ہو کر کوئی فیصلہ لینے کے قابل ہی نہیں رہ جاتے۔ انھیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر لمحہ تلاوت کرنے والی لڑکی کے پاس جن بھوت کیسے آسکتے ہیں، تب حضرت شاہ کا خادم کہتا ہے کہ کوئی کافر جن ہے جو قبضے میں نہیں آرہا ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ جس رات یہ واقعہ ہوا تھا اس نے رانو کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ'' دست مبارک جب نکلے گا تب نکلے گا۔ لیکن اگر تم ایک قدم بھی آگے آئے تو میں ان پتھروں سے تمھارا ناس کر دوں گی۔''

پورے افسانے میں راوی (حاضر راوی جو ماں کا کردار بھی نبھا رہی ہے) کی زبان سے کہیں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ حضرت شاہ کے ذریعے رانو کی عصمت دری ہوئی ہے اور نہ ہی کسی عمل کا کوئی ایسا منظر بیان کیا گیا ہے جس سے فحش نگاری کی طرف دھیان جائے۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس نے بے ہوشی اور نیم دیوانگی کی حالت میں بالواسطہ فقروں کے ذریعے ایسی فضا تیار کی ہے کہ قاری کو اشارے مل جائیں۔ اسے احمد ندیم کے فنی گرفت کی مضبوطی ہی کہنا چاہیے کہ انھوں نے گہرے مشاہدے اور عمیق تجربے کے ذریعے رمزیت کو باقی رکھا جس کی وجہ سے ان کے اوپر جنس نگار یا فحش نگار جیسے لیبل چسپاں نہیں کیے گئے۔ اس ضمن میں اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

''جنس سے ان کی دلچسپی معمول کے مطابق ہے۔ اس میں مریضانہ لذت اندوزی نہیں۔ ان کے یہاں طنز کے چھینٹے بھی جگہ جگہ ملتے ہیں مگر یہ طنز ایسا نہیں جو مردم آزاری کی سرحدوں کو چھو لے۔ ان کے نقطہ نظر میں اعتدال اور سلامت روی اور ان کے لہجے میں نرمی شائستگی اور حلاوت ملتی ہے جو برسوں کے عمل صیقل اور کام و دہن کی ہر آزمائش سے گزرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔''

(مجموعہ طلوع و غروب، احمد ندیم قاسمی گلوب پبلشرز، لاہور 1986 فلیپ کے اوپر)

اسلوب احمد کی اس رائے کی معنویت افسانہ 'بین' 'بدنام' 'نامرد' وغیرہ کے مطالعے سے سامنے آجاتی ہے۔ 'بین' میں پیش کیے گئے واقعہ سے اس حقیقت کا پردہ فاش ہوتا ہے کہ جنوں بھوتوں سے چھٹکارا دلانے کے نام پر مزاروں پر کیسے کیسے جرائم ہوتے ہیں۔ جس کی زد میں آکر رانو جیسی بے شمار دوشیزائیں عصمت اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ احمد ندیم کا یہ افسانہ آج کے موڈرن معاشرے میں بڑی معنویت کا حامل نظر آتا ہے۔ بڑے بڑے موڈرن خاندان کی عورتیں اب بھی اس توہم پرستی کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکیں ہیں اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود دھوکے کا شکار ہو جاتی ہیں۔ توہم پرستی اور جنسی الجھنوں پر مبنی افسانہ 'ماسی گل بانو' بھی بہت دلچسپ اور اس نفسیاتی حقیقت کا عکاس ہے کہ جب صحیح وقت پر لڑکیوں کی شادی نہیں ہو پاتی اور ان کی جنسی خواہشات تشنہ رہ جاتی ہیں تو وہ ایک طرح کے تشنج کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جسے کم پڑھے لکھے لوگ جن، آسیب کے اثرات سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔

عورتوں کے جنسی استحصال کی وہ صورت بھی موجود ہے جب خود ایک شوہر اپنی بیوی سے اصرار کرتا ہے کہ وہ غیر مرد کے ساتھ ایک رات گزار لے۔ اس کی بہترین مثال ''رئیس خانہ'' کی مریاں ہے جسے اپنے شوہر فضلو کے کہنے پر غیر ملکی صاحب کے پاس جانا پڑتا ہے۔ لیکن فضلو کی غربت اسے اس بات پر مجبور کرتی ہے اور غیر ملکی یوسف کی نیک نیتی کے بارے میں ان عورتوں کی گواہی

جو اس کے ساتھ سو روپیوں کے عوض راتیں گزار چکی ہوتی ہیں۔ان کا یہ کہنا کہ وہ ہاتھ تک نہیں لگاتا صرف دیکھنے کے سو روپے دیتا ہے۔لیکن بعد میں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ یوسف کی عیاری تھی وہ ایک سال پہلے ہی مریاں کے حسن پر فریفتہ ہو گیا تھا اسی لیے دوسرے سال کی چھٹیاں بھی وادی سون میں گزارنے آیا تھا۔اور اپنے جسم کی آگ بجھانے کے لیے فضلو کے سامنے شرافت کا ڈھونگ کر کے اسے اپنے قبیح فعل میں ساتھ کر لیتا ہے۔فضلو اس کی چالاکیوں کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتا اور مریاں کے منع کرنے ،رونے دھونے اور گالی گلوج کرنے کے باوجود اسے یوسف کے پاس رات میں جانے پر مجبور کرتا ہے۔مریاں شرط رکھتی ہے کہ اگر اس نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو میں تیرے پاس واپس نہیں آؤں گی،اس کے جواب میں فضلو کہتا ہے کہ خدا کی قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ وہ تمھیں صرف دیکھے گا۔لیکن میری بھی ایک شرط ہے اگر اس نے نہیں چھوا تو تم بھی وعدہ کرو کہ اس کے پاس جاتی رہو گی۔اس افسانے میں احمد ندیم قاسمی نے غربت کی لائی ہوئی ان دردناک کیفیات کا بیان کیا ہے جو جسمانی کے بجائے جذباتی ہیں۔مریاں کے درد کے مقابلے مزدوری اور دھوپ میں جھلستی ہوئی عورتوں کا دکھ پھر بھی قابل برداشت ہوتا ہے۔کیوں کہ مریاں جسم کے ساتھ ساتھ روحانی طور پر زخمی ہو جاتی ہے۔اس کی گفتگو سے کچھ حد تک اس کے درد و کرب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

افسانے میں احمد ندیم قاسمی نے غربت کی لائی ہوئی ان درد ناک کیفیات کا بیان کیا ہے جو جسمانی کے بجائے جذباتی ہیں.مریاں کے درد کے مقابلے مزدوری اوردھوپ میں جھلستی ہوئی عورتوں کا دکھ پھر بھی قابل برداشت ہوتا ہے.کیوں کہ مریاں جسم کے ساتھ ساتھ روحانی طور پر زخمی ہو جاتی ہے.

’’...مجھ پر یوں جھپٹا جیسے کتا گوشت پر جھپٹتا ہے،کرائے کی موٹر کا اس نے رات ہی انتظام کر لیا تھا اور وہ ابھی ابھی مجھے آخری بار جھنجھوڑ کر موٹر میں بیٹھ کر لاہور چلا گیا ہے اور تمھیں بخششیں دے گیا ہے سو روپے کی اور ایک ایسی مریاں کی جو اب اس کمرے میں نہیں گھسے گی۔وہ نیچے وادی میں اتر جائے گی،وہ ادھر میدانوں میں چلی جائے گی،اور جب بھوک کے مارے اس کا پیٹ زخم بن جائے گا تو کپڑے اتار کر راستے میں بیٹھ جائے گی۔ننگے مردوں کو لوگ پتھر مارتے ہیں پر ننگی عورتوں کو بستر دیتے ہیں اور روٹی کھلاتے ہیں۔تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔‘‘

(سناٹا،احمد ندیم قاسمی،اساطیر لاہور 1988 ص 74)

اپنے شوہر کی بے روزگاری اور معاشی الجھنوں کی وجہ سے ’بدنام‘ کی نوراں بھی بدکاری کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔محلے کے نوجوان اس کا مذاق اڑاتے ہیں پھبتیاں کستے ہیں۔لیکن افسانے کا واحد متکلم راوی کو نوراں کے بارے میں نازیبا جملے سن کر تکلیف ہوتی ہے اور وہ بچپن کی معصوم و شریف نوراں کو جو بالکل بکائن کی طرح نازک تھی یاد کر کے بہت افسوس کرتا ہے۔پھر اس کی معاشی بدحالی کا اندازہ جب ہو جاتا ہے تو واحد متکلم اس کی ساس کو روز ایک روپیہ دے کر اسے عصمت فروشی سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔چند دنوں بعد وہی نوجوان چہ می گوئیاں کرنے لگتے ہیں کہ اب تو سرے سے ہی غائب ہو گئی مسجد کی محراب چومنے بھی نہیں آتی۔کیا معلوم اب کسے چومنے میں مصروف ہوگی۔جب واحد متکلم اس سے ملنے جاتا ہے تو زار و قطار رونے لگتی اور کہتی ہے چلے جاؤ یہاں سے ورنہ بدنام ہو جاؤ گے۔وہ غربت کا رونا رونے کے بجائے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتی ہے۔پوچھنے پر صرف اتنا کہتی ہے کہ تمھارے جسم سے بکائن کے پھولوں کی خوشبو آ رہی ہے۔افسانہ نگار نے اس لمحے کی عکاسی میں بڑی فنکاری سے کام لیا جب راوی نوراں سے ملنے جاتا ہے۔ایک مصور کی طرح اس منظر کی تصویر اتار دی ہے جس سے نوراں کی ساری کیفیت و مجبوریاں قاری پر اور متکلم راوی پر عیاں ہو جاتی ہیں۔کرشن چندر اسی لیے احمد ندیم قاسمی کے قائل ہو کر لکھتے ہیں

’’احمد ندیم قاسمی خالی خولی فوٹو گرافی سے کام نہیں لیتے بلکہ ایک چابکدست فنکار کی طرح اس مقامی رنگ کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنا کر اس کے تانے بانے پر دیہاتی زندگی کے جاندار مرقعے تیار کرتے ہیں یہ ایسے مرقعے ہیں جن میں دیہاتی زندگی کو مختلف النوع پہلوؤں سے دیکھا گیا ہے۔دیہاتیوں کی سادہ لوحی اور ظالمانہ رسوم پرستی،محبت اور پیٹ کی پیکار،بھوک اور عزت کا تضاد،مردوں کی بربریت اور عورتوں کی غلامانہ ذہنیت،کو ہستانی دوشیزہ کا مثالی حسن،اور پھر اس مثالی حسن کی فروخت چند روپہلی ٹکیوں کے عوض،وہ روپہلی ٹکیاں جس سے لگان ادا ہو سکتا ہے زمین رہن ہونے سے بچ سکتی ہے اور زندگی اپنی تمام تر صعوبتوں اور مسرتوں کے ساتھ جاری رہ سکتی ہے۔کشمکش حیات اپنی بنیادی سچائی کے ساتھ ان افسانوں میں جلوہ گر ہے۔‘‘

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کو کسی تحریک یا مخصوص رجحان سے وابستہ کرنے کے بجائے مختلف زاویوں سے پڑھ کر تعین قدر کرنے کی ضرورت ھے جس طرح ان کے افسانوں میں عورت کی کردار نگاری پر موضوع قائم کر کے دلچسپ عناصر کی نشان دھی کی گئی ھے اسی طرح دوسرے موضوعات کو بھی تلاش کیا جا سکتا ھے.غربت اور بھوک سے پیدا ہونے والی کشمکش اور جسم فروشی پر آمادہ کرنے والے محرکات کواحمد ندیم قاسمی نے ’طلائی مہر‘میں بھی اجاگر کیا ھے.

(دیباچہ،کرشن چندر،بگولے،احمد ندیم،مکتبہ لاہور 1941،ص 9)

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کو کسی تحریک یا مخصوص رجحان سے وابستہ کرنے کے بجائے مختلف زاویوں سے پڑھ کر تعین قدر کرنے کی ضرورت ہے جس طرح ان کے افسانوں میں عورت کی کردار نگاری پر موضوع قائم کر کے دلچسپ عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے اسی طرح دوسرے موضوعات کو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔غربت اور بھوک سے پیدا ہونے والی کشمکش اور جسم فروشی پر آمادہ کرنے والے محرکات کو احمد ندیم قاسمی نے ’طلائی مہر‘ میں بھی اجاگر کیا ہے۔افسانہ ’طلوع و غروب‘ کی نرگس محبت میں دھوکہ کھانے کی وجہ سے مختلف لڑکوں کے ہاتھوں کھلونا بنتی ہے۔شہر سے آیا ہوا غضنفر اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر حسین خواب دکھاتا ہے اور جب مرمریں بانہوں سے لطف اندوز ہو لیتا ہے تو اسے جھڑک کر پھر شہر واپس چلا جاتا ہے۔اس دھوکے کی وجہ سے نرگس کے جذبات مجروح ہو جاتے ہیں۔اور وہ پرانی وفاداری کو ترک کر کے ہر روز ایک نئے شخص سے تعلق استوار کرنے لگتی ہے۔

■

Shahnaz Rahman, Dept. of Urdu, AMU, Aligarh- 202002 (UP)

رضوان بن علاء الدین

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات

احمد ندیم قاسمی ان افسانہ نگاروں میں نمایاں ہیں جنھوں نے دیہی معاشرت کو اپنے افسانوں کا محور ومرکز بنایا اور دیہی کرداروں کو مرکزیت عطا کرکے ان کے جذبات، احساسات اور زندگی کے تضادات کی بہترین عکاسی کی۔ وہ دیہی ماحول اور مناظر کے بہترین مصور تھے۔ اس دیہات نگاری نے انھیں امتیاز وانفراد بھی عطا کیا۔

انھوں نے اپنے افسانوں کی اساس گاؤں کے پس منظر میں انسانی زندگی کے ان المیوں پر رکھی ہے جن کا تعلق معاشی ناہمواریوں سے ہے۔ سید وقار عظیم ان کی دیہات نگاری کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فطرت نے انھیں دیہاتی زندگی کا مصور اور ترجمان بنا کر بھیجا ہے۔ اور انھیں فطرت کے سونپے ہوئے کام اور منصب پر قائم رہنا چاہیے۔ یہیں آکر ان کا تخیل، ان کا شاعرانہ طرز اپنی پوری رعنائی اختیار کرتا ہے۔[1]

احمد ندیم کے افسانوی کردار غریب، سادہ لوح، ملنسار، خوش اخلاق، مہمان نواز اور معصوم ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر اس ماحول کی عکاسی کی ہے جس کی انھیں پوری واقفیت ہے اور جس سے ان کا براہ راست تعلق ہے۔

افسانہ نگار اس فضا میں سانس لینے والے زمینداروں، کسانوں، کھیت، کھلیانوں، ان کے کنوؤں اور چشموں اور جانوروں تک سے ایسی دلچسپی اور ہمدردی رکھتا ہے جو پریم چند کے علاوہ کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتی۔ یہی ان افسانوں کی کامیابی وکامرانی کا راز ہے اور حقیقت سے قریب تر ہونا ان کے گہرے مشاہدے کی دلیل ہے۔

ان کے افسانوں میں دیہات کے معصوم اور سادہ لوح لوگ اپنی غیر مصنوعی حرکات وسکنات کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں اُپلے تھوپنے والی، کہیں کہیں بھیڑ بکریاں چرانے والے نوجوان بھی ہیں۔ دیہاتی افراد کی محبت، رسم ورواج، قتل وغارت، توہم پرستی، تاریک اور کریہہ پہلوؤں کو بے نقاب کرنا ان کا مقصد حیات تھا۔ 'طلوع وغروب' میں لکھتے ہیں:

''میں نے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے آہوں کے دھوئیں اٹھتے دیکھے ہیں۔ میں نے موت کی چڑیلوں کو تیرہ نصیب مریضوں کے سرہانے، دانت کچکچاتے اور انگلیاں چٹخاتے دیکھا ہے۔ میں نے زندگی کی نعش کو گلتے سڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے گرد آلود پلکوں میں اٹکے ہوئے دھندلے آنسوؤں کو......غریبوں کی روتی اور بلکتی ہوئی اولاد کو نہایت قریب سے دیکھا ہے جس کی دھجیوں سے بدبو آتی ہے۔''[2]

قاسمی کے افسانے دیہاتی زندگی کے ہر پہلو کو بے نقاب کرتے ہوئے صداقت پر مبنی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ غربت، بھوک، توہم پرستی، بیماری، ناخواندگی، بے روزگاری، نچلے طبقوں کا استحصال، امیروں کی عیاری، آسودہ اور باوسائل افراد کا جارحانہ اور جابرانہ رویہ اجڑے گھروں اور ان کے باسیوں کی مفلوک الحالی اور خانہ ویرانی یہ تمام مسائل بھی دیہی باشندوں کے ہیں۔ قاسمی کا فطری میلان دیہی زندگی کی طرف زیادہ تھا۔ انھوں نے دیہاتی بود وباش کو اپنی تحریروں میں پیش کرکے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے قاسمی نے اپنے افسانوں میں مقامی طرز معاشرت کی عکاسی اتنے دلکش اور دلچسپ انداز سے کی ہے کہ مختلف ادبی نظریات سے تعلق رکھنے والے نقاد بھی ان کی تعریف وتوصیف بیان کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ ڈاکٹر سہیل احمد لکھتے ہیں:

''قاسمی صاحب کی ابتدائی کہانیاں اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں ہمارے شعور میں روشنیاں سی بکھیرتی ہیں۔ دیہات کی پگڈنڈیوں، ٹیلوں پر چاند کا غبار، ریت اور بگولے، اونٹ اور ساربان، اس ماحول میں انسانی معاشرت کے تضادات، جوانی کے جذبے، محبتوں کے کھیل، پھر ان

رومانی فضاؤں پر اچانک مایوسیوں کی یلغار، جنگ اور طبقاتی تضاد کے یہ تمام عناصر جناب قاسمی صاحب کی جذباتی اور شاعرانہ نثر میں ڈھل کر جی کو لبھاتے تھے۔ قاسمی صاحب کے ہاں دیہات کا صرف رومانی روپ نہیں تھا۔ وہ اس فردوس میں جلتے ہوئے گھر دیکھتے تھے۔ ان کی واقعیت نگاری اور قوت مشاہدہ اثر انگیز تھی۔ انھوں نے پنجاب کے ایک خاص علاقائی ماحول کو زبان دی۔ اس علاقے کے کرداروں کو اردو ادب کا حصہ بنایا۔ پریم چند سے شروع ہونے والی دیہات نگاری کو نئی نہج پر ڈالا۔ ان کی اس حیثیت سے میرے جیسے لوگوں کو بھی جن کی ترجیحات مختلف ہیں، انکار نہیں۔''[3]

قاسمی کے افسانوں میں دیہی زندگی کی تلخیاں کوٹ کوٹ کر بھری پڑی ہیں۔ لیکن شہر میں سکونت کے لحاظ سے جن حالات اور واقعات نے انھیں متاثر کیا ہے اس کا بھی عکس ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ قاسمی کے افسانوں میں اکثر و بیشتر شہر کی عورت بے وفا اور خلوص ومحبت سے عاری ہے۔ ان کے افسانوں میں شہری زندگی پر مشتمل افسانے غربت، فریب، جھوٹی شان وشوکت، ریا کاری اور تصنع سے بھرپور ہیں۔ قاسمی اپنے افسانوں میں شہروں کی مصنوعی زندگی، بے وفائی، خود غرضی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ 'گرداب' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''معاً مجھے خیال آیا کہ دیہات کی معصوم فضاؤں سے نکل کر جدید تہذیب وتمدن کے ان گہر پاروں کو بھی دیکھوں جو گڑ گڑاتی ہوئی مشینوں اور گاڑھے بدبودار دھوئیں میں لپٹے ہوئے ابھرے اور پھیلے جارہے ہیں...... یہاں کے مسائل الگ ہیں۔ ماحول الگ تھا۔ لوگوں کی ذہنیت الگ تھی، یہاں پتلونوں کی جمی ہوئی لکیروں اور بالوں کے متناسب لہروں کے تذکرے تھے، تصنع تھا، تکلف تھا، ریا کاری تھی اور ان کے مصفا چہروں کے پیچھے سماج کا پلیگ تعفن پھیلا رہا تھا اور لباس حریر کے نیچے زخمی روحیں بلک رہی تھیں۔''[4]

قاسمی نے جہاں دیہاتی افراد کی سادہ لوحی، معصومیت اور سادگی کو پیش کیا ہے۔ وہیں شہری افراد کی مصنوعی زندگی، اور جدید تہذیب وتمدن کو اپنے افسانوں میں بدرجۂ اتم موضوع بنایا ہے۔ قاسمی شہری کہانیوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شہری متوسط زندگی کے بارے میں بھی میں نے کہانیاں لکھیں اور بعض اونچے طبقے کے دوست تھے تو ان کے ساتھ دو تین باریوں کہیے کہ جو نام نہاد اعلیٰ سطح کی سوسائٹی تھی، اس میں بھی شرکت کی۔ اس کا عکس میرے افسانوں میں موجود ہے۔''[5]

افسانہ 'کفارہ' کا پیرو اپنا آبائی مکان فروخت کر کے سفید بیلوں کی جوڑی اور ایک ہل خریدتا ہے۔ اور یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی بنجر زمین کو زیر کاشت لائیں۔ لیکن جیسے ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ پیرو اپنی زمین پر ہل چلا رہا ہے۔ ہل چلانے کی پاداش میں پیرو کو پولیس بری طرح لہولہان کردیتی ہے۔ اور دونوں بیل بھی ضبط کر لیتی ہے۔

قاسمی نے کسانوں کی قابل رحم زندگی کو نہایت جرأت مندانہ انداز میں بیان کیا ہے. وہ غریب طبقے سے محبت اور ہمدردی رکھتے ہیں متوسط طبقے کی سفید پوشی اور امیر طبقے کی منافقت کو واضح کردیتے ہیں. وہ اپنے افسانوں کا مرکزی کردار دیہاتوں کے مفلس افراد کو بناتے ہیں جن کو شدید محنت و مشقت کے باوجود دو وقت کی روٹی بھی ٹھیک سے میسر نہیں ہوتی ہے.

اسی طرح افسانہ ''اصول کی بات'' کا عبداللہ کسی جرم میں اپنے گھر اور کھیت سے بے دخل کردیا جاتا ہے۔ تو وہ کچھ دنوں کے بعد اپنی بیوی اور جوان بیٹی کے ساتھ جاگیردار کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ جب عبد اللہ کو بطور مزارع رکھنے کی امید نظر آتی ہے تو وہ سکون کا سانس لیتا ہے۔ لیکن یہ ہو نہیں پاتا ہے تھوڑی دیر کے بعد زمین دار کا دلال دروازے پر آکر دستک دیتا ہے۔

''وہ ہنگلی والی زمین سرکار نے تمھارے نام کردی تھی منشی سے بھی کہہ دیا تھا اور یہ بھی انتظام کردیا تھا کہ صبح کو تم بیلوں کی ایک جوڑی بھی پسند کرلو مگر اب معاملہ کچھ بگڑ گیا ہے۔ تم سے کچھ ہوسکتا ہے تو کرلو۔ میں تمھیں لے چلتا ہوں ڈیوڑھی میں۔ یوں کرو کہ تمھاری بیٹی ہے نا ماکھاں، اس کو سمجھا دو۔ کیا سمجھا دوں؟ وہ کیا کرے گی؟ عبداللہ نے پوچھا اور سائیں بولا:

ارے چاچا! اس کو سمجھا دونا۔ اس سے کہہ دو نا مان جائے آدھی رات ہونے کو آئی ہے اور وہ اب تک نہیں مانی ہے۔ نہ وہ مانتی ہے۔ نہ اس کی ماں اسے مناتی ہے۔ اب اگر تم بھی نہ منا سکو تو سرکار کہتے ہیں کہ اپنی راہ لو۔ اصول کی بات ہے۔''[6]

اس افسانے میں جاگیردار ایک غریب اور تنگ دست انسان کی عزت نفس کو مجروح کرتا ہے۔ اور عنفوان شباب کے سادہ حسن کو تاراج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جاگیردار کی بے دخلی محکومی اور عیاریوں کے باوجود عبداللہ اپنی بیوی اور بیٹی کی عزت بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ جاگیردار اپنی گھٹیا اور نازیبا خواہش پوری نہ ہونے پر اس کی سزا کھیت کھلیان کی تباہی و بربادی یا علاقے سے بے دخل کرنے کی صورت میں دیتا ہے۔

سماجی حقیقت نگاری، غریبوں کے مسائل اور مشکلات، ظلم و نا انصافی، احساس ذلت، عزت نفس کو بری طرح جھنجھوڑنا اور مجروح کرنا جاگیردار اور باوسائل طبقے کا ظلم وجبر وغیرہ قاسمی کے افسانوں میں جا بہ جا موجود ہے۔ قاسمی نے طبقاتی تضاد کو حقیقی رنگ میں ابھارا ہے۔ جہاں زمیندار بلند و با اثر ہے وہیں مزارع کو کیڑوں اور مکوڑوں اور جانوروں کی طرح مسلا جاتا ہے اور معاشرے میں اس کو کوئی حیثیت نہیں دی جاتی ہے۔

بقول انور سدید:

''زمیندار جب ظلم کرتا ہے تو اس کی غصیلی آواز ہفت آسمان تک جاتی ہے اور مزارع جب ظلم سہتا ہے تو اس کی صدائے درد سے بھی آسمان پھٹنے لگتا ہے۔''[7]

اسی طرح افسانہ ''بے گناہ'' کا رحمان یتیم اور مسکین بے روزگار نوجوان تھا۔ جیسے ہی شفقت پدری سے محروم ہوا۔ ذیل دار کے ظلم وستم نے مرتے دم تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ غریب اور مفلوک الحال رحمو دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ وہ زمین کا لگان کس طرح ادا کرسکتا تھا۔ ذیل دار رحمو کے گھر آکر کہتا ہے:

''میں تم جیسے بھکاریوں کے کان کھینچ لیا کرتا ہوں۔ پانچ روپے ابھی ابھی پیدا کرو ورنہ میں گاؤں کے سارے چوکیداروں کو بلوا کر تمھارا بھرکس نکلوا دوں گا۔''[8]

چند دن مہلت مانگنے کی پاداش میں اسے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کے کھلیان کو بری طرح تہس نہس کردیا جاتا ہے۔ اور اس کے گھر کو آگ کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جیل میں ہی اپنا دن گزارتے گزارتے رحمو اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔ جب تک زندہ رہا ذیل دار کا ظلم وستم سہتا رہا۔ ذیل دار کے اپنے دشمنوں کے متعلق جذبات ایسے خطرناک اور زہر آلود ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

قاسمی نے کسانوں کی قابل رحم زندگی کو نہایت جرأت مندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ غریب طبقے سے محبت اور ہمدردی رکھتے ہیں متوسط طبقے کی سفید پوشی اور امیر طبقے کی منافقت کو واضح کردیتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کا مرکزی کردار دیہاتوں کے مفلس افراد کو بناتے

ہیں جن کو شدید محنت و مشقت کے باوجود دووقت کی روٹی بھی ٹھیک سے میسر نہیں ہوتی ہے۔ ان کی ڈھارس بندھانا اور ان کے زخموں پر مرہم رکھنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔

بگولے کا افسانہ 'طلائی مہر' کی بوڑھی بیوہ لوگوں کا اناج پیستی تھی۔ لیکن سخت محنت اور مشقت کے باوجود اپنا پیٹ تک نہیں بھر پاتی تھی۔ بالآخر یہ بوڑھی بیوہ اناج پیستے پیستے چکی کے پاٹوں میں سر رکھ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ یہ افسانہ دکھ درد اور بیکسی کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جہاں قاری کا کلیجہ منھ کو آ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ کچھ دیکھنے محسوس کرنے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اسی طرح افسانہ 'جلسہ' میں بوڑھا غریب آدمی ذیل دار رئیس خانہ کا مزارع تھا۔ اس کی زمین میں کاشتکاری کرتا تھا۔ مولوی صاحب جب بھی گاؤں آتے ذیل دار ان کے لیے چندہ اکٹھا کرتا تھا۔ اور ان کی خوب خاطر مدارات کرتا تھا۔ غریب بوڑھا چندہ ادا نہیں کر سکا۔ ذیل دار نے کڑکتے ہوئے کہا وہ چندہ لیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھے گا۔ چنانچہ اس نے بوڑھے سے چندہ اس شکل میں لیا کہ جب رات کو بوڑھے کی آنکھ کھلی تو بستر سے اس کی اکلوتی جوان بیٹی غائب تھی چار و نا چار وہ ذیل دار کے گھر کی طرف بھاگا وہاں اس نے دیکھا کہ ذیل دار کمرے کے باہر لاٹھی لیے ہوئے بیٹھا ہے۔ ذیل دار سے اس نے پوچھا میری بیٹی کہاں ہے اس نے کہا وہ مولوی صاحب کے پاس اپنی جوانی لٹا کر تیرا چندہ ادا کر رہی ہے۔ بوڑھے نے غصے میں بے قابو ہو کر چیخنا اور چلانا چاہا مگر ذیل دار کی لٹھی سیدھی اس کے دماغ پر پڑی اور بے دم ہو کر بوڑھا زمین پر گر پڑا۔ یقیناً زندگی میں مفلسی ایک بڑا دکھ ہے جس کے ہاتھوں بے بس اور ناتواں افراد اپنی عزت کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں:

''ایک بوڑھا اپنی کنواری بیٹی کا رات بھر غائب رہنا صرف اس لیے برداشت کر لیتا ہے کہ صبح سویرے اس کی ڈبڈباتی آنکھوں والی لڑکی اس کی ہتھیلی پر چونی یا اٹھنی رکھ دیتی ہے۔''[9]

اسی طرح افسانہ 'رئیس خانہ' کی کہانی فضلو اور مریاں کے کرداروں کے ارد گرد گردش کرتی ہے۔ صحت افزا پہاڑی کے مسافر خانے میں فضلو ملازم ہے اور مریاں اس مسافر خانے کی صفائی و ستھرائی کرتی ہے۔ دونوں کی زندگی غربت زدہ ہونے کے باوجود اطمینان بخش تھی۔ فضلو یوسف کی باتوں میں آکر ہر روز دس روپے کے عوض ایک عورت کا انتظام کرتا ہے یوسف اپنی جنسی پیاس

قاسمی انسان کی تذلیل و تحقیر کے سامنے خاموش تماشائی بن کر نہیں رهنا چاهتے وه همیں افلاس زده بستیوں اور گھرانوں سے پر زور متعارف کراتے هیں جو انتهائی بے بسی اور لاچارگی میں سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبورهوتے هیں. بھوک اور غربت ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کو کچل کر رکھ دیتی هے۔ان مظلوموں کی حمایت میں قاسمی هر وقت کھڑے نظر آتے هیں اور ظلم کے خلاف سینه سپر رهتے هیں. یهی وه درد وکسک اور احساس هے جس کی ترجمانی قاسمی کے دل سے اٹھنے والی لهریں کرتی هیں.

بجھانے کے بجائے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچاتا ہے۔ تو فضلو اپنی بیوی مریاں کو اس مقصد کے لیے بہت منت وسماجت کے بعد تیار کر لیتا ہے۔ وہ عیاش شہری رات بھر مریاں کے جسم سے کھیلتا رہتا ہے۔ کیوں کہ یہ مکار اور فریبی مریاں سے اپنی جنسی بھوک مٹانا چاہتا تھا۔ جب مریاں نے فضلو کو اپنی گزشتہ رات کی کہانی سنائی تو فضلو پر اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اس کی غربت ہی اسے فریب دینے کا باعث بنی۔ اس افسانے میں قاسمی کی حقیقت نگاری، فنی پختگی اور دیہاتی منظر کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اپنے مضمون ''رئیس خانہ'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''''رئیس خانہ'' ہمارے سماج کا آئینہ ہے جس میں سماج کا چہرہ بالکل واضح طور پر نظر آ رہا ہے۔ اس کے کردار ہمارے سماج کے کردار ہیں۔ یہ کردار نہ صرف آزادی سے قبل کے سماج کے کردار ہیں بلکہ ہر عہد کے، ہر ملک کے کردار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افسانہ عصری حسیت سے بھی معمور نظر آتا ہے اور اپنے اثرات اور دائرہ اثر کی بنا پر آفاقی حسیت کا حامل ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے ایک ''رئیس خانہ'' ہی لکھا ہوتا تو بھی اردو ادب میں زندہ رہتے لیکن قاسمی نے ایسے کئی معرکۃ الآرا افسانے اردو کو دیے ہیں۔''[10]

ہمارے معاشرے میں مریاں کی طرح ہزاروں لاچار معصوم بے بس مفلس عورتیں بھینٹ چڑھتی ہیں اور ہزاروں فضلو امیر مکار عیاش لوگوں کے ہاتھوں اپنی عزت گنوا بیٹھتے ہیں۔

قاسمی ان افسانوں کے ذریعے معاشی، تہذیبی اور عصری حالات و واقعات کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق اور زندگی کی صداقتوں کو جاندار اور دلکش بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسا ماحول چاہتے ہیں جہاں ہر سو محبت ہی محبت ہو۔ اور ایسے دور کے خواہشمند ہیں جہاں ہر طرف امن و آشتی کا پہرہ ہو۔ کوئی جاگیردار کسی مفلوک الحال مزارع کا حق نہ لوٹے کوئی اعلیٰ طبقے کا فرد کسی ادنیٰ طبقے کے فرد کو کیڑے مکوڑوں کی طرح کچلنے کی کوشش نہ کرے۔

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قاسمی نے اپنے افسانوں میں حالات کی ستم ظریفی معاشی جبر، ظلم و ستم، سماجی قوانین اور ناانصافیوں پر مبنی نظام حقیقت کو پیش کیا ہے۔ قاسمی انسان کی تذلیل و تحقیر کے سامنے خاموش تماشائی بن کر نہیں رہنا چاہتے وہ ہمیں افلاس زدہ بستیوں اور گھرانوں سے پر زور متعارف کراتے ہیں جو انتہائی بے بسی اور لاچارگی میں سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ بھوک اور غربت ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ ان مظلوموں کی حمایت میں قاسمی ہر وقت کھڑے نظر آتے ہیں اور ظلم کے خلاف سینہ سپر رہتے ہیں۔ یہی وہ درد و کسک اور احساس ہے جس کی ترجمانی قاسمی کے دل سے اٹھنے والی لہریں کرتی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے دیہی زندگی کی سفاک حقیقتوں کو جس طور پر پیش کیا ہے اس کی مثال کم ملتی ہے۔ وہ اپنے گہرے مشاہدے کی وجہ سے دیہی زندگی، معاشرت اور عادات و اطوار کو اپنے افسانوں کا حصہ بنانے میں بہت کامیاب رہے ہیں۔

استفادات:

(1) سید وقار عظیم، نیا افسانہ، ص 172
(2) احمد ندیم قاسمی دیباچہ مشمولہ طلوع و غروب، ص 12
(3) احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری از غلام حسین ورک، غیر مطبوعہ مقالہ، ایم، اے اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور 1988، ص 287
(4) احمد ندیم قاسمی دیباچہ سیلاب و گرداب، لاہور، گلوب پبلشرز 1943
(5) قاسمی سے انٹرویو مشمولہ ندیم نامہ، مرتب اسلم فرخی، کراچی، ادارہ تصنیف و تالیف، 2006، ص 151
(6) احمد ندیم قاسمی، گھر سے گھر تک، ص 64,63
(7) انور سدید، اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش، ص 65
(8) احمد ندیم قاسمی، چوپال، ص 19,20
(9) احمد ندیم قاسمی بگولے، ص 23
(10) ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، اردو افسانہ تعبیر و تنقید، ص 123

■

Rizwan Bin Alauddin, 132-E, Brahmaputra Hostel, JNU, New Delhi-110067
rizwanalauddin1985@gmail.com

محمد زاہد الحق

اردو زبان کی ہم عصر اہمیت و معنویت

آج جبکہ ہمارے سماج و معاشرے میں مختلف قسم کے مباحث چل رہے ہیں اور ہر طرف سے سوالوں کی بوچھار ہے، ایسے میں اس سوال کا جواب طلب کرنا کہ عصر جدید میں اردو زبان و ادب کی کیا اہمیت و افادیت ہے، بالکل اہم اور تقاضائے وقت کے مناسب ہے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بالکل روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ اس زبان نے اپنے سماجی اور معاشرتی سروکار کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور وقتاً فوقتاً اپنے عوامی رشتے کا از سر نو جائزہ بھی لیا ہے۔ سر دست ہمارے پیش نظر یہ سوال ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب کی اہمیت و افادیت اور اس کی معنویت کیا ہے؟ اسی سے منسلک سوال یہ بھی ہے کہ ہم اردو کیوں پڑھیں اور آنے والی نسلوں کو اردو کیوں پڑھائیں؟

مندرجہ بالا سوال کے جواب میں جو نکتہ سب سے پہلے ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اردو زبان میں قواعد کا نظام بہت لچیلا (Flexible) ہے اور دیگر زبانوں کی طرح اس میں سخت گیری نہیں ہے۔ مثلاً اردو میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو مذکر اور مؤنث دونوں بولے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کی واحد شکل مذکر ہے تو جمع مؤنث یا واحد مؤنث ہے تو جمع مذکر۔

اردو آج ہندستان کے مختلف علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس زبان نے علاقائی اثرات کو بہ خوبی قبول کیا ہے اور آج ہمارے سامنے ممبئی کی اردو سے کلکتے کی اردو مختلف ہے۔ بہار کے لہجے سے اتر پردیش اور ان دونوں سے دکن کے لہجے کو بہ آسانی ممیز کیا جا سکتا ہے۔ گویا کہ اردو نے نہ صرف قواعد بلکہ بول چال کے اعتبار سے بھی اپنی الگ شناخت برقرار رکھی ہے اور مختلف مقامی اثرات کو قبول بھی کیا ہے۔

آج ہر طرف یہی شور سنائی دیتا ہے کہ اردو روزگار سے جڑی ہوئی نہیں ہے، اسی لیے نئی نسل اس زبان سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ جب کہ سچائی اس کے برعکس ہے۔ عصر حاضر سے سو ڈیڑھ سو سال قبل جبکہ روزگار کی زبان انگریزی تھی تب بھی اردو کا بول بالا تھا۔ اس وقت کے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ اردو کی تعلیم حاصل کی بلکہ اپنی آنے والی نسلوں کو بھی اردو تعلیم سے بہرہ ور کیا۔ گویا یہ زبان موجودہ نسل کی جینیاتی زبان ہے اور اس سے محض روزی روٹی کے نام پر دوری اختیار کرنا اپنی جڑوں سے دور ہونے کے مترادف ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ نئی نسل کو اردو تعلیم سے آراستہ کیا جائے کیوں کہ زبان کا عمل بہتے ہوئے پانی کی طرح ہوتا ہے، اگر یہ سلسلہ رک جائے تو زبان کی ترقی اور ترویج و اشاعت کا عمل بری طرح متاثر ہوگا۔

اردو زبان کے لچیلے پن کا ایک اور بین ثبوت یہ ہے کہ اس زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنانے اور اپنی زبان کے پرانے الفاظ کو ترک کرنے میں جس قدر سہولت اور آزادی ہے وہ دوسری زبانوں میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ اس معاملے میں یہ زبان نہایت وسیع القلب اور کشادہ دامن ہے۔ اردو ہندستان میں پیدا ہونے والی زبان ہے جس نے دیگر زبانوں سے خاطر خواہ اثر قبول کیا ہے۔ اس کی بہتر مثال یہ ہے کہ دراوڑی زبانوں کے درمیان رہ کر اس زبان نے چلنا پھرنا سیکھا اور جب اس کو بھرپور توانائی حاصل ہو گئی تو اردو زبان نے پہلے پہل ادبی طور پر یہیں برگ و بار پیدا کیے۔ اردو حروف تہجی میں دراوڑی حروف کی موجودگی اس بات کا کھلا ثبوت ہے اور اردو ادب میں پہلی تخلیق سے لے کر تقریباً ڈھائی سو برسوں تک کا سرمایہ بھی اس ضمن میں بہ طور گواہ موجود ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں جو Social Space موجود ہے اس میں اردو زبان اپنی بھرپور موجودگی درج کرا رہی ہے۔ فلم، ٹیلی ویژن، ڈرامہ، تھیٹر وغیرہ میں جو عام بول چال کی زبان استعمال ہو رہی ہے، وہ بلا شک و شبہ اردو یا ہندستانی ہی ہے۔ اس میں استعمال میں آنے والے الفاظ، جملے اور شاعری کے ساتھ ساتھ تہذیبی جملے اور اس کی نقل سے اس کا واضح اندازہ ہوتا ہے کہ فلموں اور دیگر عوامی ذرائع ابلاغ میں اردو کی بھرپور موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

آیئے مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ ان عوامل کی طرف رجوع کریں جو اردو تعلیم اور اردو دوستی کے مینارۂ نور ہیں۔ آج جب ہمارے سماج و معاشرے میں ہر طرف ظلم و جبر کا بول بالا ہے، انانیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور کوئی کسی کی بات سننے کو تیار نہیں ہے، ایسے ماحول میں صرف اردو زبان ہی یہ دعوا کر سکتی ہے کہ یہ زبان سیدھے دل پر اثر کرتی ہے اور ہر سننے والا اس سے متاثر ہوتا ہے:

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

چلیے اب ان چند نکات کو بھی دیکھتے چلیں جو اردو تعلیم کا جزولاینفک ہیں۔ اردو تعلیم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس میں کبھی بھی سیکولرزم یا اس سے منسلک باتوں کے لیے الگ سے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اردو زبان وادب کی سرشت ہی میں سیکولر روایات حل کر دی گئی ہیں۔ لہٰذا جب ہم شاعری بالخصوص غزل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے اس بات کی مزید توثیق ہو جائے گی:

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

آنکھ سے دل کی راہ گزر تک پیچ وخم کا نام نہیں
کتنی سیدھی راہ گئی ہے کعبہ سے بت خانے کو

اردو تعلیم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس میں کبھی بھی سیکولرزم یا اس سے منسلک باتوں کے لیے الگ سے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اردو زبان و ادب کی سرشت ہی میں سیکولر روایات حل کر دی گئی ہیں۔ لہٰذا جب ہم شاعری بالخصوص غزل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔

اردو شاعری میں ایسا اس لیے ممکن ہوا کیونکہ اردو شاعری بالخصوص غزل کو یہ سب عناصر فارسی شاعری سے وراثت میں ملے ہیں اور ہندستان آنے کے بعد تو اس فارسی شاعری کی شکل وصورت یوں تھی:

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

عصر حاضر میں ہمارے سماجی و معاشرتی تانے بانے کو ذات پات اور مسلکی نظام نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے، مگر اردو شاعری نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے۔ اٹھارھویں صدی کے شاعر احسن اللہ بیان کا شعر ملاحظہ فرمائیں:

مومن نہ کافر اور نہ سید نہ شیخ ہے
عاشق کی پوچھیے تو کوئی ذات ہی نہیں

تو وہیں دوسری طرف اکبر الہ آبادی کا مشہور شعر ہے:

میرا طریق مذہب کیا پوچھتی ہو مُنّی
شیعہ کے ساتھ شیعہ سُنّی کے ساتھ سُنّی

ایسا نہیں کہ اردو ادب نے محض ذات پات اور مسلکی اختلافات کے خلاف آوازیں اٹھائیں بلکہ اگر اردو زبان کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اردو چوں کہ ملواں زبان ہے اور مختلف قوموں، کلچر اور تہذیب کے ملنے سے یہ زبان وجود میں آئی ہے، اس لیے اس کے خمیر میں وسیع المشربی اور کشادہ قلبی روز اول سے موجود ہے۔ اس ضمن میں امیر مینائی کا شعر ملاحظہ فرمائیں:

سانولی دیکھ کے صورت کسی متوالی کی
ہوں مسلمان مگر بول اٹھوں جے کالی کی

تو دوسری طرف جس بات کو ہم بہت واضح طور پر محسوس کرتے ہیں وہ یہ کہ اردو زبان و ادب میں ہمیشہ سے دوسرے مذاہب کے تئیں عقیدت اور یکساں عظمت کا رویہ عام رہا ہے۔ چوں کہ یہ زبان عوام کے درمیان پلی بڑھی ہے، لہٰذا اس میں عوامی رواداری کا زبردست رچاو بساو ہے۔ بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر، شاعر اسلام اور شاعر مشرق علامہ اقبال نے شری رام چندر کے متعلق اپنے خیالات یوں پیش کیے:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

اسی صدی کے ایک اور بڑے اہم عوامی شاعر پدم بھوشن ساغر نظامی نے بھی مریادا پرشوتم شری رام چندر کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

ہندیوں کے دل میں باقی ہے محبت رام کی
مٹ نہیں سکتی قیامت تک حکومت رام کی
زندگی کی روح تھا انسانیت کی شان تھا
وہ مجسم روپ میں انسان کے عرفان تھا

تو وہیں دوسری طرف غیر مسلم شعرا نے بھی پیغمبر اسلام سے اپنی عقیدت ومحبت کا اعتراف یوں کیا ہے:

عشق ہو جائے کسی کو کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

ہندو ہوں بہت دور ہوں اسلام سے لیکن
مجھ کو بھی محمدؐ کی شفاعت پہ یقیں ہے

یہی وہ مخصوص رنگ ہے جس کو پروفیسر سید مجاور حسین رضوی نے ہمہ رنگی میں یک رنگی سے تعبیر کیا ہے۔

اردو زبان کی شیرینی اور دلکشی کا راز اس کے مدھم لب و لہجے میں ہے۔ یہ زبان پیار ومحبت اور شیر وشکر کی زبان ہے۔ یہ انتشار اور تشدد کی زبان ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی لیے تو خالد نیر نے اپنے اس شعر میں کہا ہے:

تمھاری نفرتوں میں پیار کی خوشبو بسا دیں گے
ہماری بزم میں آنا تمھیں اردو سکھا دیں گے

اردو کی یہ خوبی اس لیے بھی پروان چڑھی کہ اس زبان کو فروغ دینے میں صوفیائے کرام اور بزرگان دین نے اپنا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان صوفیا کے نزدیک دنیا کے تمام انسان ایک ہیں۔ اسی تصوف نے فارسی شاعری کو سیکولر مزاج وکردار دیا، وہاں سے موضوعات کی رنگارنگی لے کر تصوف اردو شاعری میں داخل ہوئی اور مساوات کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کا درس دیا۔ لہٰذا آج کے دور میں انسان دوستی کا درس دینے کے لیے اردو سب سے اہم، مناسب اور موزوں ترین زبان ہے:

اردو کے فروغ اور ترویج و ترقی میں ہمیشہ سے مختلف علاقے اور مذاہب کے لوگوں نے پیش قدمی کی ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح اگر اس زبان کا کوئی خاص علاقہ ہوتا تو وہاں کے عوام و خواص جذباتی طور پر اس زبان کی محافظت کرتے مگر اردو تو عوام کی زبان ہے

آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

بت خانہ کھود ڈالیے، مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیے کہ خدا کا مقام ہے

اردو پر آئے دن یہ الزام عائد ہوتا رہتا ہے کہ یہ ایک خاص مذہب کی زبان ہے۔ اردو کی تشکیل سے لے کر آج تک اس زبان کا نہ تو کوئی خاص علاقہ رہا ہے اور نا ہی مذہب۔ اردو کے فروغ اور ترویج وترقی میں ہمیشہ سے مختلف علاقے اور مذاہب کے لوگوں نے پیش قدمی کی ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح اگر اس زبان کا کوئی خاص علاقہ ہوتا تو وہاں کے عوام وخواص جذباتی طور پر اس زبان کی محافظت کرتے مگر اردو تو عوام کی زبان ہے، ہمیشہ سے اس کا دائرہ کار عوامی رہا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ محترمہ وردانہ انصاری نے اپنے مضمون ''اردو تعلیم کیوں ضروری ہے؟'' میں لکھا ہے:

''اول یہ کہ یہ درآمد شدہ زبان نہیں بلکہ اسی سر

زمین کی زبان ہے جسے دنیا ہندستان کے نام سے جانتی ہے........اہل ہند اسے بدیسی بولی نہیں کہہ سکتے........ اردو کی نسبت غریبوں سے ہے شاید اسی لیے اس پر عتاب ہے۔'' (تدریس نامہ، شمارہ 1، ص 49)

اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اردو پر آئے دن جتنے حملے ہوتے رہتے ہیں اتنے حملے اگر دوسری کسی زبان پر ہوں تو اس زبان کا بولنے والا ہر خاص و عام احتجاج میں شامل ہو جاتا ہے، مگر اردو کے لیے تو محض ایک فرقہ یا ایک خاص آبادی کو ہی آگے آنا پڑتا ہے کیوں کہ لوگوں نے اردو کو ایک فرقہ یا ایک مذہب کی زبان بنا دیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے شاعر کو یہ کہنا پڑا کہ:

وحشت میں تار تار گریبان کر دیا
تہذیب کا اثاثہ بھی قربان کر دیا
یاران خوش مذاق نے اللہ کی پناہ
اردو کو بے قصور مسلمان کر دیا

اردو وہ زبان ہے جس نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ انقلاب زندہ باد سے لے کر سرفروشی کی تمنا جیسے نعرے بھی اسی زبان نے دیے۔ یہ زبان حب الوطنی اور مادر وطن سے محبت کی زبان ہے:

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

(حالی)

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

(پنڈت برج نرائن چکبست)

مرے قبیلے کے بچوں کے کھیل بھی ہیں عجیب
کسی سپاہی کی تلوار چھین لائے ہیں
ہنسو نہ ہم پہ کہ ہر بدنصیب بنجارے
سروں پہ رکھ کے وطن کی زمین لائے ہیں

(راحت اندوری)

مگر جب چند شر پسندوں نے اردو کی مخالفت کی اور جب اسے اپنے ہی گھر سے بے دخل کرنے کی منصوبہ بند کوشش ہوئی تو یہ بے چاری مظلوم، معصوم اردو ہی تھی جس نے تمام طرح کے ستم کو برداشت کیا۔ اردو اپنے گھر سے بے دخل تو نہیں ہوئی مگر رفتہ رفتہ اس نے ہندستان میں اور ہندستان سے باہر دنیا کے مختلف گوشوں میں اپنی نئی بستیاں آباد کر لی ہیں۔ ہندستان میں بہت ساری ریاستی اور علاقائی زبانوں کے درمیان اردو نے خود کو آباد کیا ہے۔ تامل ناڈو اور کیرل اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ کچھ دراوڑی علاقے ایسے بھی ہیں جہاں کے عوام کی مادری زبان اردو ہے، وہاں کے لوگ اردو کو لے کر بے حد سنجیدہ ہیں۔ 1995 میں جب بنگلور ٹیلی ویژن سے اردو خبر نامہ بند کیا جا رہا تھا تو وہاں کے لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ ایسی سنجیدہ کوشش اور حکمت عملی کا مظاہرہ جب بھی عوام کی طرف سے ہوگا تو عوام کی زبان کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ یہی اس زبان کی بقا کی ضمانت ہے۔

اردو به حیثیت مادری زبان ہمیشه اپنی چمک دمک برقرار رکھے گی۔ ہندستان اور دیگر بیرونی ممالک میں بھی تعلیم کے حوالے سے جو مطالعات سامنے آئے ہیں ان کا لُبّ لُباب یہ ہے کہ مادری زبان میں کسی بھی طرح کی تعلیم دینا دوسری زبانوں کی بہ نسبت بہت آسان اور کار آمد ہے۔ اس طرح سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہم دنیا کی چاہے جتنی زبانیں سیکھ لیں مادری زبان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم رہتی ہے۔

اکیسویں صدی میں آج انفارمیشن ٹکنالوجی نے جتنی ترقی کر لی ہے، اردو ان سب ترقیات سے ہم آمیز ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ وقت بہت آگے نکل جائے اور اردو پیچھے کہیں چھوٹ جائے۔ آج اردو نے اپنے آپ کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر لیا ہے اور کمپیوٹر، انٹرنیٹ کی دنیا میں دیگر زبانوں کے ہم پلہ بہت مضبوطی سے اپنی موجودگی درج کرا چکی ہے۔ آج فیس بک، ٹویٹر اور وہاٹس ایپ نے اردو عوام کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے آپ میں تبدیلی کی اور اردو کے لیے نئے امکانات پیدا کیے تو اردو نے بھی اپنی سماجی ذمے داری نبھاتے ہوئے ان سب جگہوں پر اپنے آپ کو ثابت قدم رکھا ہے۔ آج بلاگس، فورم اور دیگر گروپس کی وجہ سے اردو زبان کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعے نہ صرف فروغ ہو رہا ہے بلکہ اس کی عوامی مقبولیت بھی بڑھ رہی ہے۔

اردو حلقوں میں یہ بات اکثر سنی جاتی ہے کہ اردو میں روزگار کے مواقع نہیں ہیں مگر یہ بھی امر حقیقت ہے کہ اردو کے خصوصی حوالے سے درس و تدریس کے علاوہ جتنے مواقع اب مہیا ہیں وہ اب سے پہلے نہیں تھے۔ اب ذرائع ابلاغ میں جتنے امکانات روشن ہیں اتنے اب سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ آج ہندستان ہی کیا دنیا کے منظر نامے پر جتنے اردو کے اخبارات شائع ہو رہے ہیں اتنے تو پہلے کبھی نہیں تھے۔ کمپیوٹر کی آمد نے تعلیم کا نقشہ ہی بدل دیا ہے تو اردو اس میں بھی پیچھے نہیں ہے۔ آج اردو کی ریگولر، فاصلاتی اور آن لائن تعلیم میں کمپیوٹر جس قدر ممد و معاون ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ جدید عصری تعلیمی تقاضوں کے مدنظر اردو اور کمپیوٹر لازم و ملزوم ہیں۔

مختلف مسابقتی امتحانات میں اردو کی اہمیت و افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ یونین پبلک سروس کمیشن سے لے کر ریاستی پبلک سروس کمیشن اور دیگر امتحانات تک اردو بہ حیثیت اختیاری مضمون اور بہ حیثیت ذریعۂ امتحان اپنا نمایاں رول ادا کر رہی ہے۔ لہٰذا اس خاص میدان میں بھی اردو کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

آیئے اب ہم اپنے پہلے سوال کی طرف چلیں کہ عصر حاضر میں اردو کی کیا معنویت اور اہمیت ہے؟ اردو بہ حیثیت مادری زبان ہمیشہ اپنی چمک دمک برقرار رکھے گی۔ ہندستان اور دیگر بیرونی ممالک میں بھی تعلیم کے حوالے سے جو مطالعات سامنے آئے ہیں ان کا لُبّ لُباب یہ ہے کہ مادری زبان میں کسی بھی طرح کی تعلیم دینا دوسری زبانوں کی بہ نسبت بہت آسان اور کار آمد ہے۔ اس طرح سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہم دنیا کی چاہے جتنی زبانیں سیکھ لیں مادری زبان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم رہتی ہے۔ اس کے لیے ایک لطیفہ سنا کر میں اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں:

ایک بچے نے اپنی ماں سے پوچھا، ممی تم نے مجھے جھوٹ کیوں کہا؟

Mom: I told you several times to speak in English.
Boy: OK mom, you lied to me.
Mom: When my son?
Boy: You said that my younger sister is an angel.
Mom: Yes, she is.
Boy: So, why did not she fly when I threw her from the Balcony?

ماں: ارے نالائق، کہاں پھینک آیا میری بچی کو؟

بچہ: Relax mom، میں تو صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ کیا تم اب بھی کسی اور زبان میں بولتی ہو یا اپنی مادری زبان میں بات کرتی ہو۔

■

Dr. Mohd Zahidul Haque, Dept of Urdu, University of Hyderabad - 500046 (Telangana)

شریف احمد قریشی

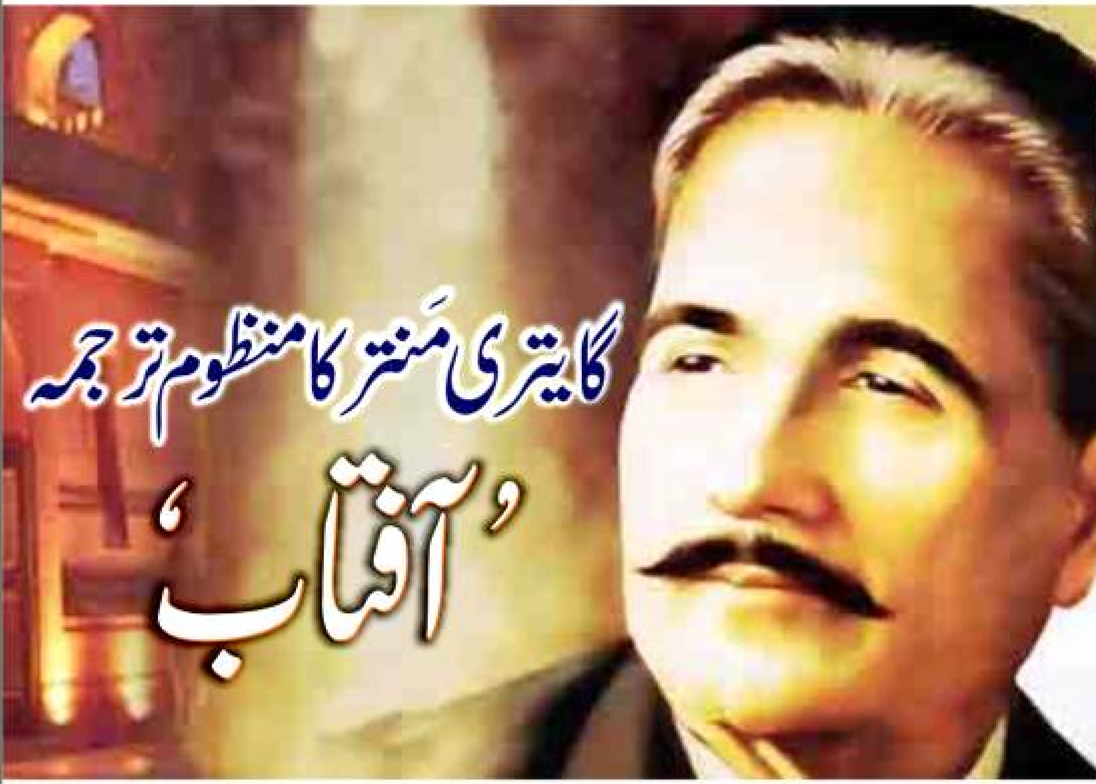

گایتری مَنتر کا منظوم ترجمہ
'آفتاب'

گایتری منتر رگ وید کا مقدس ترین منتر ہے جسے ساوتری منتر بھی کہا جاتا ہے۔ ہندو دھرم میں اس منتر کو نہایت مقدس، متبرک اور افضل تسلیم کیا گیا ہے۔ اسے ویدوں کی ماں اور رگ وید کی آتما یعنی روح تصور کیا جاتا ہے۔ براہمنوں (ब्राह्मणों) اور اُپ نشدوں (उपनिषदों) سے لے کر پُرانوں (पुराणों) اور تنتروں (तन्त्रों) میں بھی اس منتر کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ ویدوں کے درس کے آغاز کی رسم کے وقت یہ منتر برہم چاری یعنی مبتدی کے گوش گزار کرایا جاتا ہے اور اس کے مفہوم سے بھی اُسے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اس منتر کا دیوتا سَوِتا (सविता) اور رشی وشوامتر (विश्वामित्रऋषि) ہیں۔ اس منتر کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب کوئی ہندو قریب مرگ ہوتا ہے تو اُس کی بالیں کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ اُس کی آتما یعنی روح کی شانتی (نجات) کے لیے اس منتر کا جاپ کرتے ہیں۔

رگ وید کے مشہور مفسر سائیں آچاریہ نے رشیوں اور منیوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص چالیس دن تک پانی میں کھڑے ہو کر صدقِ دل سے اس منتر کا جاپ کرتا ہے تو اُس کے تمام گناہ دُھل جاتے ہیں اور اُس میں روحانی قوت پیدا ہوجاتی ہے۔

منو کا قول ہے کہ پرجاپتی نے اُکار، اُکار اور مکار (अकार, उकार और मकार) الفاظ یعنی بھوُر، بھُوا اور سواہ اور اس منتر کے تینوں پادوں یا حصوں کو رِگ (ऋक)، یجو (यजु:) اور سام وید (सामवेद) سے بالترتیب خارج کردیا تھا۔ اس لیے منتر کی شکل اس طرح ہوگئی تھی:

''تتس وِترُورے یم بھرگو دیوسیہ دھی مہیں
دھیو یونہ پر چودیات''

(तत्स वितुर्वरेण्यं भर्गो देवस्य धीमहिं
धियो यो नः प्रचोदयात)

شارحین نے اس منتر کی تشریح اپنے اپنے خیالات و نظریات کے مطابق کی ہے۔ جن شارحین کا خیال ہے کہ اس منتر کا ابتدائی حصہ قادرِ مطلق کی حمد و ثنا ہے اور آخری حصہ دعائیہ ہے وہ اس منتر کا آغاز 'اوم' (ॐ) کے اضافے کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں:

''اوم بھوُر بھُوا سواہ''

(ॐ भूर्भुवः स्वः)

زمانۂ قدیم سے دورِ حاضر تک یہ منتر اوم بھوُر بھُوا سواہ (ॐ भूर्भुवः स्वः) کے ساتھ نہ صرف پڑھا جاتا ہے بلکہ مقبولِ خاص و عام بھی ہے۔

بعض مفسرین اس منتر کو سورج دیوتا کے حضور میں دعائیہ کلمات تصور کرتے ہیں تو بعض کے مطابق اس منتر میں دعائیہ کلمات کے ساتھ سورج کی صفات و خصوصیات کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ اقبال کے علاوہ اُردو اور دوسری زبانوں کے شعراء و مترجمین نے گایتری منتر کے تراجم اپنے اپنے طور پر کیے ہیں۔ علامہ اقبال نے اس منتر کا منظوم ترجمہ 'آفتاب' کے عنوان سے کیا ہے جس میں اُنھوں نے سورج کی اُنھیں صفات و خصوصیات کو بیان کیا ہے جو گایتری منتر میں بیان کی گئی ہیں۔

اصل منتر کا مفہوم ہے:

وہ (آفتاب) جو تمام کائنات کا خالق ہے وہی حمد و ثنا کے لائق ہے، اُسی کا ذکر اور دھیان کیا جائے۔ آفتاب تمام چمکیلی یعنی نورانی اشیا کا خزانہ ہے۔ وہ منبعِ انوار ہے۔ ہم اُسی کی توصیف کرتے ہیں اور اُسی کا دھیان کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ضیائے شعور اور عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ (تاکہ ہم نیک راہ پر چل کر نیک کام کرسکیں)

اقبال نے اس منتر کا محض لفظی یا تخلیقی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ تشریح کے انداز میں آزاد ترجمہ کیا ہے۔ اُنھوں نے آفتاب کی اُنھیں صفات کی وضاحت کی ہے جو گایتری منتر کا مفہوم ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اقبال اس منتر کا حرف بہ حرف لفظی ترجمہ کرتے تو ترجمے سے منتر کی اصل روح ہی غائب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اصل منتر سنسکرت زبان کے مذکورہ چند الفاظ پر مشتمل ہے جس کے مفہوم کو اقبال نے دس اشعار میں اس طرح پھیلایا ہے کہ نظم ترجمہ کے بجائے طبع زاد معلوم ہوتی ہے۔ پیش ہے نظم 'آفتاب' کا اصل متن:

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیرا کمال ہستیِ ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہ سار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاج دار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری

اقبال نے درج بالا نظم میں آفتاب کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے یا جو خیالات پیش کیے ہیں وہ اُن کے ذاتی خیالات نہیں ہیں۔ اُنھوں نے صیغۂ حاضر میں اس مَنتر کے ابتدائی حصّے کے مفہوم کو نو اشعار اور مختلف الفاظ وتراکیب کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے آفتاب کو مخاطب کرتے ہوئے اسے روحِ روانِ جہاں، شیرازہ بندِ دفترِ کون ومکاں، وجود وعدم کی نمود کا باعث، ہست و بود کے چمن کو سرسبز رکھنے والا، عنصروں کے تماشے کو قائم رکھنے والا، محفلِ وجود کا ساماں طراز، یزدانِ ساکنانِ نشیب وفراز، ہر چیز کی حیات کا پروردگار، زائیدگانِ نور کا تاجدار اور اُس کی ضیا کو آزادِ قیدِ اوّل وآخر کہا ہے۔ آفتاب کو ازلی اور ابدی قرار دینے کے علاوہ آفتاب کی جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تمام صفات گایتری مَنتر کے مفہوم کی ترجمان ہیں جن کا تعلق اقبال کے عقیدہ سے قطعی نہیں ہے کیوں کہ گایتری مَنتر میں آفتاب یعنی سورج کو یزداں قرار دیا گیا ہے جو مسلمانوں کے عقیدے کے خلاف ہے۔

منظوم ترجمہ کی بہ نسبت ایک زبان کے نثری فن پارے کو دوسری زبان کی نثر میں منتقل کرنا قدرے آسان ہے مگر کسی زبان کی نظم کے منظوم ترجمہ کے لیے حد درجہ احتیاط اور فنکارانہ مہارت ضروری ہے۔ گایتری مَنتر کے ترجمہ کے مطالعے سے نہ صرف اقبال کی شاعرانہ عظمت وانفرادیت کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بہ اعتبار زبان وبیان اس مَنتر میں نئی روح پھونک دی ہے۔

اقبال نے نشیب وفراز، ہست وبود، وجود وعدم اور سوز وساز جیسی تراکیب کا اپنے کلام میں بکثرت استعمال کیا ہے۔ اُنھوں نے انھیں تراکیب ولفظیات کے ذریعے گایتری مَنتر کی روشنی میں آفتاب کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے اُسے سوز وساز کا ایسا مظہر قرار دیا ہے جو باعثِ وجود وعدم بھی ہے اور پروردگارِ حیات بھی ہے۔

نظم کا پانچواں شعر صیغۂ غائب میں اس طرح نظم کیا گیا ہے:

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے

اس شعر کو صیغۂ غائب میں اس لیے نظم کیا گیا ہے کہ مَنتر میں بھی ایک جگہ آفتاب کو صیغۂ غائب میں 'तत' یعنی 'وہ' کہا گیا ہے۔

نظم کا چھٹا شعر دعائیہ ہے جس میں مَنتر کے آخری حصّے کے مفہوم کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے:

اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے

منظوم ترجمہ کی بہ نسبت ایک زبان کے نثری فن پارے کو دوسری زبان کی نثر میں منتقل کرنا قدرے آسان ہے مگر کسی زبان کی نظم کے منظوم ترجمہ کے لیے حد درجہ احتیاط اور فنکارانہ مہارت ضروری ہے۔ گایتری مَنتر کے ترجمہ کے مطالعے سے نہ صرف اقبال کی شاعرانہ عظمت وانفرادیت کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بہ اعتبار زبان وبیان اس مَنتر میں نئی روح پھونک دی ہے۔

گایتری مَنتر کا یہ ترجمہ کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے مخصوص اسلوب کے ذریعے گایتری مَنتر کے مفہوم سے اُس اُردو داں طبقے کو واقف کرانے کی کوشش کی ہے جو سنسکرت زبان سے ناواقف ہے۔ وہ چاہتے تو مَنتر کا حرف بہ حرف لفظی ترجمہ کرکے اُس کے مفہوم کو صرف دو اشعار میں نظم کر سکتے تھے مگر

علّامہ اقبال اُردو کے عظیم و منفرد شاعر تو ہیں ہی ، سنسکرت زبان کے مَنتر کے اس ترجمہ سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ وہ سنسکرت زبان اور اس مَنتر کی باریکیوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اُنھوں نے مَنتر کے مجموعی تاثر اور مرکزی خیال کو نہایت خوبی سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اُنھوں نے مَنتر کے آخری دعائیہ حصّے کو ایک شعر میں اور ابتدائی حصّے کے مفہوم کو نو اشعار میں بیان کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبال نے شاید ایسا اس لیے کیا ہے کہ مَنتر کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے یعنی آفتاب کے بنیادی اوصاف کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اس طرح کا منظوم ترجمہ کرتے وقت اقبال کو یہ مشکل بھی پیش آئی ہوگی کہ مفہوم کی وضاحت کے ساتھ ترجمہ حشو وزوائد سے بھی پاک وصاف رہے۔ پوری نظم پڑھنے کے بعد بھی یہ محسوس نہیں ہوتا ہے کہ ایک شعر یا ایک مصرع یا ایک لفظ بھی زائد یا غیر ضروری ہے۔ اس ترجمہ کے ذریعے اُردو داں طبقہ ہندو دھرم کے بنیادی عقائد اور قدیم ہندوستانی تہذیب سے بھی آشنا ہوا ہے۔ اس منظوم ترجمے کی زبان صاف، سادہ اور بیان نہایت رواں دواں ہے، تراکیب آسان اور بالکل سامنے کی ہیں۔

مترجم کتنا ہی لائق اور قابل ہو وہ جب تک اُن زبانوں سے پوری طرح واقفیت نہ رکھتا ہو جس زبان کے فن پارے کا ترجمہ کرنا مقصود ہے اور جس زبان کے پیکر میں اُسے ڈھالا جا رہا ہے، تب تک ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ علامہ اقبال اُردو کے عظیم ومنفرد شاعر تو ہیں ہی، سنسکرت زبان کے مَنتر کے اس ترجمہ سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ وہ سنسکرت زبان اور اس مَنتر کی باریکیوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اُنھوں نے مَنتر کے مجموعی تاثر اور مرکزی خیال کو نہایت خوبی سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمہ اصل متن سے نہ صرف قریب ترین ہے بلکہ اقبال کی دیگر نظموں کی طرح روانی اور سلاست سے بھی پُر ہے۔ گایتری مَنتر کا یہ منظوم ترجمہ اُردو کے منظوم ترجموں میں نہ صرف منفرد اہمیت کا حامل ہے بلکہ ایک شاہکار بھی ہے۔

■

Dr. Shareef Ahmad Quraishi
Masjid Imli Wali, Jain Mandir Road
Phoota Mahal,Rampur - 244901 (UP)

عزیز لکھنوی کی قصیدہ نگاری

حسن رضا کمیلی

عزیز لکھنوی کا اردو شعر و ادب میں ایک اہم مقام ہے۔ آج کی اردو نسل انھیں حافظے میں محض جوش ملیح آبادی کے استاد کے طور پر جگہ دیتی ہے۔

مرزا محمد ہادی ان کا نام اور عزیز تخلص تھا۔ 5 ربیع الاوّل 1300ھ مطابق 1882 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد علی ہے جو اپنے زمانے میں فضل و کمال کے اعتبار سے ایک مرتبہ رکھتے تھے۔ خاندان میں علمی مذاق کئی پشتوں سے ثابت ہے چنانچہ عزیز نے بھی اس سنت خاندانی کو قائم رکھا اور پھر متعدد استادوں سے جن میں مولوی محمد حسین، پیارے مرزا، شمس العلما مولوی عبدالحمید وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، تحصیل علم کی۔ ان بزرگوں سے صرف و نحو، فقہ و اصول، ادبیات، کتب معقول اور درسیات فارسی پڑھی اس لیے شاعری کے ساتھ ساتھ علمی فضل و کمال کے جوہر بھی رکھتے تھے۔

عزیز کو لکھنؤ کے قدیم رنگ تغزل کی آخری یادگار قرار دیا گیا ہے۔ وہ میر و غالب کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن ان کا اپنا خاص رنگ ہر جگہ نمایاں رہتا ہے۔ ان کی زبان لکھنؤ کی اصلاح شدہ مستند ٹکسالی زبان ہے۔ عزیز کے یہاں غالب اور میر کی ہم رنگی پر ابواللیث[1] صدیقی نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ موصوف کے مطابق عزیز کے قصیدوں میں سودا اور ذوق کا ساز ور اور طنطنہ موجود ہے لیکن ان کی زبان ان دونوں سے زیادہ صاف اور رواں ہے۔ عزیز کی قادرالکلامی یہ ہے کہ انھوں نے رنگ تغزل کو جو حقیقتاً قصیدے کا نقص ہے قصیدے کی خوبی بنا کر حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

عزیز کے قصیدوں کی تشبیب سے متعلق ابواللیث صدیقی نے بہت مختصر اور جامع انداز میں اظہار خیال کیا ہے:

''عزیز کی تشبیبیں عموماً تین انداز رکھتی ہیں۔ (1) تو بہاریہ ہیں (2) یا تغزل کا رنگ ہے (3) یا مکالمہ یا اپنے علم و فضل کا اظہار ہے۔[2]

صحیفۂ ولا عزیز کے قصیدوں کا مجموعہ ہے جس میں پچاس سے زیادہ قصیدے ہیں۔ لیکن علی جواد زیدی[3] کے مطابق مختلف اخبارات اور رسائل میں چھپنے والے قصیدوں اور دوسرے غیر مطبوعہ قصیدوں کو ملا کر عزیز نے تقریباً پچھتر قصیدے کہے ہیں۔ انھوں نے اپنی زبان کو درباری مدح سے آلودہ نہیں کیا اور صرف ائمہ طاہرین کی مدح سرائی کی ہے۔

عزیز کے قصائد کی دنیا وسیع اور دلکش ہے۔ وہ عموماً رواں بحروں کو منتخب کرتے ہیں اور سنگلاخ زمینوں میں ان کے چند ہی قصائد ہیں۔ گریز و مدح سے زیادہ ان کا زور تشبیبوں پر ہوتا ہے جن میں علمی اصطلاحات اور تلمیحات کا وسیع خزانہ ہے۔ ان کی تشبیبوں میں حسن و عشق، رندی و مستی، مناظر فطرت، درس اخلاق وغیرہ مضامین بکثرت موجود ہیں۔

جن قصیدوں کی تشبیب میں عزیز نے گلشن و بہار کے مرقعے پیش کیے ہیں ان میں سادگی و سلاست ہونے کے باوجود کہیں کہیں فارسی کا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ خصوصاً 'قوت نامیہ' کی کرشمہ سازیوں میں خاصا مبالغہ ہے۔ عزیز نے 'قصیدہ غزل طور' کے نظریے کو بڑی چابک دستی سے برتا ہے۔ 'قصیدۂ معراجیہ' کی تشبیب میں ذرا اس رنگ کی گلکاریاں دیکھیے:

توڑی اثر نالہ نے جب مہر لب ضبط
کس شوق سے کھلنے لگا طومار شکایات
کام آہی گیا گریۂ بیتابی فرقت
اک عمر سے نکلے ہی نہ تھے دل کے بخارات
اللہ رے وہ بے خودی شوق کا عالم
کوشش تھی کہ ہو جائے کہیں تم سے ملاقات

مذکورہ اشعار میں تغزل کی شیرینی میر حسن کے قصیدوں کی تشبیب کی یاد دلاتی ہے۔ اگر اس طرح کے اشعار کو سامنے رکھا جائے تو بآسانی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ میر حسن اور میر تقی میر کی طرح عزیز کے یہاں بھی خیال اور بیان کی چستی حاوی ہے۔ لیکن عزیز کے یہاں تشبیب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ علو مضامین، خوشنما الفاظ اور جدید تراکیب سے سودا و ذوق کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔

اسی قصیدے میں غزلیہ اشعار کے بعد عاشق و معشوق میں سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مکالمہ کے اس انداز نے دلچسپی اور جاذبیت میں اضافہ کیا ہے:

تجھ کو اثر جذبۂ عاشق کی قسم ہے
اب دے مرے ان چند سوالوں کے جوابات
کیا عشق کی تقدیر میں ہے ذلت و خواری
کیا شان نہیں ہے مری شایان مراعات
میں نے یہ کہا ہوگا ستم مجھ پہ کہاں تک
فرمایا کہ جب تک رہیں تجھ پر یہ عنایات
میں نے یہ کہا آئے ہو مقتل میں تہی دست
فرمایا کہ کافی ہیں مرے چند اشارات
میں نے کہا زندہ ہیں شہیدان محبت
فرمایا تجھے قتل کروں گا پئے اثبات

عزیز کی ان عاشقانہ تشبیبوں میں بہت معنویت اور گہرائی ہے۔ ان کی فکر رسا انھیں اس منزل تک لے جاتی ہے جہاں یہ راز افشا ہو جاتا ہے کہ حسن و عشق ایک ہی دریا کے گوہر ہیں اور ان میں ایک اتحاد معنوی پایا جاتا ہے:

غبار اس کا ابھی تک ڈھونڈتا پھرتا ہے لیلیٰ کو
الٰہی کیا تعلق تھا دل مجنوں کو لیلیٰ سے
وہ محو بے خودی تھے دیکھتے کچھ ہوش ہی کب تھا
عبث ہے پرسش انداز حسن یار موسیٰ سے
بہار آنے پہ جب کوئی کلی کھلتی ہے لالے کی
شکست قلب مجنوں کی صدا آتی ہے صحرا سے
جمال شاہد وحدت نے باندھی ہے ہوا ایسی
اڑا جاتا ہے دل بن بن کے ہر اک ذرہ صحرا سے
ہے حسن و عشق میں اک اتحاد معنوی باہم
برآمد دونوں یہ گوہر ہوئے ہیں ایک دریا سے

وہ اس عشق حقیقی کے متلاشی ہیں جو ہر عاشق کی قوت ارادی کا سرچشمہ ہے اور اسے ہر آزمائش میں ثابت قدم رکھتا ہے۔ دیکھیے دعائیہ تشبیب کے یہ اشعار جو نظم طباطبائی کی زمین میں ہیں:

مجھے اس بحر عشق سرمدی کا ایک قطرہ دے
کہ جس نے انبیاء کے چشمہ دل میں جگہ پائی
بوقت ذبح اسمٰعیل جس نے دلدہی کی تھی
خلیل اللہ کو دے دے کے تعلیم شکیبائی
یہی تھا باعث چاک قمیص حضرت یوسف
اسی نے تھی گواہی پاک دامانی پہ دلوائی
بھلا یوں بے ستوں کیا تیشۂ فرہاد سے کٹتا
اسی نے بازوؤں میں کوہکن کے دی توانائی

مناظر فطرت کے بیان اور موسم کی کیفیات میں بھی ان کا

اپنا رنگ نمایاں رہتا ہے۔ دیکھیے یہ بہاریہ تشبیب:

بہار برشگال آئی کہاں ہے ساقیِ مہ رو
جگا دے آج کی شب تو ذرا چلتا ہوا جادو
گھٹائیں ہر طرف امڈی ہوئی برسات کی راتیں
معاذ اللہ پھر اس پہ دل اسیرِ حلقۂ گیسو
برستا ہے لگاتار آج پانی بھر گئے جل تھل
ستم ہے اب بھی پیمانہ ہمارا گر نہ ہو مملو
بہار آ کے جوشِ باطنی کو تیز کرتی ہے
مری آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں متصل آنسو
نوید فصلِ گل سے ہو گئیں روحیں طرب آگیں
رگوں میں خونِ تازہ دوڑنے پھرنے لگا ہر سو

قصیدہ حسن و عشق در لغت کی تشبیب میں بہار کی منظر کشی ہے۔ سودا اور ذوق کی تقلید کی کامیاب کوشش ہے مگر اس پرانی ڈگر پہ چلتے ہوئے بھی عزیز نے اپنی انفرادیت کے نشان چھوڑے ہیں:

گھنے بال اس طرف سنبل نے کھولے بہر آرائش
گلابی مد بھری آنکھ اس طرف نرگس نے دکھلائی
نگار سبزہ نے مہد زمیں پہ کروٹیں بدلیں
ادھر آغوش میں گلشن کے لی بیلوں نے انگڑائی
جماہی آئی پھولوں کو ادھر ذکر صراحی سے
ادھر غنچوں نے شاخوں پہ ہر اک پور اپنی چٹکائی
نسیم عطر بیز گل نے کھولا باب مے خانہ
جہاں تک ہو سکا ساقی نے پی اور خوب پلوائی
سرور افزا چمن میں جم گھٹا ہے مہ جبینوں کا
کہیں معشوق تبریزی کہیں ترکان یغمائی

گرمی کی حدت و شدت کے بیان میں قصیدہ خورشید جہاں تاب کے یہ چند متفرق اشعار دیکھیے۔ کیا نقشہ کھینچا ہے۔ یہاں عزیز، انیس و دبیر کے مرثیوں کی منظر نگاری سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ آسمان و زمین تپ رہے ہیں اور عشاق کی حالت نہ پوچھیے باطن میں آتش عشق ہے اور خارج میں حدت آفتاب:

دیکھیے تو نفسِ گرم کی آتش خیزی
مثلِ شعلہ کے زباں کو ہے ذہن میں حرکت
جاتے ہیں آتشِ یاقوت کے شعلے تا چرخ
تشنگی سے یہ معاون کے ہوئی کیفیت
آتشِ عشق نے عشاق کو بس پھونک دیا
تھی ادھر حسن ادھر مہر مبیں کی حدت

درس اخلاق کو بہت سے شعرا نے تشبیب کا موضوع بنایا ہے۔ عزیز نے بھی اپنی تشبیبوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا ہے۔ 'آئینۂ عبرت' اور 'انقلاب ہستی' کی تشبیبوں میں دنیا کی بے ثباتی، اس کا جائے عبرت ہونا، سراب ہونا بیان کیا ہے اور فریب ہستی میں نہ آ کر فکر آخرت کرنے اور عمل صالح بجا لانے کی تلقین کی گئی ہے۔ کبھی وہ گور غریباں کا نقشہ کھینچ کر اہل ایمان کو دنیوی لذتوں سے احتراز کرنے کا درس دیتے ہیں۔ چند نصیحت پر مبنی یہ اشعار انقلاب ہستی سے نقل کیے جا رہے ہیں:

ہوشیار و باخبر اے سرخوشِ عہد شباب
تا کجا نظارۂ نیرنگیِ دارالخراب
کیا بساطِ خاک پر بستر نہ ہوگا ایک دن
میں نے مانا تو ہے زیرِ خیمۂ زریں طناب
تیری اس کی ایک منزل ایک بستر ہوگا کل
کیوں فقیروں سے ہے اے منعم تجھے آج اجتناب
خود پرستی سرکشی غفلت رعونت حرص و آز
نفس کو صحبت سے ان کی چاہیے ہے اجتناب

قصیدہ موسوم بہ شمع حرم میں انھوں نے مختلف مذاہب کے علما کا مناظرہ قلمبند کیا ہے۔ اس کی عالمانہ فضا عزیز کے علم و فضل کا بین ثبوت ہے:

روایت سے کوئی برہانِ ملی پیش کرتا ہے
درایت سے کوئی لاتا ہے استدلال دعوے پر
وہ کہتا ہے خلا ممکن ہے کہیے کیوں محال اس کو
دکھاتا ہے یہ اک سربند شیشہ قطعِ حجت پر
وہ کہتا ہے نظام عہد فیثاغورس اعلیٰ ہے
ارسطو اور بطلیموس تو ناداں تھے سرتاسر

'برق تجلی' میں وہ ایک صوفی بزرگ معلوم ہوتے ہیں جو علم و عرفان میں ید طولیٰ رکھتا ہو:

الٰہیات کے پڑھنے سے اے غافل نتیجہ کیا
نہیں ہے دل ترا جب جلوہ گاہِ نورِ عرفانی
کتاب النفس افلاطون اگر پڑھ لی تو کیا حاصل
حقیقت نفس امارہ کی جب اپنے نہ پہچانی
دم لغزش ید بیضائے دل سے لے مدد سالک
نہیں ہے دل ترا جب جلوہ گاہِ نورِ عرفانی
فنا فی العشق ہو جا جب کہیں یہ عقدہ حل ہوگا
ترا مافی الضمیر نفس ہے وہ راز پنہانی

لکھنویت کے اثرات:

لکھنویت کی اہم خصوصیت سراپا نگاری ہے۔ عزیز معشوق کا سراپا بیان کرتے ہوئے متعلقات محبوب کی تعریف بھی کرنے لگتے ہیں جو لکھنوی دبستان کا خاصہ ہے۔

غالب کی غزل کی زمین میں یہ اشعار اور بعض دیگر اشعار بھی دیکھیے۔ جن کی تشبیبوں میں لکھنویت کے آثار نمایاں ہیں:

دود پیہا میں نے چند آہیں جو کی تھیں ہجر میں
وہ جواب گنبدِ گردونِ گرداں ہو گئیں
اُف جوانی میں کسی بدمست کی انگڑائیاں
باعثِ خمیازۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

نہ سمجھو خالِ مشکیں اے حسینو اپنے عارض پر
دل شب آ گیا ہے دیکھ کر انداز دلداری
ہزاروں دے دیے دشنام اپنے جذبۂ دل کو
رقیب رو سیہ کے گھر اگر وہ ہو گیا مدعو

عزیز کے یہاں گریز میں برجستگی اور بے تکلفی ہے۔ گریزوں میں ربط اور حسین پیوندکاری ان کی فنکارانہ صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے۔ زیادہ تر وہ تشبیب کے بعد ساقی نامے سے گریز کرتے ہیں۔ جب وہ حضرت رسول خدا اور حضرت علی کی مدح ایک ساتھ کرتے ہیں تو انھیں دوہری مدح کی خاطر دوہری گریزوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مختصر گریز کی ایک مثال دیکھیے:

پکارتے ہیں خراباتیان مے خانہ
تجھی کو یا اسداللہ حیدر کرار

ان کے قصیدوں میں مدح کے بھی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ بے جا مبالغہ آرائی سے وہ دامن بچاتے ہیں۔ اکثر صاف ستھری زبان میں سادگی کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتے ہیں۔ البتہ بعض جگہوں میں عربی و فارسی کے ادق الفاظ و اصطلاحات کی بھرمار ملتی ہے۔

قصیدہ فتح الباب در تہنیت فتح خیبر میں مدح کا انداز دیکھیے:

شعلہ ہوئیں دیواریں خیبر سے دھواں اٹھا
بجلی جو ادھر چمکی شمشیر دو پیکر کی
وہ تیغ زباں آور وہ تیغ ظفر پیکر
وہ تیغ قضا گستر جو ملک ہے حیدر کی

مذکورہ اشعار میں عزیز نے حضرت علی کی ذوالفقار کی تعریف میں بڑے جوش و خروش اور طنطنے کا ثبوت دیا ہے۔

عزیز کو فکر عقبیٰ بے چین رکھتی ہے۔ انھیں صلۂ دنیا نہیں آخرت میں سرخروئی درکار ہے۔ لہٰذا وہ خلوص و عقیدت میں ڈوب کر دعا کرتے ہیں۔ یہ مختصر دعا کبھی اپنی ذات کے لیے ہوتی ہے اور کبھی قوم و ملک کے لیے۔ وہ اپنے ممدوحین کے اعلیٰ مراتب سے بخوبی واقف ہیں۔ لہٰذا یہ احساس بھی انھیں ستاتا ہے کہ ان سے حق ادا نہ ہو سکا:

خدا ہے تیرا معترف رسول تیرے جانثار
ادا ہو حقِ مدح کیا غلام کے غلام سے

حواشی

1. لکھنؤ کا دبستان شاعری: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ص 797، مکتبہ علم و فن، ضیا محل دہلی، 1965
2. ایضاً، ص 806
3. قصیدہ نگاران اتر پردیش: علی جواد زیدی، ص 198، اتر پردیش اردو اکادمی، پہلا ایڈیشن، 1978

■

Dr. Syed Hasan Kumaili, 32-D, Babul Ilm Lane, Noor Nagar Extn., New Delhi - 25

وجودی عشق کا شاعر

میلہ رام وفا

احمد سہیل

پنڈت میلہ رام وفا: ادیب، شاعر ماہر عروض، ناول نویس، فلمی گیت نگار، صحافی، اور انھیں پنجاب کا 'راج کوی' بھی کہا جاتا ہے۔

ان کی پیدائش 30 جنوری 1895 میں سیالکوٹ (پنجاب، پاکستان) کے ایک گاؤں 'دیپوکے' میں ہوئی۔

میلہ رام وفا کا انتقال انیس ستمبر 1980 میں جالندھر، بھارت میں ہوا۔ (کہیں ان کا سال وفات 1990 بھی لکھا گیا ہے)۔

1944 میں اوپندر ناتھ اشک کے لاہور سے ممبئی جانے سے قبل انھوں نے اشک صاحب سے اردو ادب کی تربیت لی اور رموز سیکھے۔

میلہ رام وفا نے 1943 میں ایک فلم 'پگلی' میں قمر جلال آبادی کے ساتھ گیت لکھے۔ ان کے لکھے ہوئے گانوں کو شمشاد بیگم نے گایا تھا اور اپنے زمانے کے مایہ ناز موسیقاروں جھنڈے خان، گووند رام، امیر علی اور رشید عطرے نے اس کی موسیقی ترتیب دی۔ اس فلم کی نمائش لاہور کے 'رٹز' سینما میں ہوئی تھی۔ فلم 'پگلی' کے تین گانوں کے مکھڑے یہ تھے:

...پے جا... پے جا... کبھو روج (روز) لوٹ کر جوانی لے جا

... حسن کی یہ مہربانی پھر کہاں... عشق کی یہ کامرانی پھر کہاں

...او میں آیا... میں آیا میں آیا نہ جائیو...

ان کے دوستوں میں حفیظ جالندھری، صوفی تبسم، دین محمد تاثیر، موہن سنگھ دیوانہ، عبدالمجید سالک، ظفر علی خان، امتیاز علی تاج، ہری چند اختر، یگانہ چنگیزی کنہیا لال کپور، فکر تونسوی اور گوپال متل شامل ہیں۔

لاہور سے شائع ہونے والے اخبار 'بھارت' کے مدیر رہے۔

میلہ رام وفا کے تصنیفی اور تالیفی کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے:

میلہ رام وفا ایک سیکولر، انسان دوست ادیب و شاعر تھے۔ تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ وہ اردو کے سچے عاشق تھے۔ ان کی مولانا ظفر علی خان سے گہری دوستی تھی حالانکہ ظفر علی خان اور میلہ رام وفا کے درمیان بہت گہرے سیاسی اور نظریاتی اختلافات بھی تھے۔ وفا صاحب کا تا حیات ظفر علی خان سے احترام اور محبت کا رشتہ کم نہیں ہوا۔ ظفر علی خان ان کی شاعری کو پسند ہی نہیں کیا کرتے تھے بلکہ ان کی شاعری سے متاثر بھی رہے۔ وہ اردو کے آزمودہ شعرا کو وفا صاحب کا یہ شعر سنایا کرتے تھے:

توڑتا ہے شاعری کی ٹانگ کیوں اے بے ہنر!
جا سلیقہ شاعری کا سیکھ میلہ رام سے

میلہ رام وفا انگریز سامراج کے سخت خلاف تھے۔ بحیثیت صحافی انھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف اخبارات میں شدید قسم کے مضامین لکھے۔ نثر کے علاوہ انھوں نے انگریز حکومت کے خلاف ایک سخت اور باغیانہ نظم 'اے فرنگی' لکھی۔ تو برطانوی سرکار نے ان کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا اور دو سال کی قید با مشقت کی سزا بھی سنائی گئی۔ اس نظم کے چند اشعار سنیے:

اے فرنگی کبھی سوچا ہے یہ دل سے تو نے
اور یہ سوچ کے کچھ تجھ کو حیا بھی آئی

تیرے قدموں سے لگی آئی غلامی ظالم
ساتھ ہی اس کے غریبوں کی بلا بھی آئی

تیری سنگینیں چمکنے لگیں سڑکوں پہ جوں ہی
لب پہ مظلوموں کی فریاد ذرا بھی آئی

وفا کی شاعری میں انسانی منافقت کے بہت سے روپ بہروپ سامنے آتے ہیں۔ انھیں انسان کے چہرے پر انسان کے نقوش نہیں ملتے وہ اپنے رقیب سے بھی شکوہ نہیں کرتے ہیں کی اسے میرے محبوب کا خیال رہتا ہے اور یہی خیال ان کو اندر سے مار دیتا ہے اور ان کی عاشقانہ جدلیات عقلیت سے نبرد آزما ہو کر رنجیدہ اور اداس ہو جاتی ہے۔ جو ایک رومانی فہم اور بے رنگ آسمان کی طرح ان پر مسلط ہے یہ ان کی رومانی واردات کو بکھیر دیتی ہے لہٰذا وہ واہموں کے مجسمے تراش کر اسے اپنے ہاتھوں سے پاش پاش بھی کر دیتے ہیں اور یہ پسپائیت کا عمل حقیقت کا عرفان تو نہیں بنتا لیکن ان کے یہاں ان کے قریبی لوگوں نے ہی ان کو ریزہ ریزہ کیا کیونکہ ان کی واہماتی حقیقت باہر کی اجتماعی نفسیات اور عمرانیات اور اس کے میکانی مزاج سے انسلاک نہیں کر پاتی:

ترا ہی خیال ان کو آٹھوں پہر ہے
مجھے میرے ہی ہم خیالوں نے مارا

ان کے یہاں موت کی اپنی لذت ہے۔ میلہ رام وفا کے یہاں اس لذت میں کوئی گھٹن نہیں ہے۔ اور موت کو زندگی کی آگاہی تصور کرتے ہیں۔ وہ فنا اس طور پر چاہتے ہیں کہ ان کا غم والم اور اداسی سے نجات کے لیے وہ موت کے خواہاں ہیں۔ یہی ان کی شاعرانہ فکر ہے۔ اس میں جمالیات بھی پوشیدہ ہے۔ موت ان کے لیے غم کا علاج ہے مگر موت اتنی آسانی سے نہیں آتی اور اس عمل میں ان کے ساتھ بڑے تکلیف دے حادثات کا سلسلہ جڑا ہوا ہے۔ جو اصل میں ان کی زندگی اور موت کے درمیاں ایک ایسا مکالمہ ہے، جس میں زخم بھی ہیں، انبساط شوخیاں بھی ہیں۔ ان کی موت میں شفاعت نہیں ہے اسی سبب سے ان کے سسکتے شاعرانہ لہجے میں جو احساس ملتا ہے وہ قاری کو خوف زدہ کر دیتا ہے۔ فانی بدایونی کی طرح وہ

موت کونہیں بلاتے میلہ رام وفا کی یاسیت میں وہ موت کے تصور کے ساتھ زندگی کی مسکراتی اٹھکیلیاں کرتے ہیں۔

موت علاج غم تو ہے موت کا آنا سہل نہیں
جان سے جان سہل سہی جان کا جانا سہل نہیں

میلہ رام وفا کی شاعری میں رقیب بھی بڑا ظالم اور کٹھور ہے۔ ان کی واردات عشق عمیق ہے وہ افقی بھی ہے اور عمودی بھی ہے۔ مگر ماتم عشق میں ان کو اپنے محبوب کے نئے چاہنے والے نے ماردیا ان کے سینے میں حسرتیں بھری ہوئی ہیں۔ اور یہی حسرتیں مل کر ان کے وجود کو درہم برہم کردیتی ہیں کیونکہ انھیں 'آٹھوں پہر' محبوب کا ہی خیال رہتا ہے۔ وہ اپنی دینی کیفیت کو ہی مورد الزام قرار دیتے ہیں کہ ان کا کوئی باہر سے قاتل نہیں بلکہ ان کے خیالات نے ہی انھیں ماردیا۔ ان کے اندر کی کائنات کوان کے عشق اوران کے خیالات نے انھیں برباد کرکے ریزہ ریزہ کردیا۔ ان کے خیال میں انھوں نے خودکوفنا کردیا۔ ان کے رقیب نے یاکسی اور نے ان کو نہیں مارا۔ وہ تو خود اپنے ہی ہاتھوں مرگئے۔ میلہ رام وفا کے یہاں ایک وجودی عشق کی جمالیات منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ شعری اظہار میں اچھوتا پن ہے۔ جس میں قاری ایک لطیف احساس میں ان کی واردات ذات کو باآسانی ادراک میں لے لیتا ہے۔ لگتا ہے میلہ رام وفا کو زیست کی بے ثباتی کا احساس بہت گہرا ہے۔ اپنے انسان ہونے کے احساس نے ان کے دل میں اذیت ناکی برپا کردیتی ہے۔ وہ بقائے دوام کے متمنی ہیں اور یہ صورتحال خاصی دردناک ہے جہاں انسان اندر کے انسان کو سمجھ نہیں پاتا کیونکہ انسان کو 'شے' تصور کرلیا گیا ہے:

ترا ہی خیال ان کو آٹھوں پہر ہے
مجھے میرے ہی خیالوں نے مارا

وہی ہے اگر اسے وفا نظم ہستی
تو کیا معرکہ مرنے والوں نے مارا

خاک ہوجانے کی خبراور محبوب تک دیر سے پہنچنے کا شکوہ ہمیشہ اردو شاعری کا دلچسپ اوراہم موضوع رہا ہے۔ اس میں اپنی زندگی کے معدوم ہونے کا احساس گہرا ہے اور لمحوں میں ان کی روح ہوامیں تحلیل ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے سنگدل محبوب کے سلسلے میں اپنے طور پر مفروضات قائم کرلیتے ہیں کہ شاید ان کا دلدار ان کی خبر لینے نہیں آئے گا۔ مگر کوئی نہ کوئی ان کا احوال اور حال دل ان کے معشوق تک پہنچادے گا۔ ان کے یہاں وجودی نوعیت کے اشارے بہت واضح اور عمیق ہیں۔ اور ان تصورات کواپنے تجربات اور معاشرتی مشاہدات کی روشنی میں میلہ رام وفا نے زندگی اور موت کے مابین شعری پیکر میں بڑے موثر انداز میں بیاں کیا ہے۔ یہ حقیقت وجودی فلسفے میں 'موت' کا تصور خاصا 'لایعنی' ہے۔ کوفرد کے مرنے کے ساتھ دنیا بھی مرجاتی ہے یہی وجودی فلسفے کا تصورفنا ہے۔ یہ ایک مابعد الطبعیاتی اور الہیات شکن تصور بھی ہے۔ مرنے کے بعد انسان کی جسمانی موت نہیں ہوتی بلکہ مرنے والے کے ساتھ پوری کائنات دم توڑدیتی ہے اور یوں شاعر کی داستان ذات بھی ختم ہوجاتی ہے۔

میلہ رام وفا کی شاعری میں تنہائی کا عنصر گہرا ہے جو زندگی کی معروضیت کا پھسپھسا پن اور اس کے رائج مفاہیم میں پیچیدگی کے سبب الجھ کر انھیں تذبذب کا شکار کردیتے ہیں۔ اور یہی کیفیت ان کے تخیل میں نئے قیاسی تجربے تشکیل کرتے ہیں۔ یوں ہر جامد چیز بھی مصنوعی اور میکانی طور پر حرکت میں لائی جاتی ہے۔

میری دنیا مری زندگی تک ہی ہے اور اک دن میری موت کے ساتھ ہی خاتمہ میری دنیا کا ہوجائے گا میری دنیامرے ساتھ مرجائے گی۔

ان کی زندگی کی آرزوئیں شہروفا ان کے اندر گھٹ گھٹ کردم توڑدیتی ہیں...

زندگی کونہ ہے آرزو کووفا حسرت آگیں ہے دونوں کا شہر وفا
زندگی آرزو میں گزرجائے گی آرزو دل میں گھٹ گھٹ کے مرجائے

میلہ رام وفا کی شاعری کا یہ امتیاز ہے کہ وہ تناقض کی فضا میں اشعار کی تزئین کرتے ہیں اورفرد کے اظہار کو اپنے طور پراس کو بیاں کرتے ہیں کہ ان کی ذہانت کی کوئی وقعت نہیں ہے اور محبوب کے اس شکوے کو وہ تسلیم نہیں کرتے کہ وہ کچھ نہیں کہتے اور نہ بولتے ہیں۔ بلکہ محبوب کو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو یہ التباس اوردھوکہ ہے۔ کہ 'میں کچھ نہیں کہتا'۔ محب اپنے محبوب سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر وہ کہہ پاتے۔ کیونکہ ان میں کچھ کہنے کی عادت ہے۔ ان کے شعری اظہار میں 'تشکیلی ابہامیت' بہت ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر وہ نہ جانے کیوں کچھ کہتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ شاید وہ 'غیر' کی تعریف نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ان کے خیال میں ان کا محبوب 'ناسمجھ نافہم' ہے۔ وہ کچھ نہیں سنتا اور شاعر کو کچھ نہیں کہتا۔ یہی ان کے شعری رویے اورمزاج کا المیہ ہے۔ جس میں انسان کا مکالماتی لہجہ ٹوٹا پھوٹا ہے۔ کیونکہ ان کا معشوق 'بت شکوہ اغیار' میں خاموش ہے:

کہنے کا تو اپنے ہے وفا آپ کے قائل
کہنے کو یہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

میلہ رام وفا کی شاعری بنیادی طور پر زندگی کی رومانی اور حسیاتی حقیقتوں کا بیاں کرتی ہیں۔ جس کے دو پہلو وجدان اور تشکیک کی صورت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جوان کا شاعرانہ صداقت کی سند بھی ہے اور تخیل کا ادراک بھی ہے۔ جوانسانی کیفیات کوخلق بھی کرتی ہے۔ جو شاعر کی خواہش میں ایک زندہ قوت اور شاعرانہ استعارہ ہے۔ اس کے بغیران کی شاعری سکوت وجمود کا شکار ہوجاتی ہے۔ ان کے شاعرانہ جذبات اور واردات انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی حسیت میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ان کی اپنی شناخت اتنی اہم نہیں ہے۔ بلکہ 'شعورذات' کی توسیع ہے لیکن ان کا شاعرانہ وجدان معروضی ہے:

لبوں پہ جان زار آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے
یہ دنیا اب مجھے جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

ایک بار اس نے مجھے دیکھا تھامسکرا کر
اتنی تو ہے حقیقت باقی کہانیاں ہیں

میلہ رام وفا کی شاعری میں تنہائی کا عنصر گہرا ہے جوزندگی کی معروضیت کا پھسپھسا پن اوراس کے رائج مفاہیم میں پیچیدگی کے سبب الجھ کر انھیں تذبذب کا شکار کردیتے ہیں۔ اور یہی کیفیت ان کے تخیل میں نئے قیاسی تجربے تشکیل کرتے ہیں۔ یوں ہر جامد چیز بھی مصنوعی اور میکانی طور پر حرکت میں لائی جاتی ہے۔ ان کی شعری جمالیات میں عمرانیاتی نوعیت کی نقش نگاری اور علامتی سطح پر انسان کی خوش گوارزندگی کا التباس بھی پوشیدہ ہے۔

■

Mr. Sohail Ahmed Khan(Ahmed Sohail)
225, Trail Holl ow Lane
Palestine, TX 75801 (USA)
Cel:9037290786
Email: sohailkhan_1999@yahoo.com

شاعرِ خوش کلام
تربھون پرساد سریواستو انجام

احترام اسلام

آنجہانی تربھون پرساد سریواستو المتخلص بہ انجام الہ آباد کے ایک ایسے شاعر تھے جنھیں ان کی صاف ستھری اور عمدہ شاعری کے ساتھ ہی اردو تہذیب میں رچی بسی ان کی شخصیت کے لیے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے وہ اہل الہ آباد کی پسند کی کسوٹی پر اس لیے ہرگز نہیں کھرے اترتے تھے کہ انھیں مشاعروں کے اسٹیج پر سامعین کی تالیاں حاصل کرنے میں ملکہ نصیب تھا۔ ان کے وقار کی مطلق وجہ یہ بھی نہیں تھی کہ انھیں اعلیٰ عہدوں اور منصبوں پر فائز مقتدر حضرات کی پشت پناہی حاصل تھی۔ یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ انجام نے میدانِ شعرگوئی میں اپنی سبک خرامی کا ثبوت دیتے ہوئے لمبی چوڑی مسافتیں بھی نہیں طے کی تھیں اور نہ ہی کسی ادبی تحریک سے ان کی فعال وابستگی ہی تھی جسے ان کی مقبولیت کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکے۔ بربنائے تذکرہ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ انجام صاحب کو شاعر کی حیثیت سے مقامِ افتخار دلوانے میں ان چونکانے والے شعری تجربات کا بھی ہاتھ نہیں تھا جو ہمیں شاعری کے مندرجۂ ذیل نمونوں سے متعارف کرواتے ہیں:

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی

(ندا فاضلی)

یا:

ہم بھی گئے تھے گرمیِ بازار دیکھنے
وہ بھیڑ تھی کہ چوک میں تانگہ الٹ گیا

(ظفر اقبال)

سوال قائم کیا جاسکتا ہے کہ انجام صاحب نے یہ سب نہیں کیا تھا تو پھر عزت و وقار کا تاج ان کے سر تک پہنچا کیسے؟ جواباً عرض کیا جاسکتا ہے کہ تربھون پرساد سریواستو انجام جیسے سادگی پسند، خاموش طبع اور گوشہ نشین قسم کے شاعر نے سخن وری کی راہ سے عزت کمائی تھی تو محض اس وجہ سے کہ ان کے پاس شعر و ادب کی خدمت کا سچا جذبہ تھا۔ شاعری کی جوت جگائے رکھنے کی سچی آگ تھی۔ شعرگوئی کے تئیں نیک نیتی اور اخلاص تھا۔ یہ باتیں کرتے ہوئے مجھے اپنے مرحوم بزرگ اور محترم دوست خان ارمان کی یاد بھی آرہی ہے جو کہا کرتے تھے کہ ایک شاعر اگر اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ وہ اچھے اور معیاری شعر کہتا ہے تو دوسرا خادمِ شعر اس لیے بھی اہم ہوسکتا ہے کہ وہ شاعری کے لیے سازگار ماحول تیار کرتا ہے، موافق فضا بناتا ہے۔

الہ آباد کی ادبی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس طرح کی ماحول سازی میں حضرت نوح ناروی کے زمانے سے لے کر اب تک ہندو کائستھ برادری سے تعلق رکھنے والے شاعروں نے زبردست رول ادا کیا ہے۔ جناب تربھون پرساد انجام نہ صرف اسی برادری کے ایک فرد تھے بلکہ انھوں نے دل میں اتر جانے والی اپنی عمدہ شاعری سے اردو کی شعری فضا کو گرمی بخشتے ہوئے مذکورہ ماحول سازی کے پرچم کو سرنگوں ہونے سے بچائے رکھنے کا حوصلہ بھی دکھایا تھا۔ حضرت نوح ناروی کا ذکر آگیا ہے تو عرض کرتا چلوں کہ ان کی حیثیت ایک مستند شاعر اور استاذ الشعرا کی تو تھی ہی، انھیں ان کے اپنے منفرد لہجے کے لیے بھی شہرت حاصل تھی۔ سہل ممتنع یعنی عام بول چال کی زبان میں کی جانے والی شاعری سے ان کی غزلوں کی پہچان کی جاتی تھی۔ ان کی شاعری کے اس وصف کو ان کے شاگردوں نے اپنایا اور پھر شاگردوں کے شاگردوں نے بھی۔ اس طرح اردو شاعری میں نوح اسکول کی بنیاد پڑگئی۔ نوح شاگردوں کے معاملے میں بھی خوش نصیب تھے۔ بتاتے ہیں کہ ان کے شاگردوں کی تعداد درجنوں میں نہیں سیکڑوں میں تھی۔ خود الہ آباد میں ان کے درجنوں شاگرد تھے۔ پھر ان شاگردوں کے بھی شاگرد ہوئے اور ان میں سے بھی بیشتر نے نوح اسکول کی ہی پیروی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ الہ آباد میں اردو شاعری بالخصوص نوح کے لہجے کی غزل گوئی کا ایسا ماحول تیار ہوا جو آشوبِ زمانہ کا شکار ہونے کے باوجود آج بھی کسی نہ کسی روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے اور آج بھی مشاعروں اور شعری نشستوں کے انعقاد اور شعری مجموعوں کی اشاعت (ناگری رسم الخط میں ہی سہی) کا سلسلہ بدستور قائم ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کائستھ برادری سے تعلق رکھنے والے اردو کے ہندو شاعروں کی ایک بڑی تعداد نہ صرف یہ کہ حضرت نوح ناروی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھی بلکہ ان پر جان بھی چھڑکتی تھی۔ استاد کے تئیں عقیدت اور احترام تو ہر مذہب و ملت میں اہمیت کا حامل ہے تاہم ہندوؤں میں استاد کی تعظیم اور اس کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کا جو جذبہ نظر آتا ہے، وہ بے مثال ہے۔

انجام صاحب کا سلسلہ نوح صاحب سے یوں تھا کہ وہ شاگردِ نوح حضرت مہیش پرساد سوگ اور ان کے نہ رہنے پر ان کے فرزند ارجمند و شاگرد جناب رامیشور ناتھ عیش سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ جہاں تک انجام کی شاعری کے مزاج کا تعلق ہے، ظاہر ہے، اسے نوح اسکول ہی سے نسبت ہے اور اسے خالص روایتی شاعری کے زمرے میں ہی جگہ دی جائے گی۔ جدید شاعری کے پس منظر میں روایتی شاعری کو حاشیے پر ڈالنے کا اصرار اور جواز اپنی جگہ لیکن دل کو چھونے والی اور ہمارے جذبات کو جھنجھوڑنے والی شاعری آج بھی ہمارے حافظے کا حصہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر شعر کو پرکھنے کی کسوٹی یہ ہو کہ وہ ہمارے دل و دماغ کو کس حد تک اپنی گرفت میں لے سکتا ہے اور اس کا تاثر کتنی دیر تک ہمارے حواس پر قائم رہتا ہے تو ہم انجام کی شاعری کو ایک باوقار مقام دینے کے لیے مجبور ہوں گے۔ کچھ مثالیں حاضر ہیں:

اب روشنی میں آئی ہے دیوانگی مری
وحشت میں چار چاند لگائے بہار نے

انجام غم کے ساتھ ہے خوشیوں کا سلسلہ
کھولا یہ راز گردشِ لیل و نہار نے

یہ اہلِ عشق ہیں ان کے نرالے کام ہوتے ہیں
اسی جانب یہ جاتے ہیں، نہیں جاتا جدھر کوئی

غالب کے مصرعے پر گرہ لگاتے ہوئے انجام نے کیا خوب شعر نکالا ہے، اسے بھی دیکھتے چلیے:

تجھ کو اے دل جو تڑپنا ہے تو اس طرح تڑپ
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اسی زمین میں ایک اور شعر ہے:

ایک آنسو بھی شبِ ہجر نہ بہنے دوں گا
دولت عشق ہے یہ اس کو لٹائے نہ بنے

شخصیت کے اعتبار سے انجام صاحب ایک انتہائی مخلص، وضع دار، منکسر المزاج، نیک طینت اور فرشتہ صفت انسان تھے اور آدمیت کے پرستار بھی۔ چنانچہ ان کے یہاں آدمی اور آدمی کے مرتبے کو موضوع بنا کر کہے گئے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے:

آدم کو فرشتوں نے سجدے پہ کیے سجدے
معیارِ بشر کیا ہے سمجھے یہ بشر کوئی
کون ہوں، کیا ہوں، زمانے میں مرا کیا ہے مقام
یہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے زمانے والے

اس سلسلے میں انجام صاحب کا یہ قطعہ بھی توجہ کا مستحق ہے:

زندگی یہ کوئی شراب نہیں   جو ہے طاری سرور، ہے ناحق
جسمِ خاکی پہ ناز اس درجہ   اس پہ اتنا غرور ہے ناحق

آدمیت کا دامن پکڑنے والا شخص عشق کی عظمت سے کیوں کر انکار کر سکتا ہے اور اسی لیے وہ عشق کی دنیا کو تاریک نہیں ہونے دینا چاہتا۔ ایسے ہی ایک شخص کے روپ میں انجام صاحب مشورہ دیتے ہیں:

عشق کی دنیا بہت تاریک ہے
دل جلا کر کچھ اندھیرا کم کریں

عشق کے بندوں کا مقام ان کی نگاہ میں کیا ہے یہ ان کے اس شعر سے بھی واضح ہے:

جو عشق کے بندے ہیں، حال ان کا نرالا ہے
اس سمت وہ جاتے ہیں، جائے نہ جدھر کوئی

روایت سے بغاوت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ہم جوش میں آتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ روایت کا پاسدار شاعر یا فنکار بھی اسی دنیا کا باشندہ ہے اور وہ بھی درپیش عصری مسائل سے اسی طرح دوچار ہوتا ہے، جیسے کہ کوئی جدیدیت کا شیدائی۔ وہ بھی انھیں الجھنوں اور دشواریوں سے نبرد آزما ہوتا ہے جن سے نئے اقدار کا کوئی پیرو اور اسی لیے ممکن ہے، ایک روایتی شاعر مسائل حاضر پر شعوری طور سے توجہ دینے کا قائل نہ ہو لیکن لاشعوری طور پر وہ حالات سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اپنے ردعمل کا اظہار بھی کرتا ہے۔ انجام کی شاعری کا بیشتر حصہ بلاشبہ وارداتِ قلب اور معاملاتِ حسن وعشق پر مشتمل ہے لیکن ان کے قلم کی نوک سے ایسے اشعار بھی گاہ گاہ نکل آئے ہیں جو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کہے ہوئے لگتے ہیں:

کوٹھیاں بنوا رہے ہیں اس طرف سرمایہ دار
خون چوسا جا رہا ہے، اس طرف مزدور کا
کہاں خوشیوں کا باقی کوئی ساماں ہے جہاں میں ہوں
فضا غمگین، ہر ذرہ پریشاں ہے، جہاں میں ہوں

اتنا کچھ کہنے کے باوجود میں شاید آپ کو انجام کی شاعری کے اصل چہرے سے ناشناس و نابلد ہی رکھوں گا اگر میں اس میں سے کچھ نمونے ان اشعار کے نہ پیش کروں جن کا تعلق وارداتِ قلب اور معاملاتِ حسن وعشق سے اور اس شوخیِ قلم سے ہے جو اردو شاعری میں شیخ و برہمن اور ناصح و واعظ سے روا رکھی جاتی رہی ہے۔ حاضر ہیں ایسے اشعار کے نمونے:

رکنا دلِ حزیں کا بہت کام آگیا
ان کو بھی چین مجھ کو بھی آرام آگیا
کیا جس دن سے وعدہ اس پری رونے، اسی دن سے
سجاتا ہوں میں سپنے، توڑتا ہوں، پھر سجاتا ہوں
کھنچ کے خود آئے گا صحرا، جو جنوں ہے کامل
کیا ضرورت ہے کہ میں جاؤں بیاباں کی طرف
تم نہ آئے شبِ غم، تو آکر قضا
تلخیِ ہجر میں چارہ گر ہوگئی
چاندنی شب میں جہاں بھی وہ نظر آئے ہیں
چاند کو ہم نے پشیماں وہیں دیکھا ہے
کوئی دیکھے تو یہ اعجاز تصور میرا
ہجر کی شب بھی انھیں اپنے قریں دیکھا ہے
دیکھیے کیا ہو مرے جوشِ جنوں کا انجام
ہاتھ تو بڑھ ہی گئے جیب و گریباں کی طرف
نصیحت شیخ صاحب جب لگے دینے تو میں بولا
سمجھ میں یوں نہ آئے گی ابھی میں پی کے آتا ہوں

انجام کی شاعری کے تعلق سے کی گئی اپنی اس گفتگو کی توسیع میں اس حقیقت کے اظہار سے کرنا چاہوں گا کہ انجام صاحب ایک مذہبی شخص تھے اور اپنے مذہبی ہونے پر انھیں فخر بھی تھا۔ اپنے عقیدے کا برملا اظہار کرنے میں انھیں ذرا بھی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ فرماتے ہیں:

عشقِ بتاں میں مانا نہ ہم کو خدا ملا
لیکن خدا سے ملنے کا اک راستہ ملا

شعر کی گہرائی میں اتریے تو آپ کو بت پرستی کے جواز کا خوب صورت اعلان نظر آئے گا۔ رام کے تئیں اپنی بھکتی اور عقیدت کا اظہار بھی انجام صاحب نے اپنے اشعار میں کیا ہے:

حاصل نجات ہوگی گناہوں سے بالیقیں
ہونٹوں پہ وقتِ نزع اگر رام آگیا
فرصت کبھی ملے گی نہ دنیا میں کام سے
بہتر ہے تھوڑی دیر کرو یاد رام کو

رام کی نسبت سے ایک اور شعر انجام کی فکر کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا ہے جو اس اعتبار سے انتہائی اہم ہے کہ وہ ان لوگوں کے لیے بجائے خود ایک آئینے کی طرح ہے جو ہوسِ اقتدار سے مغلوب ہو کر رام کے نام کا استعمال سماج میں تفریق پیدا کرنے کے لیے کرتے ہیں:

سمجھیں تو آپ غور سے ان کے مقام کو
محدود کیجیے نہ ایودھیا میں رام کو

آیئے واپس لوٹیں انجام کی شاعری کی جانب اور غور کریں ان کے مندرجہ ذیل شعر پر جو ان کے شخصی مزاج اور عقیدے کی وضاحت کے لیے کافی ہے:

ہے ذات ایک اسے رام یا رحیم کہو
ہے بات ایک ہی کر پالو یا کریم کہو

مختلف فرقوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگوں کے درمیان باہمی میل ملاپ، یگانگت اور بھائی چارہ کے اصول کا قائل ہمارا یہ پیارا شاعر اس دارِ فانی سے 9 اگست 2011 کو رخصت ہوگیا۔ انجام کا جنم الہ آباد کے قصبہ سوراؤں میں جناب راج بہادر کے گھر 26 جولائی 1936 کو ہوا تھا۔

انجام صاحب کا واحد مجموعۂ کلام 'گردشِ شام وسحر' ان کی زندگی ہی میں 2009 کے دوران شائع ہوا تھا۔ مجموعے کی وجہ تسمیہ وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''چونکہ میں اپنی زندگی کے زیادہ تر حصوں میں پریشانیوں سے گھرا رہا ہوں، اس لیے میں نے اس مجموعے کا نام 'گردشِ شام وسحر' رکھنا ہی مناسب سمجھا۔''

شعر و ادب کی دنیا میں انجام صاحب نے اپنا تعارف انجام الہ آبادی کے روپ میں ہی پیش کیا۔ مذکورہ کلام پر بھی شاعر کے نام کی جگہ انجام الہ آبادی ہی تحریر ہے، ان کا اصل نام تربھون پرساد سریواستو ہے۔

قابل ذکر ہے کہ انجام صاحب کے مجموعۂ کلام کی تحریر کا رسم الخط ناگری ہے۔ فارسی رسم الخط میں ان کا کوئی بھی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ایم اے قدیر نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے بجا طور پر رائے دی ہے: ''ضرورت ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت اردو میں بھی ہوتا کہ جب معاصر شاعری پر کوئی ریسرچ کرے تو انجام صاحب نظر انداز نہ ہو جائیں۔''

مناسب محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنی گفتگو کا اختتام شاعر انجام کے اس شعر کے ساتھ کروں:

یہ دنیائے محبت ہے الگ آئین ہے اس کا
دیے کو طاق پر رکھ کر یہاں میں دل جلاتا ہوں

■

Ehteram Islam, 635/547, Attaersuiya
Allahabad - 211003 (UP)
Mob.:9839814279

شیخ رحمن اکولوی

یادیں عصمت چغتائی کی

عام طور پر جس عمر میں نوجوانوں کو فلم اسٹارز اور کرکٹرس سے ملاقات کرنے کا اشتیاق ہوتا ہے مجھے اردو کے نامور قلم کاروں سے ملنے کا شوق تھا۔ اسی شوق کی انگلی پکڑ کر میں ایک دن ممبئی میں عصمت چغتائی کے دولت کدہ انڈس کورٹ جا پہنچا۔ شفقت سے ملیں۔ انھیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں ان سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لیے ٹرین کا بارہ گھنٹے کا سفر طے کرکے ممبئی پہنچا ہوں۔ ان کا فلیٹ اوپری منزل میں تھا۔ گیلری میں مجھے بٹھایا اور خود اندر کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے سامنے والے کمرے میں نظریں دوڑائیں تو دیکھا ایک بھاری بھرکم پلنگ بچھا ہوا ہے پاس ہی لکڑی کا بنا گول گھومنے والا کئی خانوں کا ریک رکھا ہوا ہے جس میں کتابیں رکھی ہوئی ہیں وہیں ٹیبل پر لیمپ ہے اور سامنے کرسی ہے (غالباً وہ یہیں بیٹھ کر لکھتی پڑھتی ہوں گی۔ ضرورت پڑنے پر ریک کو گھمایا اور اپنے مطلب کی کتاب حاصل کر لی) اسی ٹیبل پر جناب شاہد لطیف کی تصویر خوب صورت فریم میں جلوہ افروز تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھوں میں چائے کے کپ لیے ہوئے حاضر ہوئیں۔ چائے نوشی کے دوران باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے پوچھا ''کب سے لکھ رہے ہو؟'' کام کیا کرتے ہو؟ وہ پوچھتی گئیں میں جواب دیتا گیا۔ وہ بولیں ''اکولہ کہاں ہے؟'' میں نے بتایا کہ اکولہ شہر ناگپور اور بھساول شہر کے درمیان ریلوے جنکشن ہے۔ میں نے جب انھیں بتایا کہ میں طنز و مزاح لکھتا ہوں تو اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ معیاری طنز و مزاح کم لکھا جا رہا ہے۔ اچھا لکھنے والے تو گنتی کے ہیں۔

میں نے جب ان سے ذکر کیا کہ میں پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں وہ بولیں ''تم خواجہ عبدالغفور پر پی ایچ ڈی کرو کافی کام ہے ان کا، شریف آدمی ہیں۔ ہر طرح سے تعاون کریں گے'' (میں نے خواجہ عبدالغفور سے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو وہ بولے ''آپ مہاراشٹر اسٹیٹ میں اردو طنز و مزاح کو موضوع بنائیے۔ مقالہ لکھنے کے دوران تمام طنز و مزاح نگاروں کو پڑھنے کا موقع آپ کو ملے گا۔ آپ طنز و مزاح نگار ہیں۔ اس مطالعے سے آپ کو فائدہ پہنچے گا۔ میں نے جناب خواجہ عبدالغفور کا مشورہ مان کر پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کروالیا) یہ تھی میری عصمت چغتائی سے مختصری ملاقات۔

میرے طنز و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'بلا عنوان' شائع ہوا تو میں محترمہ کو کتاب کی ایک جلد پوسٹ کردی اس درخواست کے ساتھ کہ تاثرات سے نوازیں۔ میں ان سے ایک بار شرفِ ملاقات حاصل کر چکا تھا۔ اس لیے کتاب روانہ کرنے کی جرأت پیدا ہو گئی تھی ورنہ شاید کتاب روانہ کرنے کی ہمت ہی نہ ہوتی۔ ان کا خط ملا۔

''نیا سال مبارک ہو۔''

''ادب نہایت دلچسپ عبادت ہے''

عزیزی رحمان!

خط کے چار پانچ دن بعد کتاب ملی شکریہ۔ ممبئی کے ہنگاموں میں پڑھنا صرف رات کے بارہ بجے کے بعد ہی ممکن ہے آپ کی کتاب پر کچھ رائے دینے سے پہلے جتا دوں کہ میں اپنی رائے اپنے مشاہدے اور یقین پر کسی کی بہترین تنقید کو تعینات کرنے کی عادی نہیں۔ میں نے جتنی بھی شخصیات پر خاکے لکھے وہ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر لکھے۔ صرف ادبی تخلیق کے آئینہ میں نہیں دیکھا۔ میں جب خود کسی بات پر یقین نہیں رکھتی تو دوسروں سے کیوں امید کروں۔ آپ کی کتاب میں تو ویسے اتنے مخلص دوستوں کی رائے موجود ہے جو میں نے قطعی نہیں پڑھیں صرف مجتبیٰ حسین اور غفور صاحب کی رائے پڑھی آپ کی کتاب کا وزن تولنے کے لیے نہیں بلکہ مجتبیٰ کی تحریر سے لطف اندوز ہونے کے لیے اور غفور صاحب کو عرصے سے جانتی ہوں وہ اس میدان کے پختہ مشق کھلاڑی ہیں۔ وقت کروٹ لے رہا ہے ادب نے میرے سامنے ہی کتنے چولے بدلے ہیں، کبھی توبۃ النصوح اور علامہ راشد الخیری کی تحریروں پر آنسو بہائے پھر پریم چند، شرت بابو ٹیگور

بنکم بابو نے جکڑ لیا۔ مسز حجاب امتیاز علی نے بھی خوابوں کی دنیا میں خوب ڈبویا۔ عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی نے خاص طور پر ہنسایا۔ پھر ترقی پسند آئے اور ان کے بعد جدید ادب نے پہلے پاکستان میں جنم لیا اور ہندوستان کے ادیبوں پر چھا گیا۔

اگر پورے ادب کی تاریخ مرتب کر کے اس میں وقت کی تصویر ڈھونڈی جائے تو پتہ چلے گا۔ خواہ وہ ناصحانہ انداز ہو، رومانی ہو، مزاحیہ اور طنزیہ ہو اپنے وقت کی پکار ہوتا ہے۔ جدید ادب کی تاریک گھٹن اور بند دروازوں میں دراڑ پڑ رہی ہے۔ سہا زخمی کچلا ہوا انسان پھر مسکرانے پر بضد۔ آنسو غصہ۔ مسکراہٹ، اور قہقہے یہ چکر گرفت سے باہر ہے مگر دل کو کون سمجھائے۔ یہ انسان کی زندگی کی تصویر بھی کیسا عجیب دلچسپ کھیل ہے۔ طنز و مزاح ادب کا سب سے خطرناک حربہ ہوسکتا ہے بشرطیکہ زندگی کی صحیح قدروں سے نہ ہٹ جائے میری رائے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ میرے خیال سے تو وقت کی رائے وقت خود ہی دیتا ہے۔ تنقید نہ میں سنتی ہوں نہ سناتی ہوں اور اگر کچھ کہہ بھی دیتی ہوں بڑے اصرار پر یا تو اسے خود ہی فضول سمجھتی ہوں۔

میرا مشاہدہ ہے کہ آج ہر لکھنے والا تنقید پر اصرار کرتا ہے۔ کوئی کتاب تنقید نگاروں کی رائے کے بغیر نہیں چھپتی۔ نئے لکھنے والے ضرورت سے زیادہ تنقید نگاروں کے رحم و کرم پر لکھنے کی ہمت کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے اپنی ہتک نہ کیجیے۔ اس میدان میں صرف آپ ہی اپنے بہترین ناقد ہوسکتے ہیں۔ اپنا مقام بغیر کسی ناپے تولے خود ہی بنایئے۔ شہرت کی تو بھول کر بھی امید نہ کیجیے۔ نوکری کے لیے تو بے شک سفارش چلتی ہے مگر کسی رائے سے کوئی نہیں پڑھنے لگتا پروفیسر کی رائے سے ہی گھن آتی ہے۔ اب دلبستگی یا وقت گزاری پر بھی پروفیسر کی رائے لادی گئی تو خدا ہی حافظ۔ یاد کیجیے اپنے استادوں کو اور کان پکڑ لیے دوسروں کی رائے پر اعتبار کرنے سے اتنا لمبا لیکچر جھاڑنے کے بعد بھی رائے دوں گی کہ روزانہ اخبار پڑھیے پھر طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھیے۔

میں دو مہینے سے زیادہ ممبئی سے باہر رہی خطوں کے جواب کبھی دے بھی دیتی ہوں ورنہ میرے بس کی بات نہیں۔

اگر کوئی بات ناگوار گزری ہو تو اپنی مزاح نگاری کے صدقے اس پر مسکرا دیجیے گا۔

فقط عصمت آپا

1 مارچ 1982

اپنے خط میں انھوں نے بلا عنوان کے مضامین پر اپنے تاثرات نہیں لکھے تھے لیکن جو مشورے انھوں نے عنایت کیے تھے وہ مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ 1985 میں میرے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ الف سے قطب مینار شائع ہوا تو ایک جلد میں نے انھیں پوسٹ کردی۔ ان کا خط ملا۔ رحمان صاحب میں نے ابھی آپ کی کتاب 'الف سے قطب مینار' ختم کی ہے اور اس سے پہلے کہ میں جواب دینا بھول جاؤں آپ کو مبارکباد دے رہی ہوں۔ طنز و مزاح کا رواج پھر سے واپس آنا ایک اچھا اور نیک

کوئی کتاب تنقید نگاروں کی رائے کے بغیر نہیں چھپتی۔ نئے لکھنے والے ضرورت سے زیادہ تنقید نگاروں کے رحم و کرم پر لکھنے کی ہمت کررہے ہیں۔ خدا کے لیے اپنی ہتک نہ کیجیے۔ اس میدان میں صرف آپ ہی اپنے بہترین ناقد ہوسکتے ہیں۔ اپنا مقام بغیر کسی ناپے تولے خود ہی بنائیے۔ شہرت کی تو بھول کر بھی امید نہ کیجیے۔ نوکری کے لیے تو بے شک سفارش چلتی ہے مگر کسی رائے سے کوئی نہیں پڑھنے لگتا پروفیسر کی رائے سے ہی گھن آتی ہے۔

شگون ہے ترقی پسندوں کے بعد جو نیا ادب یاسیت کا شکار ہوگیا تھا وہ طلسم تو ٹوٹا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ آپ نے کوئی عظیم ماسٹر پیس تخلیق کیا ہے کہ یہ آپ کا پہلا قدم ہے ایک عرصے سے کچھ ماتم زدہ ادب ہر طرف سے امڈ رہا تھا اس کا ریلہ دھیما پڑنے کے امکانات نظر آرہے ہیں۔ خوف زدہ جدید طرزِ تحریر کا خالق ہنس پڑے تو یہ ایک معمولی سانحہ نہیں۔ زندگی میں بھی بجائے چھری چاقو کے قہقہے چل نکلیں۔

ابھی پرسوں ممبئی ریڈیو اسٹیشن نے طنز و مزاح کی ایک محفل منعقد کی۔ بس فکر تونسوی کی غیر حاضری نے کوفت پیدا کردی۔ مجتبیٰ حسین نے تو ایک ایک جملے پر قہقہے وصول کیے۔ یوسف ناظم فیاض افسوس مختار یوسفی نے بھی رنگ جمادیا۔

آج ادیبوں کا قلم زندگی کے اتار چڑھاؤ کا ماتم کرنے کے بجائے اس نظام کا مذاق اڑا رہا ہے انجانے خدشوں سے بدحواس ہونے کے بجائے ان پر ہنس رہا ہے۔ طنز و مزاح وہ نشتر ہے جو فاسد مواد کو نکالنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ میں قریب قریب سب ہی ادیبوں سے ملی ہوں ایک بات ہے کہ ہر مزاح نگار کی بیوی کو حسین پایا۔ عظیم بیگ چغتائی کی بیوی سرخ و سفید نیلی آنکھوں والی حسینہ اب بھی حسین ہیں میں چار ماہ پاکستان رہ کر آئی ہوں۔ عظیم بھائی جہاں بھی ہوتے تھے چھٹیوں میں مجھے اپنے پاس بلا لیا کرتے تھے۔ بھابی مجھ سے سات سال بڑی ہیں۔ اردو بھی پڑھ لکھ نہیں پاتیں مگر مجھ سے بڑی تھیں اور اب بھی ہیں۔ میں ایئرپورٹ سے ان کے ہاں ہی گئی اور واپسی بھی انھیں کے گھر میں دو دن گزار کر ہوئی۔ آپ کی بیوی بھی خوب صورت ہوں گی گو آپ کی تحریر میں کچھ ذکر نہیں ملتا۔ امید ہے کہ آپ مزاح نگاری پر زیادہ توجہ دیں گے۔ یہ آپ کی پہلی کوشش ہے (حالاں کہ الف سے قطب مینار میری دوسری کتاب تھی۔ شیخ رحمٰن اکولوی) وقت کا تقاضا ہے کہ بات پر لطف انداز میں کہی جائے کہ انسان آج بڑا الجھا ہوا اور دکھی ہے مار دھاڑ اور بیہودہ کود پھاند سے لبریز فلموں نے نوجوانوں کو بدحواس کردیا۔

عصمت چغتائی، ممبئی

24 ستمبر 1988

عصمت چغتائی سے دوسری اور آخری ملاقات زندہ دلانِ ممبئی کی محفل طنز و مزاح منعقدہ 17 مارچ 1990 کو ہوئی۔ مہاراشٹر اردو اکادمی کے تعاون سے اس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس وقت یوسف ناظم اکادمی کے ممبر و سکریٹری تھے۔ عمر کے بوجھ سے محترمہ کی گردن ہلنے لگی تھی۔ میں نے سلام کیا تو بولیں ''رحمان اچھے جا رہے ہو تمھاری چیزیں ادھر اُدھر دیکھ رہی ہوں۔'' ان کی بات سن کر خوشی ہوئی میں تو سمجھ رہا تھا کہ برسوں بعد ملوں گا تو شاید وہ مجھے پہچان ہی نہ پائیں گی۔ اس محفل میں رفیعہ شبنم عابدی، جاہل ناگپوری، بابو آر کے، منشی محمد حسین، فیاض احمد فیضی اور اس خاکسار نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ عصمت چغتائی نے بھی ایک طنزیہ پیش کیا۔ انھوں نے حسب معمول عورتوں کی وکالت کی۔ انھیں مظلوم اور مردوں کو ظالم قرار دیا۔ اس محفل کی خاص بات یہ بھی تھی کہ کئی جغادری شاعر و ادیب سامعین کی حیثیت سے موجود تھے۔ مثلاً ظ انصاری، عبداللہ کمال وغیرہم۔

24 اکتوبر 1991 کو 76 برس کی عمر میں نسوانی حقوق کی علمبردار یہ آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

■

Dr. Shaikh Rahman Akolvi Deepak Chowk, Akola 444006 (MS)

ابنِ رشد ایک عظیم مفکر

ریحانہ بجنوری

قدیم زمانے میں ابن رشد جتنا گم نام تھا اسی قدر اس نے بعد کے زمانے میں شہرت حاصل کی۔ ابن رشد کو مشرق سے زیادہ مغرب میں مقبولیت ملی جس کی وجہ یہ تھی

اس کے خلاف خلیفہ کے کان بھرے جانے لگے اور خلیفہ منصور ان کی باتوں میں آگیا اور ابن رشد کے فلسفیانہ خیالات کو بہانہ بنا کر جلاوطنی کی سزا دے دی گئی۔ اور اسے یہودیوں کی بستی میں منتقل کردیا گیا۔ مشہور کردیا گیا کہ ابن رشد یہودی ہے لہٰذا اسے اپنے ہی لوگوں میں بھیج دیا گیا ہے۔ اس کی کتابوں کو نذر آتش کردیا گیا لیکن کچھ وقت کے بعد خلیفہ یعقوب منصور کو اصل سازش کا پتہ چل گیا اور اسے ندامت کا احساس ہوا۔ اس نے ابن رشد کو اپنے پاس بلا لیا اور پھر سے اس کی قدرافزائی ہونے لگی۔

کہ سب سے پہلے مغرب کے مصنفین نے اس کی طرف توجہ کی اور یہ اہل مغرب میں اویروز (Averroes) کے نام سے مشہور ہے۔ تقریباً عربی فلاسفہ میں سب سے بڑا اور آخری فلسفی ہے۔

ابوالولید محمد ابن محمد ابن رشد 14 اپریل 1126 میں قرطبہ کے مقام پر پیدا ہوا جو اسپین میں ہے۔ وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس کے والد اور دادا قرطبہ کے قاضی رہ چکے تھے۔ اس کی تربیت علمی ماحول میں ہوئی۔ وہ اٹھارہ سال کا تھا جب اس نے مراکش کا سفر کیا اور خلیفہ عبدالمومن کے دربار سے منسلک ہوگیا۔ عبدالمومن کے بیٹے یوسف سے بھی اچھے مراسم تھے۔ وہ علم دوست اور عالموں کا قدردان تھا۔ اس کے زمانے میں ابن طفیل خلیفہ کا خاص طبیب اور مشیر خاص ہوا کرتا تھا۔ طفیل کی وفات کے بعد خلیفہ نے ابن رشد کو اپنا مشیر اور طبیب مقرر کیا۔ لیکن یہ دوستی آگے چل کر حسد اور اس کے زوال کا سبب بنی۔ اس کے خلاف خلیفہ کے کان بھرے جانے لگے اور خلیفہ منصور ان کی باتوں میں آگیا اور ابن رشد کے فلسفیانہ خیالات کو بہانہ بنا کر جلاوطنی کی سزا دے دی گئی۔ اور اسے یہودیوں کی بستی میں منتقل کردیا گیا۔ مشہور کردیا گیا کہ ابن رشد یہودی ہے لہٰذا اسے اپنے ہی لوگوں میں بھیج دیا گیا ہے۔ اس کی کتابوں کو نذرِ آتش کردیا گیا لیکن کچھ وقت کے بعد خلیفہ یعقوب منصور کو اصل سازش کا پتہ چل گیا اور اسے ندامت کا احساس ہوا۔ اس نے ابن رشد کو اپنے پاس بلا لیا اور پھر سے اس کی قدرافزائی ہونے لگی۔ اس کے بعد وہ صرف ایک سال زندہ رہا اور اس نے 10 دسمبر 1198 میں وفات پائی۔ اس کا جسدِ خاکی قرطبہ لایا گیا اور پورے اعزاز و احترام کے ساتھ تجہیز و تکفین کی گئی۔

ابن رشد نے مختلف علوم مثلاً فقہ، حدیث، ادب، طب اور فلسفہ میں کمال پیدا کیا۔ اس نے اپنے والد ابوالقاسم احمد سے حدیث پڑھی اور موطا کو زبانی حفظ کرلیا۔ حدیث اور فقہ کے ساتھ اس نے اصول علم کلام اور علومِ ادبیہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ابن رشد کے اساتذہ میں ابن ماجہ بھی شامل ہیں۔ ابن طفیل کی وفات کے بعد خلیفہ یوسف نے ابن رشد کو ارسطو کے فلسفے کی تشریح اور ترجمہ کے کام پر مامور کیا۔ اس نے بڑی محنت کے ساتھ

ارسطو کی تصنیفات کا مطالعہ کیا اور ان سب کی تلخیص لکھی جس کا نام اس نے 'الجوامع' رکھا۔ اس کے بعد ایک مکمل کتاب لکھی جو چار جلدوں پر مشتمل تھی۔ پھر اس نے ان چاروں جلدوں کا خلاصہ تحریر کیا۔ اس کے علاوہ بے شمار کتابیں اس نے لکھیں۔ فلسفہ، الٰہیات، فقہ، طب، فلکیات وغیرہ جن کی ایک طویل فہرست ہے۔

ابن رشد کا خیال تھا کہ فلسفہ کے مطالعے کو ایک خاص طبقے تک محدود رکھنا چاہیے۔ عوام اس قابل نہیں کہ فلسفے کی باریکیوں کو جان سکیں اور اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرسکیں۔ اس کی یہ رائے بھی تھی کہ شریعت اور فلسفے کو یکجا نہ کیا جائے ابن رشد کے فلسفے کا نہایت فکرانگیز پہلو اس کی شہرہ آفاق تصنیف 'تہافۃ التہافۃ' سے متعلق ہے۔

ابن رشد کا عروج سلطنت میں ہوا۔ عبدالمومن کے دربار میں ابن رشد کی رسائی کا سلسلہ اس طرح شروع ہوا کہ عبدالمومن سے پہلے اندلس (اسپین) میں تعلیم صرف مسجدوں میں ہوتی تھی لیکن بعد میں عبدالمومن نے مدارس قائم کیے اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے ابن رشد کو مراکش میں طلب کیا۔ اس وقت ابن رشد ہیئت کے بعض مسائل کی تحقیقات میں مصروف تھا۔ اس کی دعوت پر ابن رشد نے مراکش کا رخ کیا۔

ابن رشد جس طریقے سے یوسف بن عبدالمومن کے دربار میں پہنچا ہے اس کی کیفیت اس نے خود اپنے ایک شاگرد سے اس طرح بیان کی ہے:

''جب میں امیرالمومنین ابویعقوب کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت وہ اور ابوبکر ابن طفیل موجود تھے۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ ابوبکر نے میری، میرے خاندان اور میرے اسلاف کی تعریف کرنی شروع کی اور اس کے ساتھ مہربانی سے ایسی باتوں کا اضافہ بھی کیا جن کا میں مستحق نہ تھا۔ امیرالمومنین نے میرے اور میرے باپ کے نام اور میرے نسب کے بارے میں پوچھنے کے بعد سب سے پہلے مجھ سے اس طرح گفتگو شروع کی کہ آسمانوں کے متعلق فلسفیوں کی کیا رائے ہے؟ وہ قدیم ہے یا حادث؟ مجھ پر شرم و خوف کی حالت طاری ہوگئی۔ اس لیے میں نے بہانے ڈھونڈنے شروع کیے اور فلسفیانہ مشاغل سے انکار کیا لیکن مجھ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ابن طفیل نے اس سے کیا باتیں کہی ہیں۔ امیرالمومنین میرے شرم وخوف کو سمجھ گئے اور ابن طفیل کی طرف متوجہ ہوکر اس مسئلے پر گفتگو کی اور ارسطو، افلاطون تمام فلاسفہ کے اقوال بیان کیے اور اس کے ساتھ اہل اسلام کے اعتراضات بھی بیان کیے۔ میں نے ان کی ایسی یاد داشت دیکھی جو ان لوگوں میں بھی موجود نہ تھی جو صرف فلسفے ہی کے ماہر تھے۔ وہ مجھ سے برابر باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب میں نے گفتگو شروع کی تو ان کو میرے علم کا حال معلوم ہوا۔ جب میں پلٹا تو مجھ کو مال، خلعت اور ایک سواری دینے کا حکم صادر فرمایا۔'' (المعجب فی تلخیص اخبار المغرب)

ابن رشد حکمت، علم اور نسب کے اعتبار سے یکتائے روزگار تھا۔ اس کو خلیفہ یوسف کے یہاں خاص تقرب حاصل تھا۔ خلیفہ کی نظر میں اس کی قدر و منزلت تمام علما و فضلا سے بلکہ اپنے بیٹے منصور یعقوب سے بھی زیادہ تھی۔ ابن رشد کے مخالفین نے کئی مرتبہ اس پر الزام لگانے کا قصد کیا۔ لیکن ابتدا میں کامیابی نہیں ملی کیونکہ خلیفہ منصور فلسفے کا دلدادہ تھا۔ لیکن دشمن ہمیشہ لگا رہتا ہے اور موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔

ابن رشد نے ایک فلسفی اور مفکر ہونے سے زیادہ ایک شارح کی حیثیت سے شہرت پائی۔ وہ ارسطو اور اس کی منطق کا شیدائی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ارسطو ایک عظیم ترین مفکر ہے۔ منطق کی ایجاد ارسطو کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو اسے ہمیشہ کے لیے ممتاز ترین مقام پر فائز رکھے گا۔ ابن رشد نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ قوانین جو فطرت میں جاری وساری ہیں اللہ ہی کے وضع کردہ ہیں۔ یہ قوانین اللہ کی عادات ہیں جن کے بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علم کی معراج یہ ہے کہ انسان قوانین قدرت سے شناسائی حاصل کرے اور کائنات میں جو توازن، حسن اور نظم دکھائی دیتا ہے اس کی اصل حقیقت معلوم کرے۔

فلسفہ و مذہب میں مطابقت کا مسئلہ ابتدا ہی سے مسلم فلاسفہ کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ کندی، فارابی، ابن سینا اور دوسرے مفکرین اسلامی تعلیمات و فلسفۂ یونان سے بالعموم اور ارسطو کی فکر سے بالخصوص ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ ابن رشد ان سے الگ تھا۔ اس کے مطابق اگر گہرے تصور اور پورے غور کے ساتھ فلسفیانہ مباحث کا جائزہ لیا جائے تو اس سے مذہبی حقائق کی تفہیم کی راہیں کھلتی ہیں۔ ابن رشد عقل کی اتباع کا قائل تھا، اس کا خیال تھا کہ حقیقت کے ساتھ اتصال محض علم ہی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ عقل انسانی کی رسائی کے اعلیٰ مراتب فکر وتدبر کی معراج ہیں۔ اس لحاظ سے وہ صوفیانہ طرزفکر کے سخت خلاف تھا۔ اس کے فضائل میں سے ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ وہ نہایت متواضع اور خوش اخلاق تھا۔ بچپن سے لے کر آخر عمر تک علمی مشاغل میں مصروف رہا۔ روایت ہے کہ اس نے سن بلوغ سے دو راتوں کے علاوہ کسی رات میں مطالعے کو ترک نہیں کیا۔ ایک اس کے والد کی وفات کی شب اور دوسرے اس کی شادی کی شب۔ اس نے تصنیف وتالیف اور ان کی ترتیب میں دس ہزار اوراق سیاہ کیے۔ وہ ہمیشہ تحصیل علم میں لگا رہتا تھا۔ علم وفضل میں کمال درجے کا عالم تھا۔ لوگ طب کے نسخوں کے لیے اس کے پاس بھاگے چلے آتے تھے۔ اس کا ایک مشہور قول ہے ''جس نے علم تشریح کی جانب توجہ کی خدائے تعالیٰ پر اس کا ایمان قوی ہوگیا۔''

ابن رشد حکمت، علم اور نسب کے اعتبار سے یکتائے روزگار تھا۔ اس کو خلیفہ یوسف کے یہاں خاص تقرب حاصل تھا۔ خلیفہ کی نظر میں اس کی قدر و منزلت تمام علما و فضلا سے بلکہ اپنے بیٹے منصور یعقوب سے بھی زیادہ تھی۔ ابن رشد کے مخالفین نے کئی مرتبہ اس پر الزام لگانے کا قصد کیا۔ لیکن ابتدا میں کامیابی نہیں ملی کیونکہ خلیفہ منصور فلسفے کا دلدادہ تھا۔ لیکن دشمن ہمیشہ لگا رہتا ہے اور موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہی خلیفہ حکمت اور حکما سے بددل ہوگیا۔ اسی زمانے میں ابن رشد کی ترقی کا ستارہ کمال عروج پر تھا۔

ابن رشد اپنے عمر کی ستر منزلیں طے کرچکا تھا۔ دشمنوں کے سینوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ دشمنوں اور حاسدوں نے ان کی عبارتوں سے لغو مطلب نکالے اور ان کو غلط طریقے سے پیش کیا جسے سن کر امیر کی آتشِ

ابن رشد کا خیال تھا کہ فلسفہ کے مطالعے کو ایک خاص طبقے تک محدود رکھنا چاہیے۔ عوام اس قابل نہیں کہ فلسفے کی باریکیوں کو جان سکیں اور اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرسکیں۔ اس کی یہ رائے بھی تھی کہ شریعت اور فلسفے کو یکجا نہ کیا جائے ابن رشد کے فلسفے کا نہایت فکرانگیز پہلو اس کی شہرہ آفاق تصنیف 'تہافۃ التہافۃ' سے متعلق ہے۔

غضب بھڑک اٹھی اور ابن رشد کے دشمنوں نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے لیکن خلیفہ نے رحم دلی سے کام لیا اور انتقام کو دبا دیا۔ اکابر مورخین کے مطابق ابن رشد کی تکلیف اور سزا کا زمانہ ایک سال سے زیادہ نہیں ہے۔

شیخ الشیوخ تاج الدین بیان کرتے ہیں کہ ''میں اندلس کے شہروں میں داخل ہوا تو ابن رشد کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ خلیفہ یعقوب کے حکم سے اپنے مکان میں نظر بند ہے۔ اس کے پاس کوئی آجا نہیں سکتا۔'' یہ ایک سیاسی قید تھی۔ وہ اپنے مکان کے ایک حصے میں تنہا زندگی بسر کر رہا تھا۔ تاج الدین لکھتے ہیں کہ ابن رشد نے اس وقت وفات پائی جب وہ بمقام مراکش اپنے مکان میں مقید تھا۔ تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ ابن رشد نے 36 برس کی عمر سے قبل کوئی کتاب لکھی ہو۔ لیکن وہ ایک جید عالم تھا اور عالم کے لیے ضروری ہے کہ وہ لکھنے سے پہلے کافی غور و خوض اور تحقیق کرے۔ ابن رشد کے ابتدائی زمانے سے ہی اس کی قوی عقل اور فکر کے طریقے نے اس کو بٹنے نہیں دیا۔ اس نے اپنی عمر بحث و مباحث اور تالیف جیسے کاموں میں صرف کی۔ اس کی کتب خانے میں طب، فلسفہ اور فقہ کے 72 رسائل کے علاوہ دیگر علوم پر بھی مختلف کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس نے تالیف کے کام کو سوائے اس مصیبت کے زمانے میں کبھی ترک نہیں کیا جب اس کو اہانت اور جلاوطنی کی سزا دی گئی تھی۔

اس کا فلسفہ ارسطو کے فلسفے کا نچوڑ تھا۔ اس نے کسی جدید علم کی بنیاد قائم نہیں کی۔ ابن رشد ایک طبیب اور فلسفی تھا لیکن اس کی فلسفیانہ قابلیت اس کی طبی مہارت سے بہت ارفع و اعلیٰ تھی۔ اس کی طبی تالیفات کا دار و مدار جالینوس کے طب پر ہے۔ اس کے علاوہ ابن رشد فقیہ بھی

ابن رشد نے ایک ایسا زمانہ دیکھا تھا جس میں علم کو انحطاط اور تعصب میں ترقی ہورہی تھی۔ تقوے کے لباس میں نمودار ہونا اس کے لیے کچھ سودمند نہ ہوا اور نہ اس کو مصائب روزگار سے بچا سکا۔ اس کو اسی خلیفہ نے سزا دی جو اس کا احترام کرتا تھا۔

تھا اور فلکیات کا ماہر بھی۔ اس کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ ہے جس کو اس کے شاگردوں نے جمع کیا اور ترتیب دیا ہے جو پیرس کے کتب خانے میں موجود ہے۔ لیکن وہ چیز جس میں حقیقی معنوں میں ابن رشد کو امتیاز حاصل ہوا ہے۔ وہ

Antūn Farah
ابن رشد وفلسفة
فرح انطون
ردود الاستاذ على الجامعة
واجوبة الجامعة

اس کی 'شرح کبیر ارسطو' ہے جس نے اس کو اکابر فلاسفہ کی صف میں جگہ دی ہے۔

ابن رشد نے 'موطا امام مالک' کو خلوص دل کے ساتھ حفظ کیا تھا۔ تمام علوم کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ اس کو فنونِ ادب کا بھی ذوق تھا۔ ابن رشد کی حیات اور اس کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے ناواقف تھا۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اس کا سبب اس کی خود اعتمادی اور عربی زبان پر اکتفا کرنا بھی ہوسکتا ہے یا دوسری زبانوں اور کتابوں کی عیب جوئی یا حصول تعلیم کی دشواریاں ہوسکتی ہیں ابن رشد یونانی زبان سے بے بہرہ تھا۔ حتیٰ کہ وہ ہسپانوی زبان سے بھی ناآشنا تھا۔ حالانکہ یہ اس قوم کی زبان تھی جس میں اس نے نشو و نما پائی تھی۔

ابن رشد کی تالیفات کا سلسلہ اسلوب کے لحاظ سے پیچ در پیچ ہے کیونکہ ارسطو نے یونانی زبان میں لکھا ہے اس کے بعد ان کتابوں کا ترجمہ سریانی میں کیا گیا پھر عربوں نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا جن کو ابن رشد نے پڑھا اور شرح لکھی اس کے بعد یہ شرح عبرانی اور لاطینی میں منتقل ہوئی۔

اس زمانے میں ابن رشد کی کتابیں محض تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ ابن رشد نے ارسطو کی تالیفات کی تین طریقوں سے شرح لکھی ہے۔ شرح صغیر، شرح وسط، اور شرح کبیر۔ ابن رشد فارابی اور ابن سینا پر سبقت لے گیا۔

ابن رشد ارسطو کی منطق کا شیدائی تھا، منطق ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے حقیقت تک پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس طرح ابن رشد کو ایک خاص فضیلت حاصل ہے کیونکہ وہ یونان کے تمام شارحین پر حقیقی معنوں میں تفوق رکھتا ہے۔ دراصل ابن رشد کے خیالات صحت پر مبنی ہیں۔ چنانچہ دیگر فلاسفہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ نفس کے متعلق ابن رشد کا خیال ہے کہ وہ جسم کے ساتھ اسی طرح متصل ہے جس طرح صورت اور مادّے میں اتصال پایا جاتا ہے۔

ابن رشد وحدۃ النفوس کے نظریے پر ہمیشہ زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عقل ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور افرادِ انسانی سے بالکل علیحدہ طور پر پائی جاتی ہے گویا کہ وہ کائنات کا ایک جزو ہے۔

عربی فلسفے میں وہ انتہائی عروج پر تھا اور ارسطو کی کتابوں کی اس نے ایسی شرح لکھی کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔ ابن رشد فلسفہ عرب کا آخری فلسفی تھا۔ اس کی تعلیمات نے یہود و نصاریٰ پر نمایاں اثر چھوڑا ہے۔

وہ ایک مفسر تھا اور ثابت قدم تھا لیکن اس میں کوئی جدت نہیں پائی جاتی۔ اس نے محض فلسفہ نظری سے بحث کی ہے وہ ابن طفیل اور ابن ماجہ کے انفرادی فکری رویے اور وحدت کے قول سے اختلاف کرتا ہے اس نے عورتوں کی آزادی کی پرزور حمایت کی ہے۔

ابن رشد نے امام غزالی کی کتاب 'تہافۃ الفلاسفۃ' پر زبردست تنقید کی ہے اور اس کے جواب میں 'تہافۃ التہافۃ' لکھی ہے جس کو ابن رشد نے تقریباً سو برس بعد مدون کیا۔

امام غزالی نے فلاسفہ کی بیس مسائل میں تکفیر کی ہے اور ارسطو سے ابن سینا تک تمام مفکرین کی تکفیر کی ہے۔ ان کے نقائص واضح کیے ہیں۔ اس کتاب میں ابن رشد کی حیثیت ایک ایسے فلسفی کی ہے جو فلسفے کے تمام ادوار سے واقف ہو اور یونان اور عرب کے قدیم و جدید اہل فکر کی کتابوں پر عبور رکھتا ہو۔

ابن رشد نے اپنی کتاب کی ابتدا ایک سلیس پیرائے میں کی ہے جس کو اس نے اساتذہ یونان سے سیکھا ہے۔

ابن رشد نے ایک ایسا زمانہ دیکھا تھا جس میں علم کو انحطاط اور تعصب میں ترقی ہورہی تھی۔ تقوے کے لباس میں نمودار ہونا اس کے لیے کچھ سودمند نہ ہوا اور نہ اس کو مصائب روزگار سے بچا سکا۔ اس کو اسی خلیفہ نے سزا دی جو اس کا احترام کرتا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے قدما کے خیالات کی اشاعت کی۔ اس طرح خلیفہ نے تمام یونانیوں کی کتابوں اور ان کے فلسفے کے مطالعے کو ممنوع قرار دیا۔ اس کے بعد اندلس میں عربوں کی حکومت بہت تھوڑے ہی دنوں تک رہی۔

■

Rihana (Bijnori) F148/1, Shaheen Bagh
Jamia Nagar, New Delhi - 110025

منشی نول کشور اور ان کا 'اودھ اخبار'

شمیم طارق

منشی نول کشور(1836-1895) کو اشاعتی اداروں کی تاریخ میں جو حیثیت حاصل ہے زمانہ اس کا معترف ہے۔بعض نے تو لکھا ہے کہ فولاد کی صنعت میں جو رتبہ جمشید جی ٹاٹا کا ہے اشاعتی اداروں کی تاریخ میں وہی رتبہ منشی نول کشور کا ہے۔اس ادارے کے امتیازات میں ایک یہ ہے کہ اس سے نامی گرامی اہل قلم اور خطاط و خوشنویس وابستہ رہے[1] اور یہاں سے قرآن حکیم اور دینی مذہبی کتابوں کے علاوہ مفید و نادر طبی علمی ادبی کتابیں بھی شائع ہوتی رہیں[2]۔مگر منشی نول کشور اور ان کے مربی منشی ہرسکھ رائے کے بارے میں An Empire of Books کی مصنفہ Ulrike Stark کی یہ سطر خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ

"They were men with journalistic leanings who were drawn into the realm of print through the newspaper business."

حقیقت بھی یہی ہے کہ نول کشور کی تاجرانہ اور انتظامی صلاحیت ان کے صحافتی شعور کی پروردہ تھی۔[3]

نول کشور کو ابتدا ہی سے نثر نگاری میں دلچسپی تھی۔ 1853 اور 1854 میں وہ اورینٹل ڈیپارٹمنٹ آگرہ کالج میں طالب علم تھے انھیں فارسی میں جونیئر اسکالرشپ (6روپیہ) حاصل ہوئی تھی۔مکھن لال رائے جو کوہ نور پریس کے مالک منشی ہرسکھ رائے (1816-1890) کے بھائی تھے، کی سفارش پر نوعمر نول کشور کو ملازمت ملی اور اس طرح 1854 میں ہی نول کشور نے امور طباعت سیکھنے کے ساتھ صحافت کی تربیت حاصل کرنا بھی شروع کر دیا۔'کوہ نور' اخبار اس لیے جاری ہوا تھا کہ اس کے ذریعے انگریز حکومت اپنے مفادات کا تحفظ کر سکے۔الحاق پنجاب کے بعد ہی انگریزوں نے منشی ہرسکھ رائے کو لاہور میں پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کی دعوت دی تھی۔جب یہ اخبار جاری ہوا تو حکومت نے اس اخبار کو مالی امداد دینے کے ساتھ خریدار بھی مہیا کیے۔حکومت کی طباعت کا سارا کام بھی اسی کے حوالے تھا۔اس کو کشمیر اور پٹیالہ کے حکمرانوں کی بھی سرپرستی حاصل تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اخبار نہ صرف یہ کہ انگریزوں کے ایماء پر جاری ہوا تھا بلکہ انھیں کے بنائے ہوئے رہنما اصولوں کے تابع تھا۔

'کوہ نور پریس' کے انتظامات کے علاوہ کوہ نور اخبار کی ادارت کے حوالے سے نول کشور کے بارے میں مختلف باتیں کہی جاتی ہیں۔مثلاً نول کشور کو کسی نے ایڈیٹوریل اسسٹنٹ اور کسی نے اڈیٹر لکھا ہے۔ان متضاد روایتوں سے قطع نظر یہ طے ہے کہ انھیں مطبع اور ادارت دونوں امور میں بااختیار حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔اس کے باوجود وہ بہت زیادہ عرصہ 'کوہ نور' پریس یا 'کوہ نور' اخبار سے وابستہ نہیں رہے۔تقریباً دو سال بعد وہ لاہور سے آگرہ آگئے اور 19 جنوری 1856 کو 'سفیر آگرہ' کے نام سے اپنا اخبار شائع کیا۔'کوہ نور' سے منشی نول کشور کی علیحدگی کے سلسلے میں بھی عام طور سے کہا جاتا ہے کہ منشی ہرسکھ رائے اور منشی نول کشور میں نظریاتی اختلاف یا کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ممکن ہے کسی معاملے میں اختلاف ہوا ہو مگر اس کو کشیدگی کہنا قرین قیاس نہیں ہے کیوں کہ نول کشور کی 'کوہ نور' سے علیحدگی اور 'سفیر آگرہ' کے اجرا کے فوراً بعد ہی مارچ 1856 میں جب منشی ہرسکھ لال کو ایک کشمیری مسلم عورت کی عصمت دری کے ایک معاملے میں تین سال کی سزا ہوئی، 'کوہ نور' کے حالات ابتر ہونے لگے اور منشی دیوان چند نے اپنے اخبار 'چشمۂ فیض' کے ذریعے ہرسکھ رائے کے خلاف طوفان اٹھایا تو نول کشور نے ہرسکھ رائے کو ضمانت پر رہا کروایا اور ان کے اخبار کی ادارت سنبھال کر اس کو دوبارہ استحکام عطا کیا۔[4] انھیں کی کوششوں سے اخبار کو اتنا استحکام حاصل ہوا کہ یہ جنگ آزادی کے دوران بھی جاری رہا۔ 1857 کے اواخر یا 1858 کی ابتداء میں نول کشور لکھنؤ آئے۔ان ہی کی لکھی ہوئی تاریخ 'تواریخ نادر العصر' (نول کشور 1890-1863) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو انگریز حاکموں[5] کے ایما پر لکھنؤ منتقل ہوئے اور یہاں سے 'اودھ اخبار' جاری کیا۔انھوں نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ انگریز حاکموں سے ان کے تعلقات اس وقت سے تھے جب وہ لاہور میں تھے۔ان حکام نے جو پنجاب سے اودھ منتقل ہوئے تھے ان کے اخبار اور پریس کے لیے جو کیا وہ ان کی اس وفاداری کا صلہ تھا جو انھوں نے برطانوی حکومت سے کی تھی۔ یہی اودھ اخبار، ان کی صحافتی حیثیت کا سب سے معتبر حوالہ بنا۔

'اودھ اخبار' کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا؟ اس میں اختلاف ہے۔رام بابو سکسینہ کے بقول 1858 میں اور Ulrike Stark کے بقول 1859 کے اوائل میں شائع ہوا اور 1950 تک 91 برس یعنی تقریباً ایک صدی تک شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار نے ایک انقلاب اس وقت دیکھا جب ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور دوسرا اس وقت جب مہاتما گاندھی کی قیادت میں ملک کو 'سوراج' حاصل ہوا۔ پہلے انقلاب نے اس کو پھلنے پھولنے اور اپنی حیثیت کو حکومت و عوام دونوں میں بہتر بنانے کا موقع فراہم کیا مگر دوسرا انقلاب جو ہندوستانی عوام کی آرزوؤں سے ہم آہنگ اور ان کی طویل جدوجہد کا نتیجہ تھا اس کو راس نہ آیا اور یہ جاری نہ رہ سکا۔سوال یہ ہے کہ ایک ایسا اخبار جس کے ایک صدی کا سفر مکمل کرنے میں صرف چند برس رہ گئے تھے آزاد ہندوستان میں جاری کیوں نہ رہ سکا؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے اس کی پالیسی، اس کے سرپرستوں کی امداد اور ملک کے بدلتے ہوئے حالات کا ذہن میں ہونا ضروری ہے۔'اودھ اخبار' کے استحکام، ترقی اور بڑھتی تعداد اشاعت کی سب سے بڑی وجہ حکومت کی سرپرستی اور مضامین کے تنوع کے سبب اہل علم کی اس سے وابستگی تھی۔ سرسید احمد خاں اس کے مداحوں میں تھے اور چاہتے تھے کہ یہ اخبار جو دہلی سے حیدرآباد اور لاہور سے کلکتہ تک پڑھا جاتا تھا مزید مقبول ہو۔منشی نول کشور نے بھی ان کی اور ان کی تحریک کی بھرپور ہم نوائی کی۔ انھوں نے یہی نہیں کہ سرسید کی United Indian Patriotic Association میں شمولیت

اختیار کی بلکہ کانگریس کی مخالفت میں بھی آواز بلند کی۔ An Empire of Books کی مصنف کے مطابق ''سرسید کی نگاہ میں 'نیوز میگزین' کے تصور کو عملی شکل دینے اور اطلاعات کے جدید تصورات سے متعلق اودھ اور شمال مغربی صوبہ کے لوگوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنے کا سہرا نول کشور کے اسی اخبار کے سر ہے۔ سرسید نے اس کی مقبولیت اور اشاعت میں ترقی کی تمنا کی اور اس سلسلے میں 'تہذیب الاخلاق' میں مضمون بھی لکھا۔ مشہور انگریزی روزناموں کی طرز پر اس کے روزنامہ ہونے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ نول کشور بھی نہ صرف یہ کہ تہذیب الاخلاق کے مضامین اپنے اخبار میں شائع اور سرسید کے مخالفین کی نکتہ چینی کرتے رہے بلکہ سرسید اور ان کے رفقاء کی مخالفت میں ایک سطر بھی نہ شائع کرنے کے فیصلے پر اٹل رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید کے نکتہ چیں اور کانگریس کے ہم نوا اخبارات 'اودھ اخبار' کی مخالفت پر اتر آئے۔

منشی نول کشور کی 'کوہ نور' سے وابستگی، ان کے 'اودھ اخبار' کو انگریزوں سے حاصل ہونے والی امداد و سرپرستی، پھر سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک کو ان کی اس درجہ حمایت کہ انڈین نیشنل کانگریس اور سرسید کے ہر نکتہ چیں کی مخالفت حتیٰ کہ سرسید کی تحریک کی مخالفت میں ایک سطر بھی شائع نہ کرنے کی پالیسی بہ ظاہر 'اودھ اخبار' کی انگریز نوازی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ مگر اس سلسلے میں رائے قائم کرتے ہوئے 1857 کے بعد کے حالات کا ذہن میں ہونا ضروری ہے۔ سوم آنند نے اپنے ایک مضمون 'اردو صحافت انیسویں صدی میں' (مطبوعہ ماہنامہ آج کل، نئی دہلی نومبر دسمبر 1983) میں لکھا ہے کہ ''نئے اخباروں کے مالک اور ایڈیٹر وہ لوگ ہوتے تھے جن کا 1857 والے ہنگامے سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو انگریزوں کے وفادار تھے'' اور نول کشور نے تو انگریزوں کی سرپرستی کا اعتراف کرنے کے ساتھ انگریز سرپرستوں کی مدح بھی کی ہے۔

لیکن ان حقائق سے ان خصوصیات کی نفی نہیں ہوتی 'اودھ اخبار' جن کا حامل تھا۔ اشتہارات اور خبروں کی فراہمی کے لیے اس نے نمائندوں کی تقرری کرکے پیشہ ورانہ صحافت کی بنیاد ڈالی تھی۔ مشمولات میں بھی اس نے ایسے مضامین اور مباحث کو جگہ دی کہ 'اودھ اخبار' سے ایک ادبی تہذیبی رسالے کی کمی پوری ہوئی چنانچہ اہل علم و دانش اس کی طرف راغب ہوئے اور اس طرح اس کے قارئین کی تعداد بڑھتی گئی۔

'اودھ اخبار' کی حیثیت علمی ادبی تحریک کی بھی تھی، جس کا مقصد انگریزوں سے مفاہمت اور اظہار وفاداری کا معاملہ کرکے ان برائیوں کو دور کرنا بھی تھا جو ہندوستانی معاشرے میں پھیلی ہوئی تھیں اور ان حقوق کو حاصل کرنا بھی جو ہندوستانی عوام کا حق تھا مگر وہ ان سے محروم تھے۔ اس نے انگریز مخالف یا ہندوستانی عوام کی ذہنی بیداری کی تحریک کی براہ راست حمایت تو کبھی نہیں کی مگر اپنے اخبار سے اخبار کے علاوہ ادبی میگزین یا رسالے کا کام لے کر قوم کی ذہنی بیداری کی تحریک کو غذا ضرور فراہم کی۔ An Empire of Books کی مصنف نے اس حقیقت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے:

"Avadh Akhbar combined the function of newspaper and literary journal. It carried poetry, fiction, and essayistic writing and evolved into a forum for literary debate, attracting the contributions of eminent Urdu literati of the day. The press office of AvadhAkhbar, then, was not only a site where information was generated, it was also a vibrant meeting place for the Urdu literary scene."[6]

1887 میں British Penny Paper کے طرز پر لاہور سے ''پیسہ'' اخبار جاری ہوا اور کچھ دوسرے اخبارات بھی منظر عام پر آئے جن سے اس اخبار کو تجارتی محاذ پر نقصان ہونا شروع ہوا مگر زیادہ نقصان کانگریس اور قوم کی ذہنی بیداری کی کچھ دوسری تحریکوں کی مقبولیت اور ہندوستانی اخبارات کی مخالفت سے ہوا۔ نظریاتی سطح پر بعض اخبارات نے 'اودھ اخبار' کے خلاف بہت سخت رویہ اختیار کیا۔ منشی نول کشور کو سامراجی قوت کا آلۂ کار اور خوشامدی تک لکھا گیا جس کو اپنے فائدے کے علاوہ کوئی چیز عزیز نہیں، یہ بھی لکھا گیا کہ قومی اور ملکی مفادات سے تو قطعی کوئی غرض نہیں۔ بعض اخبارات نے اور زیادہ سخت لفظوں میں اس کی مذمت کی۔[7]

An Empire of Books کی مصنف نے بعض اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین کے حوالے سے جو لکھا ہے اس سے اس مخالفت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو ہندوستان کے ان اخبارات نے کی تھی جن میں بیشتر انڈین نیشنل کانگریس کے حامی، سرسید کی تحریک کے مخالف یا انگریزوں کی ہمنوائی میں معتدل رویے کے حامل تھے:

"The rival Urdu press routinely potrayed Naval Kishore as a sycophant of the colonial empire who, in opposing the congress, was motivated by self-interest and servility alone. AvadhAkhbar was declared unable to represent national interests. Avadh punch defamed the paper as a money minded 'baniaakhbar', while Hindustan accused it of consisting chiefly of "translations of articles abusive of natives' taken from The pioneer and the civil and Military gazette. Ganga Prasad Varma'sHindustani denounced it along with other anti-congress papers that allegedly thrived on government patronage."[8]

'اودھ اخبار' کے مشمولات کا تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بے شک 'اودھ اخبار' کے اجراء، استحکام اور ترقی میں انگریزوں کی مدد شامل تھی اور انگریز اس اخبار کے ذریعے ایک خاص مقصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اس اخبار نے اصلاحی کردار بھی ادا کیا۔ علمی ادبی فضا پیدا کی۔ ہندوستانی تہذیب کے مشترکہ نقوش کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایسے لوگوں کے ذہن کی تربیت کی جو ماضی کی عظمتوں کے محافظ بن کر ابھرے اور مستقبل کے اجالوں سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ انگریزوں کی اس کو حمایت حاصل تھی تو اس لیے کہ وہ اس کے ذریعے عوام تک اپنی بات پہنچانا چاہتے تھے، یہ انگریزوں کی حمایت و ترجمانی کرتا تھا تو اس لیے کہ اپنی بقا اور ترقی کی ضمانت دے سکے۔ 19 جولائی 1879 کے شمارے میں اس نے بچیوں کے قتل کر دینے (Female Infanticide) کی مذمت میں

ایک تحریر شائع کی تھی اور اس کو گناہ بتایا تھا۔ 21 نومبر 1875 کے شمارے میں ستی کی رسم کی مذمت کرتے ہوئے بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی پر اصرار کیا تھا۔ 26 جولائی 1870 کے شمارے میں کثرت ازدواج کی مذمت کی تھی۔ 11 فروری 1897 کے شمارے میں اس نے ہندو دانشوروں سے اپیل کی تھی کہ وہ بھی علی گڈھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے طرز پر جدید تعلیمی ادارے قائم کریں۔

کئی مضامین سے اس حقیقت کی تائید بھی ہوتی ہے کہ 'اودھ اخبار' نے انگریز حکومت پر تنقید کی مثلاً 25اگست 1874 کے شمارے میں انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کے سلسلے میں حکومت کی الگ الگ پالیسی پر سخت تنقید کی گئی۔ مئی 1876 میں جب Prince of Wales لکھنؤ کے دورے پر آئے تو دوسرے اخبارات کی طرح اس نے بھی متعدد قصیدے(Poetic eulogies)شائع کیے۔ مگر 28مئی کے شمارے میں ایک تنقیدی مضمون بھی شائع کیا جس میں بھوک اور غربت کی ماری ہندوستانی رعایا کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں برطانوی حکومت کی ناکامی پر تنقید کی گئی تھی۔

اس نے بعض معاملات میں حکومت سے اختلاف کیا اور وہ بھی اس حد تک کہ خود انگریزوں نے محسوس کیا کہ اس اخبار کو حکومت کے غیر مشروط حامیوں کی فہرست میں نہیں رکھا جا سکتا۔ C.A. Bayly نے تو بہت بلیغ جملے میں 'اودھ اخبار' کی پالیسی کو انگریز مخالف کہا ہے۔ اس کا جملہ ہے۔

"Covert criticism of British rule in Hindustan along the lines of old patriotism, but in the voice of unalloyed loyalism"[9]

اردو میں ہجو ملیح کا جو تصور ہے وہ Bayly نے اس جملے میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کئی مضامین سے اس حقیقت کی تائید بھی ہوتی ہے کہ 'اودھ اخبار' نے انگریز حکومت پر تنقید کی مثلاً 25 اگست 1874 کے شمارے میں انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کے سلسلے میں حکومت کی الگ الگ پالیسی پر سخت تنقید کی گئی۔ مئی 1876 میں جب Prince of Wales لکھنؤ کے دورے پر آئے تو دوسرے اخبارات کی طرح اس نے بھی متعدد قصیدے (Poetic eulogies) شائع کیے۔ مگر 28 مئی کے شمارے میں ایک تنقیدی مضمون بھی شائع کیا جس میں بھوک اور غربت کی ماری ہندوستانی رعایا کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں برطانوی حکومت کی ناکامی پر تنقید کی گئی تھی۔

'اودھ اخبار' کے مشمولات کا تجزیہ کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اخبار جب جاری ہوا اس وقت کے حالات اور انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد کے حالات میں کافی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ 1858 یا اس کے فوراً بعد کے حالات میں حکومت کی سرپرستی یا تعاون کے بغیر کسی اخبار کا باقی رہ کر ملک کے تہذیبی، ادبی حتیٰ کہ دینی ورثے کا تحفظ ایک بڑا چیلنج تھا مگر اودھ اخبار نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ سماجی اور ثقافتی عنوان پر مضامین کے علاوہ مختلف اصناف میں ادبی موضوعات پر مضامین کی اشاعت کا اہتمام کر کے زبان و ادب کی بھی خدمت کی۔ ایک مرحلے پر حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کا بھی کام کیا۔ اس کی تمام تر دلچسپیاں اشاعت تعلیم، اصلاح معاشرہ اور ہندوستانیوں کے بنیادی حقوق کی بازیابی پر رہی اس نے حکومت سے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار نہیں کی لیکن اپنا کام کرتا رہا۔ مگر جیسے جیسے ذہنی بیداری کی تحریک عوامی اور سیاسی تحریک بنتی گئی اور ملک کی آزادی کا نعرہ بلند کرنے والے اخبارات و رسائل بھی علمی ادبی موضوعات پر مضامین شائع کرنے لگے ویسے ویسے اس اخبار کی مقبولیت کم ہوتی گئی اور بالآخر ملک کے آزاد ہونے کے بعد اس کے باقی رہنے کا جواز ہی باقی نہیں رہا۔ مگر اس نے اردو صحافت کو جس راہ اور مزاج سے متعارف کرایا تھا یا جن صحافیوں، شاعروں، ادیبوں کی تربیت کی تھی انھوں نے دوسروں کی رہنمائی کی۔ یہاں Ulrike Stark کے اس جملے کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ منشی نول کشور کی اشاعتی سرگرمیاں ان کے صحافتی شعور کا نتیجہ تھیں یعنی صحافی نول کشور کو تاجر و ناشر نول کشور پر فوقیت حاصل تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ 1857 کے بعد کے حالات میں جب حکومت کا رویہ ماضی کے ہر نقش کو ملیامیٹ کرنے کا تھا منشی نول کشور کے اخبار کا یہ کارنامہ بھی کم اہم نہیں تھا کہ انھوں نے ہندوستان کی سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان میں علمی ادبی، مذہبی سرمایے کا تحفظ کرنے کے علاوہ ایسے اہل قلم بھی تیار کیے جو اپنی مثبت فکر اور خوبصورت طرز اظہار سے قدیم کو جدید سے ہم آہنگ کرنے کے تاریخی فریضے کو انجام دینے میں منہمک رہے اور بالآخر ان ہی میں سے بہتوں کو اور دوسروں کو بھی قلم سے تلوار کا کام لینے کا حوصلہ ملا۔

حواشی

1. اودھ اخبار کے شعبۂ ادارت سے جو حضرات منسلک ہوئے ان میں غلام محمد تپش دہلوی، مولانا فخر الدین لکھنوی، راجہ شیو پرشاد بنارسی، طوطا رام شایاں، مرزا حیرت دہلوی، سید جالب دہلوی، منشی امیر اللہ تسلیم، قدر بلگرامی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم عباسی شرر، نوبت رائے نظر، دوارکا پرساد افق، مرزا یاس یگانہ، پیارے لال شاکر میرٹھی، مرزا محمد عسکری، شوکت تھانوی اور منشی پریم چند..... وغیرہ اہم نام ہیں۔

خطاط حضرات میں چند اہم نام منشی امیر اللہ تسلیم، منشی اشرف اللہ اشرف، منشی امیر علی نقاش، منشی محمد افضل حسین، منشی برج لال، پیارے لال کلاں، تلک رام ہوش، منشی جلال شاہ، منشی چھیدی لال، منشی چمن لال، مرزا امجد جواد، حامد علی مرصع رقم، میر حشمت علی حمید لکھنوی، خیراتی لال شگفتہ، منشی خلیل احمد، منشی دیبی پرشاد سحر، سید ریاض الحسن، منشی شیو پرساد وحشی، منشی شمس الدین اعجاز رقم، منشی واجد علی شیریں رقم، منشی باری علی اشک کے ہیں۔

2. جامع ترمذی، مجلس مذاق العارفین بوستان معرفت، تاریخ مدینہ منورہ، تذکرۂ علمائے ہند، تاریخ اودھ (5 جلد) قیصر التواریخ (2 جلد)، تاریخ بغاوت ہند، ہندوستان کے قدیم شہر، خزائن الادویہ، اکسیر القلوب، علاج الغربا، قانون شیخ بحر الفصاحت (حکیم نجم الغنی)، طلسم ہفت پیکر، ہنومان نامہ، غیاث اللغات، شرح نصاب الصبیان، فرہنگ آنند راج، فرہنگ جہانگیری، مصطلحات الشعرا، موید الفضلا ہفت قلزم، کلیات غالب، اردوئے معلی، مکتوبات غالب، قاطع برہان، عود ہندی، مرثیہ میر انیس، مجموعہ میر مونس مرحوم، معیار الاشعار، سواطع الالہام، تفسیر الرحمٰن، بستان الحکمت، انوار سہیلی، طلسم ہوشربا، الغات المبتدی اور سکندر نامہ وغیرہ ان کتابوں کے نام ہیں جو مطبع نول کشور سے شائع ہوئیں۔

3. Urike Stark, An Empire of Books, Permanent Black, Ranikhet, Pg....73

4. تفصیل کے لیے دیکھیے لاہور کرانیکل، 12 مارچ 1856۔ نول کشور نے منیجر کی حیثیت سے دوبارہ 'کوہ نور' کا انتظام سنبھالا۔ منشی ہرسکھ لال 20اگست 1857 کو رہا ہوئے۔ 21 ستمبر 1857 کو سقوط دہلی کے موقع پر 'کوہ نور' نے ایک خصوصی ضمیمہ نکالا جس پر منیجر کی حیثیت سے نول کشور کا نام درج ہے۔

5. Sir Robert Montagomeri, Chief Commissioner of Oudh اور Colonel Saunders A. Abbott, Commissioner and Suprintendent of the Lucknow Division

6. Urike Stark, An Empire of Books, Permanent Black, Ranikhet, Pg....354

7. ہم عصر اردو اخبارات میں سے کئی مثلاً 'اودھ پنچ' نے 'اودھ اخبار' کو 'بنیا اخبار' قرار دیا۔ بعض نے لکھا کہ اس میں ایسے ہی مضامین ترجمہ کر کے شائع کیے جاتے ہیں جن میں ہندوستانیوں کے خلاف مغلظات بکے گئے ہوں۔

8. Urike Stark, An Empire of Books, Permanent Black, Ranikhet, Pg....368

9. Bayly C.A. بحوالہ Urike Stark, An Empire of Books

■

Shamim Tariq, Flat No.27, 4th Floor, Marzaban Mansion, Byculla Fruit Market,
Mumbai - 400027
shamimtariq01@gmailcom

احمد اشفاق

اردو صحافت کا عصری منظر نامہ

صحافت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کتاب یا رسالے کے ہوتے ہیں۔ صحافت کسی خبر، حادثہ، کوئی اہم پیش رفت یا رونما ہونے والے کسی اہم واقعہ کو تحقیق اور تجزیہ کے ساتھ قارئین تک پہنچانے کے عمل کا نام ہے بشرطیکہ اس سارے کام میں نہایت ہی ایمانداری اور اخلاص کا عنصر موجود ہو، صحافت نام ہے لوگوں کی رہنمائی کا، صحافت نام ہے تبصروں کے ذریعے عوام الناس کو روشناس کرانے کا، صحافت عوامی معلومات، رائے عامہ اور تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ ادا کرتی ہے، صحافت انسانی اقدار کے تحفظ کی ضامن اور مظلوم و مجبور عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمان ہوتی ہے، صحافت کی قوت دراصل عوام کی قوت ہوتی ہے، کسی تحریک، جماعت یا حکومت کی پالیسی کی کامیابی و ناکامی میں صحافت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے جس کا مشاہدہ ہم روزمرہ کی زندگی میں کرتے ہیں۔

صحافت کے مؤرخین نے بادشاہی نوشتہ جات اور مفادِ عامہ کے اعلان ناموں کو صحافت کا اوّلین نمونہ مانتے ہوئے قبل مسیح عہد ہی سے صحافت کا آغاز تسلیم کیا ہے۔ اس اعتبار سے یونان، قدیم ہندوستان اور مصر میں تاریخی طور پر صحافت جیسی اوّلین شے کی تلاش کی جاتی ہے ہندستان میں صحافت کی تاریخ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض اصحاب الرائے ملازمین کی مرہونِ منّت رہی۔ ولیم بولٹس اور پھر جیمس آگسٹس ہکی اس اعتبار سے محترم ہیں کہ انھوں نے ہندوستان میں صحافت کے موضوعات، مضامین اور مواد پر نہ صرف یہ کہ غور کیا بلکہ اس کے عملی نمونے ظاہر کر کے اٹھارھویں صدی کے اواخر میں باضابطہ اخباری نمونے بھی پیش کیے۔ انگریزی کے بعد بنگلہ اور فارسی کے اخبارات بھی فوراً انیسویں صدی کے آغاز میں سامنے آگئے۔ 'جامِ جہاں نما' (1822) سے 'دہلی اردو اخبار' (1836) تک باضابطہ طور پر اردو صحافت نے خود کو واضح سماجی اور سیاسی نقطۂ نظر کے ساتھ جوڑ لیا تھا۔ اس دوران انگریزی، بنگلہ، فارسی، گجراتی، اردو اور ہندی زبانوں کی صحافت نے اپنا ایک قومی منظر نامہ مرتب کر لیا۔ دیکھتے دیکھتے کلکتہ، مدراس، بمبئی اور دلّی سے باہر علاقائی صحافت کا آغاز بڑی سُرعت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ انگریزی حکومت کے پھیلنے اور متعدد سماجی و حکومتی جبر ہی تھے جن کی وجہ سے ہندستان میں عموی طور پر علاقائی اور کثیر لسانی صحافت کا فروغ ممکن ہوا۔ 1857 سے کافی پہلے اگر علاقائی اور کثیر لسانی صحافت کا فروغ نہیں ہوا ہوتا تو یہ ممکن ہے کہ 1857 کا انقلاب اور آزادی کی جنگ کا بہترین آغاز شاید ہی ہو پاتا۔ اردو اور ہندستانی صحافت کا یہ رُخ کم و بیش آج بھی اپنے واضح اور ہمہ گیر اثرات کے اعتبار سے قائم ہے اور انگریزی کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں اور جغرافیائی خطّوں کی صحافت خوب پھل پھول رہی ہے۔

ابتدا میں صحافت صرف خبروں پر مشتمل تھی مگر موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق صحافت میں تبصرے، تجزیے، تجاویز اور آراء شامل ہوتی ہیں، صحافت کی تمام اقسام میں واقعات اور مسائل کے متعلق جو حقائق و ثبوت حاصل کیے جاتے ہیں اسے قارئین کی ایک بڑی تعداد قبول کرتی ہے۔

صحافت جس ملک کی نمائندگی کرتی ہے قدرتی طور پر اس ملک کی ثقافت کا رنگ اس پر غالب آجاتا ہے اور وہ غیر ارادی طور پر اس کی تشہیر کرتی ہے، اخبارات کو اپنی ثقافت کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔

صحافت کے ذریعے ایک صحافی قوم و ملت اور وطن کی خدمت کرتا ہے، صحافی سماج کا ایک اہم اور ذمے دار شخص ہوتا ہے اس کی بڑی اہم ذمے داریاں ہوتی ہیں مثلاً حالات و واقعات کی صورت حال سے عوام کو غیر جانب دارانہ صداقت کے ساتھ آگاہ کرنا، عوام کی رائے ہموار کرنا اور اس کے احساسات کی بھرپور نمائندگی کرنا، عوام میں سیاسی و سماجی شعور پیدا کرتے ہوئے رائے عامہ کی تشکیل کرنا ساتھ ہی ضابطۂ اخلاق کا پاس رکھنا۔

صحافت اب محدود تعداد کے قارئین سے نکل کر انتہائی وسعت اختیار کر چکی ہے اب اخبارات و رسائل کے ذریعے جو معلومات دی جاتی ہیں وہ ساری دنیا سے متعلق ہوتی ہیں اس لیے صحافت کی طاقت بھی اس کے حلقہ اثر کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی ہے اور کروڑوں لوگوں کی رائے کو متاثر کرتی ہے جس سے اس کی ہمہ گیر قوت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

صحافت کی مختلف النوع ترقی کے باعث اب خبروں کا علم کتابوں، صحیفوں، تک محدود نہیں رہا زمانہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ صحافتی مواد کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی چلی گئی، صحافتی مواد کی اتنی افراط ہو گئی کہ اخبارات کے صفحات میں اضافہ ہوا صحافت کے ابتدائی دور میں

اخبارات چھوٹے ہوتے تھے اور مواد کم اس وقت قارئین کی سہولت کے لیے مختلف حصوں کو نمایاں طور پر پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر اب ہر چیز کو نمایاں طور پر پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔

ترسیل کے حوالے سے صحافت کی دو قسمیں ہیں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا۔

پرنٹ میڈیا: پرنٹ میڈیا سے مراد طبع ہونے والے اخبارات و رسائل ہیں جیسے روزنامہ، سہ روزہ ہفت روزہ اخبارات، سہ ماہی، ماہانہ، ششماہی اور سالانہ رسائل و جرائد اور ڈائجسٹ وغیرہ کیونکہ یہ سبھی طباعت کے مراحل سے گزر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہندوستان میں پرنٹ میڈیا کی روایت کافی قدیم ہے۔

الیکٹرونک میڈیا: الیکٹرونک میڈیا سے مراد وہ ابلاغ و ترسیل ہیں جو Electronic اور Electromechanical قوت کے استعمال سے چلتے ہیں اس میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ پر شائع ہونے والے اخبارات و رسائل ہیں۔

آج الیکٹرونک میڈیا کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے لہٰذا اس دائرے میں عوامی رابطے کی ویب سائٹ جیسے گوگل، فیس بک، ٹویٹر وغیرہ شامل ہیں۔

ہندستان میں اردو صحافت کا ماضی کافی شاندار رہا ہے۔ سر سید احمد خاں کا 'تہذیب الاخلاق' محمد علی جوہر کا 'ہمدرد' اور مولانا آزاد کے اخبارات 'الہلال' اور 'البلاغ' کی زریں اور بے باک صحافت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان اخبارات نے جو قومی اور ملی فریضہ انجام دیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

صحافت دراصل کسی بھی زبان کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے کیونکہ عوام سے اس کا براہ راست رشتہ ہوتا ہے۔ صحافت کا شاندار ماضی رہا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم اردو دنیا کے اداریے میں لکھتے ہیں کہ:

''ماضی میں صحافت کی ایک درخشاں اور زریں تاریخ رہی ہے۔ صحافت نے جمہوری حقوق، مساوات، امن، سیکولرزم، اتحاد، یگانگت اور یک جہتی کے لیے جو کردار ادا کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی صحافت کا بہت فعال انقلابی کردار رہا ہے۔ اردو صحافت نہ ہوتی تو شاید ہندوستان کی آزادی کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ماضی کے زیادہ تر صحافیوں نے فرنگیوں کے خلاف جو محاذ کھولا تھا اس کا ہندوستانی عوام کے شعور پر بہت گہرا اثر پڑا۔ آزادی اور انقلاب کے جذبے کو بیدار کرنے میں سب سے اہم رول اردو صحافت ہی کا رہا ہے۔''

(ہماری بات: اداریہ، اردو دنیا، دسمبر 2015)

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ صداقت پر مبنی ہے۔ صحافت بالخصوص اردو صحافت نے جد و جہد آزادی میں جو کردار کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ آج صحافت کی ضرورت اور اہمیت کم یا ختم ہوگئی۔ آج بھی اردو صحافت اپنی ذمے داری بخوبی نبھا رہی ہے حالانکہ اردو صحافت کے بہت سے مسائل ہیں جن پر موجودہ تناظر میں سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندستان میں اردو صحافت کا ماضی کافی شاندار رہا ہے۔ سرسید احمد خاں کا 'تہذیب الاخلاق' محمد علی جوہر کا 'ہمدرد' اور مولانا آزاد کے اخبارات 'الہلال' اور 'البلاغ' کی زریں اور بے باک صحافت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ ان اخبارات نے جو قومی اور ملی فریضہ انجام دیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

صحافت کی تاریخ بہت قدیم اور تابناک ہے۔ انسانی مفاد اور تہذیب و ثقافت کی بقا کے لیے صحافیوں نے جس طرح کی قربانیاں دیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہندوستان میں صحافت کو دستور ہند کے چوتھے ستون کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ماضی اور حال کی صحافت کا اگر موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صحافت خواہ پرنٹ ہو یا الیکٹرانک اپنی اصل پہچان کھوتی جارہی ہے۔ چند صحافیوں کو چھوڑ کر بیشتر صحافیوں کی نظر میں صحافت نوکری اور آمدنی کے وسیلے سے بڑھ کر کچھ نہیں، بلکہ بعض صحافی ایسے بھی ہیں جنھوں نے صحافت کو بلیک میلنگ کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ یہ نہایت افسوس ناک صورت حال ہے۔ اردو صحافت کی موجودہ صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر صفدر امام قادری لکھتے ہیں:

''ہندستان کی اردو صحافت روایت اور جدت کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ روایت سے اسے ادبی شان اور سماجی جواب دہی کی پونجی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے جفاکشی کے ساتھ بے باکی سیکھی تھی۔ لیکن ٹیکنالوجی اور کارپوریٹ لازمیت نے اردو صحافت کو ایک الگ زمین پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اب ادب اور ادبیت کی کون کہے، عام قواعد اور انشا کے کھلواڑ روزانہ صبح سے ہمارا امتحان لیتے ہیں۔ جلدی میں خبریں یا اُن پر تاثرات پیش کرنے کا جبر ہمیں روزانہ حقائق کی بھول اور معیار کی پستی میں پہنچا رہا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ رنگین اور روشن چھپائی نے ہم سے دھیرے دھیرے جتنا کچھ چھین لیا ہے، اس کی بھرپائی ابھی ہوتی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ بہار کے اردو اخبار اور ادبی رسائل کو سامنے رکھیں اور ہندی اور انگریزی جرائد سے ان کا موازنہ کریں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ حقیقی صحافت کے میدان میں ہماری جگہ کہاں ہے۔''

اردو صحافت کے معیار کا جہاں تک تعلق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری زبانوں کی صحافت کی طرح اردو صحافت کا معیار گرا ہے۔ موجودہ عہد کی صحافت کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اسے دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ پیشہ ورانہ صحافی اور دوسرا آزاد صحافی۔ پیشہ ور صحافی سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو باضابطہ صحافت سے جڑے ہوئے ہیں جب کہ آزاد صحافی سے میری مراد ان لوگوں سے ہے جنھوں نے صحافت کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا ہے۔ پیشہ ور صحافیوں کے ساتھ کئی قسم کے مسائل ہوتے ہیں مثلاً انھیں اپنے مالکان کی ترجیحات کا خیال رکھنا پڑتا ہے، دوسرے لفظوں میں ان کے ساتھ کچھ پابندیاں بھی ہوتی ہیں جب کہ آزاد صحافی کو ان مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ جہاں تک صحافت کی موجودہ صورت حال کی

بات ہے تو میں نے عرض کیا کہ صحافت کا معیار گرا ہے۔اگر اردو صحافت کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے اردو اخبارات کو کئی قسم کے مسائل کا سامنا رہا ہے۔مثلاً

1. اخبارات کی مالیات: اخبار نکالنے کے لیے جذبے کے ساتھ ساتھ پیسوں کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔اخباروں کی اپنی ایک دنیا ہے اس میں اپنی شناخت بنانے اور معیاری صحافت کے لیے سب سے زیادہ ضرورت پیسوں کی ہوتی ہے۔اخبار مالکان کو اگر مالی مسائل درپیش رہے تو ان کو اچھے اسٹاف کی کمی بھی جھیلنی پڑے گی خبرایجنسیوں سے بھی خبر لینے میں دشواری ہوگی، ایسا ہونے پر اچھی خبر کی امید نہیں کی جاسکتی۔

2. تربیت یافتہ صحافی کی کمی: اردو صحافت کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ تربیت یافتہ صحافی کی کمی ہے۔یہ کافی افسوس ناک پہلو ہے کہ آج اردو میں صحافت کی طرف عموماً وہ لوگ آرہے ہیں جن کا داخلہ کہیں نہیں ہوتا یا ناتجربہ کاری ان کو اچھی نوکری نہیں دلا پاتی۔ایسے بہت سے اردو صحافی ہیں جنھیں خبر بھی بنانی نہیں آتی ان کی روٹی پریس ریلیز سے چلتی ہے۔صحافتی اصول سے ناآشنائی کے سبب ان صحافیوں کے ذریعے لکھی ہوئی خبریں معیار اور استناد حاصل نہیں کرپاتیں۔فی زمانہ اردو اخبارات میں تربیت یافتہ افراد کا زبردست بحران ہے۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے تو اس کا سیدھا سا جواب ہے اردو صحافیوں کو چوں کہ اچھی اجرت نہیں ملتی اس لیے اردو تعلیم یافتہ طبقہ اردو صحافت کو بحیثیت پیشہ اختیار کرنے کے لیے متوجہ نہیں ہوتا۔

3. اچھے مترجم کا فقدان: جہاں تک مترجم کا تعلق ہے تو اس کا حال بھی برا ہے۔ماہر فن اس طرف رجوع نہیں کرتے کیونکہ انھیں دوسری جگہ اچھی تنخواہ مل جاتی ہے، ناتجربہ کار یا نااہل لوگوں کے مترجم دوسری زبان کے رموز واوقاف سے ناواقف ہوتے ہیں جس سے انھیں دوسری زبان سے ترجمے کرنے میں بھی دشواری ہوتی ہے۔

4. اخباری کاغذ اور سرکاری اشتہارات کی کمی: اخبار والوں کی آمدنی کا اصل وسیلہ سرکاری اشتہارات اور مراعات پر ملنے والے کاغذ ہوتے ہیں۔یہ مراعات جن اخبار والوں کو حاصل ہیں ان کی مالی حالت بہتر ہے، اردو اخبار والوں کو انھیں سرکاری اشتہار نہیں مل پاتے۔اردو نیوز ایجنسی، نیوز سروس، ٹیلی پرنٹر، لیتھو طباعت کی بوسیدہ تکنیک، کالم نویسی، فیچر نگاری، رپورٹنگ پریس میں اداریہ نگاری وغیرہ کا حال بھی تشفی بخش نہیں ہے۔حقانی القاسمی اردو صحافت کی موجودہ صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اخبار نکالنے کے لیے جذبے کے ساتھ ساتھ پیسوں کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔اخباروں کی اپنی ایک دنیا ہے اس میں اپنی شناخت بنانے اور معیاری صحافت کے لیے سب سے زیادہ ضرورت پیسوں کی ہوتی ہے۔"

''صحافت میں اخلاقیات کی جگہ اب صارفیت نے لے لی ہے جس کی وجہ سے صحافت کا انسانی چہرہ مسخ ہوگیا ہے۔آزاد اور شفاف صحافتی قدروں کی خلاف ورزی عام ہوگئی ہے۔لوگ کہنے لگے ہیں کہ صحافت اب خبروں کی تجارت بن گئی ہے اور تجارتی مفادات کا تحفظ ہی صحافت کا مقصد اولیں بن گیا ہے۔

حقانی القاسمی کا خیال ہے کہ میڈیا اپنے بنیادی اغراض ومقاصد سے منحرف ہوتی جارہی ہے جو اچھی علامت نہیں ہے۔صحافت کا کام معاشرے کو بہتر بنانا ہے اور اگر ماضی کا مطالعہ کریں گے تو تاریخ کے صفحات پر ایسے کئی واقعات مل جائیں گے جن سے کہ صحافت کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوگا اور یہ بھی احساس ہوگا صحافت نے ماضی میں کس طرح دنیا میں انقلاب برپا کیا ہے۔مگر اس حقیقت سے چشم پوشی ناممکن ہے کہ آج صحافت کا مزاج بدل گیا ہے، الیکٹرونک میڈیا سے لے کر پرنٹ میڈیا تک خبروں کی جو سرخی بنائی جاتی ہے یا جس طرح کی خبروں کو ترجیح دی جاتی ہے اس سے نفرت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اس میدان میں ایماندار لوگ اب نہیں رہے ایسے بہت سے صحافی آج بھی ہیں جن کے لیے حقیقت بیانی سے بڑھ کر کچھ نہیں وہ آج بھی اپنے قلم سے انقلاب برپا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں مگر ایسے صحافیوں کی تعداد میں دن بہ دن کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔میڈیا مالکان کی نظر میں اخبار محض آمدنی کا ایک وسیلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ آج حقیقت کو مسخ کرنے کی دانستہ کوشش کی جارہی ہے۔آج اخبار والوں نے اپنے اپنے نظریات، کسی خاص طبقے کی تبلیغ وتشہیر بلکہ کئی موقعوں پر دوسرے مذاہب اور طبقے کے لوگوں کی تذلیل کرنے کا کام بھی شروع کردیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ صحافت سے لوگوں کا اعتماد اٹھتا جارہا ہے۔ان تمام مسائل سے اردو صحافت بھی متاثر ہے۔معروف صحافی سہیل انجم صحافت کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اردو اخبار کے متعلق عوام کو ہمیشہ ایسا لگتا ھے کہ اردو اخبارات معیاری نہیں ہوتے اوران میں اطلاعات ناقص ہوتی ہیں۔ بسا اوقات کچھ لوگ کہتے ہیں فلاں فلاں اخبارات میں املا کی غلطی تھی۔فلاں میں یہ خبر غلط تھی۔یہ خبر پرانی تھی وغیرہ۔ یہ غلط فہمیاں ہیں۔"

''اگر ہم نیوز چینلز اور اخبارات کا تجزیہ کریں تو پائیں گے کہ دونوں جگہوں پر کچھ مثبت چیزیں ہیں تو کچھ منفی بھی ہیں۔اگر صحافت کے پیشے سے وابستہ افراد ہماری سماجی اور سیاسی زندگی کے رگ وپے میں رچ بس گئے، کرپشن کو اجاگر کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں تو کہیں نہ کہیں وہ کچھ ایسا بھی کر جاتے ہیں جو انسانی زندگی اور معاشرے پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔''

(اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ، مرتبین، محمد شاہد حسین، اظہار عثمانی، ص 43)

اردو عوام کا نظریہ: اردو اخبار کے متعلق عوام کو ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ اردو اخبارات معیاری نہیں ہوتے اوران میں اطلاعات ناقص ہوتی ہیں۔بسا اوقات کچھ لوگ کہتے ہیں فلاں فلاں اخبارات میں املا کی غلطی تھی۔فلاں میں یہ خبر غلط تھی۔یہ خبر پرانی تھی وغیرہ۔یہ غلط فہمیاں ہیں۔اس طرح کی چیزوں سے انگریزی اور ہندی اخبارات بھی بھرے پڑے ہیں مگر ہمارے اندر دوسرے کی چیزوں سے مرعوب ہونے کی عادت پڑگئی ہے۔

بہرحال اردو صحافت کے تعلق سے قطعی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، آج بھی کئی اخبار اور صحافی ایسے ہیں جو اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب لوگ اخبار و رسائل خرید کر نہ صرف پڑھیں بلکہ دوسروں کو یہ ترغیب بھی دیں کہ وہ کم از کم اردو کا دو اخبار ضرور خریدیں، ساتھ ہی ساتھ خبروں کو معیاری بنانے کے لیے مدیر سے رجوع بھی کریں۔صحافت کے معیار کو بلند کرنے کی ذمے داری ہم قارئین پر بھی اتنی ہی واجب ہے جتنی کہ مالکان اور صحافیوں کی۔

■

Ahmad Ashfaque P.O Box No: 4485, Doha, Qatar ((UAE)
Email.: ahmadashfaque1969@gmail.com

ڈینگو مہلک مرض

محمد رفیق اے ایس

ڈینگو وائرس مادہ مچھر ایڈیس کے کاٹنے سے پھیلتا ہے۔ یہ سخت مہلک ڈینگو مرض وسیع اسباب کے ہمراہ جریان خون کا سبب ہے۔ تقریباً 2.5 کھرب افراد ڈینگو کے خطرٔ جوکھم میں جی رہے ہیں۔ عالمگیر پیمانے پر ہر سال لاکھوں افراد اس کے دام میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ یہ مرض انتہائی تیزی سے انسانی آبادی کی جسامت کو غیر مناسب طریقے سے متاثر کر رہا ہے۔

جن ڈے نسیٹی (Jin Dynasty) (265-420 ق م) چینی انسائیکلو پیڈیا سنہ ہجری 992 میں پہلی مرتبہ طیرانی کیڑے سے لاحق ہونے والے ڈینگو بخار کو 'زہر آب' (Water Poison) سے موسوم کیا۔ لفظ ڈینگو سواحلی فقرہ ka-dinga pepo یعنی اڑ۔ ضبطی سے ماخوذ ہے لیکن اس کی پہلی عالمی سطح پر طبی شناخت 1780 میں بیک وقت ایشیا، افریقہ اور شمالی امریکہ میں کی گئی۔ بنجامن رش (Benjamin Rush) نے عضلات درد، وجع مفاصل کی علامت کو 'ہڈی توڑ بخار' کا نام دیا لیکن 1828 میں باقاعدہ 'ڈینگو بخار' کو عام طور پر تسلیم کیا گیا۔

کلکتہ (کولکاتہ) میں مقیم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے فوجیوں کے خون میں پہلی مرتبہ 1944 میں ڈینگو کے وائرس کا مشاہدہ کیا گیا لیکن ہندوستانی باشندوں میں پہلی مرتبہ 1780 مدراس (چنئی) میں ایک مریض ڈینگو بخار سے مشابہ پایا گیا۔ 1963-64 کے دوران مغربی بنگال میں یہ سرگرم ہوا۔ 1988 کے بعد یہ آہستہ آہستہ ملک کی تمام ریاستوں میں پھیلنے لگا۔ 1996 میں دہلی، لکھنؤ اور اطراف کے علاقوں میں یہ وبائی صورت اختیار کر گیا۔ صرف دہلی میں 10,000 افراد اس سے متاثر ہوئے اور 400 افراد کی موت ہوئی۔ دہلی میں 2003 میں ڈینگو وائرس۔2 (DV-2) اور 2005 میں ڈینگو وائرس۔3 (DV-3) نے خاصا قہر برپا کیا۔

محکمۂ صحت حکومت ہند کے 2006 کے اعداد و شمار کے مطابق دہلی میں 886، کیرالہ 713، گجرات 424، راجستھان 326، مغربی بنگال 314، تامل ناڈو 306، مہاراشٹر 226، اتر پردیش 79، ہریانہ 65، کرناٹک 59 اور آندھرا پردیش میں 9 ڈینگو سے متاثرہ مریضوں کی شناخت کی گئی۔ ستمبر 2016 کے حالیہ اعداد و شمار کے مطابق دہلی میں 771 ڈینگو اور 560 چیکون گونیا کے مریضوں کی شناخت کی گئی۔ ڈائرکٹریٹ جنرل آف ہیلتھ سروس 2016 کی موجودہ رپورٹ کے مطابق سب سے زیادہ متاثرہ ریاست مغربی بنگال میں 6650 مریضوں کی شناخت کی گئی۔

مادہ مچھر ایڈیس رنگ میں سیاہ اور جسامت میں چھوٹے تقریباً 4 سے 7 ملی میٹر ہوتے ہیں۔ اس کے خمیدہ لمبے پروں اور سینے پر علامتی نشان ہوتے ہیں۔ مادہ، نر سے جسامت میں بڑی ہوتی ہے۔ جنس کی شناخت سر میں لگے محاس (سونڈ) پر چاندی یا سفید رنگ کے چھلکے سے ہوتی ہے۔ سر، جسم اور پیروں پر سفید دائرہ نما دھبے ہوتے ہیں۔ پَروں میں شفافیت اور کناروں پر چھلکے ہوتے ہیں۔ ان پَروں سے اڑنا، سمت بدلنا، رفتار کم یا زیادہ کرنا اور اتار چڑھاؤ میں آسانی ہوتی ہے۔ عموماً ان کا عرصۂ حیات چند مہینے ہی ہوتا ہے۔

مادہ مچھر کا جسم، سر، سینہ اور شکم پر مشتمل ہوتا ہے۔ سینے سے منسلک مختصر گردن کی مدد سے یہ بآسانی سر کو حرکت دیتی ہے۔ سر مختصر اور گول ہوتا ہے جس پر دو بڑی مکعب آنکھیں ہوتی ہیں۔ سر میں لمبے محاس کی ایک جوڑی ہوتی ہے جس کی مدد سے یہ اطراف اور ماحول میں ہونے والی سرگرمیوں کا جائزہ لیتی ہے۔ سینہ تین حلقوں ابتدائی، درمیانی اور آخری حصے پر مشتمل ہوتا ہے۔ سینہ حلقہ میں پیروں کی ایک جوڑی ہوتی ہے۔ درمیانی سینے میں پروں کی ایک جوڑی ظاہری جانب ہوتی ہے۔ آخری حصے میں پیر کے قریب حقد (دم لینے کا سوراخ) کی ایک جوڑی ہوتی ہے۔ شکم لمبا، استوانہ نما 10 حلقوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ شکم بالخصوص انہضام اور انڈوں کی بارآوری کے لیے مخصوص ہے۔ خون چوسنے کی مقدار کے مطابق شکم کی جسامت بڑھتی جاتی ہے۔ 8 حلقے خون کو جمع کرنے کے لیے کارآمد ہیں۔ تمام اوقات خون کا انہضام ہوتا رہتا ہے۔ جو انڈوں کو پروٹین مہیا کرتا ہے۔

نر مچھر کسی انسان، جانور یا دیگر جنس کو نہیں کاٹتا۔ وہ صرف پھلوں کا رس چوس کر اپنا گذارہ کرتا ہے۔ صرف مادہ مچھر ہی انڈوں کو بارآور کرنے کے لیے خون حاصل کرتی ہے۔ بعض جنس اپنے انڈے زنجیر نما کڑیوں میں دیتے ہیں لیکن یہ مادہ اپنے انڈے علاحدہ علاحدہ آزادانہ صورت میں دیتی ہے۔ ہر انڈہ ایک دوسرے سے آزاد ہوتا ہے۔ انڈوں کی نشو و نما اور بارآور ہونے کے لیے زیادہ سطح درکار ہوتی ہے جو بقائے حیات کے لیے ضروری ہے۔ ہر انڈا ابتدا میں سفید بعد میں سیاہ ہو جاتا ہے۔ لاروا پانی میں موجود بیکٹریا پر گذارہ کرتا ہے۔ دیگر جنس اپنے انڈوں کو دیتے وقت مناسب پانی کی تمیز نہیں کرتے لیکن ایڈیس مچھر صرف صاف و شفاف پانی میں ہی اپنے انڈے دیتی ہے۔ یہ انڈے ایک یا دو ہفتے میں بالیدہ ہو جاتے ہیں۔

یہ مچھر طلوع آفتاب کے دو گھنٹے بعد اور غروب آفتاب سے چند گھنٹے قبل کاٹتی ہے۔ بقیہ اوقات یہ نم، تاریک اور خاموش مقام پر آرام کرتی ہے۔ پھر ایک یا دو گھنٹے کے وقفے کے بعد انسان کو کاٹتی ہے۔ اس مچھر کی

خصوصیت ہے کہ یہ گھٹنوں سے نیچے والے حصوں کو کاٹ کر خون چوستی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ دیگر مچھروں کے پروں کے اُڑنے کی آواز آتی ہے۔ اس مادہ کے اڑنے کی آواز اس کے پروں سے نہیں آتی۔ یہ مادہ مچھر زیادہ بلندی پر بھی نہیں اڑسکتی۔ مادہ ایڈیس کے سونڈ میں خارج اور چوسنے کے لیے دو سوراخ ہوتے ہیں۔ اس کے لعابی غدود میں وائرس ہوتے ہیں۔ جب خون کے حصول کے لیے اپنا نوک دار سونڈ میزبان کی جلد میں ڈالتی ہے تو خون کی نالیوں کو پنکچر کردیتی ہے۔ سونڈ کے ایک سوراخ سے میزبان کے خون میں لعابی مادہ داخل کرتی ہے جو خون کو پتلا کردیتا ہے۔ اسی لعاب کے ہمراہ وائرس انسانی خون میں شامل ہوجاتا ہے۔ سونڈ کے ایک جانب سے یہ خون کو چوستی ہے دوسری جانب سے لعابی مادے کو انسانی خون میں شامل کرتی ہے۔ دراصل بندر یا گوریلا کے خون میں یہ وائرس موجود ہوتے ہیں۔ مادہ ایڈیس جب ان کو کاٹتی ہے تو ان کے خون کے ہمراہ یہ وائرس مادہ ایڈیس کے جسم میں آجاتے ہیں اور لعابی غدود میں پناہ گزیں ہوجاتے ہیں۔ یہی مادہ ایڈیس جب صحت مند انسان کو کاٹتی ہے تو یہ وائرس لعابی مادہ کے ہمراہ انسانی خون میں سرایت کرجاتا ہے۔

ڈینگو وائرس کی چار قسمیں ہیں:

DEN V-1 ; DEN V-2 ; DEN V-3 ;
DEN V-4

ڈینگو وائرس (50-nm) چربی دار جھلی کے غلاف سے ڈھکا ہوتا ہے۔ اس کا لونی مادہ RNA متاثرہ خلیہ میں موجود ہوتا ہے جو میزبان کے رائبوزوم کی ترجمانی کرتا ہے۔ نتیجتاً پالی پروٹین آگے چل کر خلیات کو پھاڑ دیتی ہے اور زہرآلود خامرے مخصوص شناختی مقام سے لحمیات پر ہضم کا عمل جاری رکھتا ہے۔ زہرآلودہ غیر ساختی پروٹین لونی مادہ RNA کے درمیانی منفی حس کو مثبت حس بنانے میں بطور نقش ثانی استعمال ہوتی ہے جو پروٹین کے خول سے

ڈینگو بخار کی مختلف سخت گیر علامتیں ہیں۔ ان میں بالخصوص تین حالتیں قابل غور ہیں۔ پہلی معتدل بخار کی حالت، دوسری تپ جریان خون کی حالت، تیسری انتہائی تشونا ک حالت۔ معتدل بخار کی حالت مادہ مچھر کے کاٹنے کے 7 دن کے بعد علامتیں ظاہر ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ جوڑوں اور عضلات میں شدیددرد، بدن پر سرخ دانے ابھرتے ہیں۔

مل کر مکمل طور پر انفرادی متعدی وائرسی ذرّے سے بھر جاتی ہے۔ زہرآلود RNA اندرونی خلیاتی ساخت میں ضم ہوجاتی ہے جہاں وہ اپنی ترتیب کی دوبارہ تشکیل کرکے زہرآلودہ مرکب تیار کرتا ہے۔ یہی مرکب، پروٹین، RNA اور میزبان کے خلیات کو زہرآلودہ ظاہر کرتا ہے۔ بالآخر آگے چل کر غیر بالغ وائرسی ذرہ بناتے ہیں۔ دیگر مرحلوں میں تیزابی جال دار گالجی اجسام کے ذریعے بالغ وائرس ٹرانسپورٹ کرتے ہیں۔ یہاں سے وائرس کی ٹولیاں نکلے بعد دیگر خون میں تیزی سے شامل ہوکر اپنا دورِ حیات مکمل کرتی ہیں اور اپنے اثرات سے میزبان کو متاثر کرتی ہیں۔

ڈینگو بخار کی مختلف سخت گیر علامتیں ہیں۔ ان میں بالخصوص تین حالتیں قابل غور ہیں۔ پہلی معتدل بخار کی حالت، دوسری تپ جریان خون کی حالت، تیسری انتہائی تشونا ک حالت۔ معتدل بخار کی حالت مادہ مچھر کے کاٹنے کے 7 دن کے بعد علامتیں ظاہر ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ جوڑوں اور عضلات میں شدید درد، بدن پر سرخ دانے ابھرتے ہیں۔ سردرد، آنکھوں کے پیچھے درد، قے، متلی ہونے لگتی ہے۔ تپ جریان خون کی حالت مچھر کاٹنے کے چند دنوں کے بعد ہی اس کے اثرات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اگر بروقت اس کا فوری علاج نہیں کیا گیا تو موت واقع ہوتی ہے۔ اسی حالت میں متاثرہ مریض کے منہ اور مسوڑوں سے خون رستا ہے۔ ناک سے خون جاری ہوجاتا ہے۔ جلد چیپ دار ہوجاتی ہے۔ خون کی نالیاں اور لعاب لمف کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ جسم کے اندرون خون کا رساؤ ہونے کی وجہ سے سیاہ فضلے کا اخراج ہوتا ہے۔ خون کے سرخ ذرّات میں کمی آجاتی ہے۔ پیٹ ذی حساس ہوجاتا ہے۔ نبض سست ہوجاتی ہے۔ عمل تنفس متاثر ہوتا ہے۔ انتہائی تشونا ک حالت سب سے زیادہ جان لیوا حالت ہے۔ جس میں موت یقینی ہوجاتی ہے۔ اس حالت میں مریض کے پیٹ میں شدید درد ہوتا ہے۔ ہوش وحواس کا اختلال ہوتا ہے۔ اچانک خون کا دباؤ کم ہوجاتا ہے۔ خون کا بہاؤ شدید ہوجاتا ہے۔ مریض بار بار قے کرتا ہے۔ نالیوں سے خون رسنے لگتا ہے اور آخر میں موت یقینی ہوجاتی ہے۔ ان تینوں حالتوں میں بخار کی شدت 104F تک چلی جاتی ہے۔ اس مرض کی تشخیص RT:PCR, HI assay, ELISA ٹسٹ سے کی جاتی ہے۔

ڈینگو وائرس تین عوامل کی وجہ سے پھیلتا ہے۔ مچھر، پانی اور ماحولیاتی درجہ حرارت۔ ماحولیاتی درجۂ حرارت پر

خون کے سرخ ذرّات میں کمی آجاتی ہے۔ پیٹ ذی حساس ہوجاتا ہے۔ نبض سست ہوجاتی ہے۔ عمل تنفس متاثر ہوتا ہے۔ انتہائی تشوناک حالت سب سے زیادہ جان لیوا حالت ہے۔ جس میں موت یقینی ہوجاتی ہے۔ اس حالت میں مریض کے پیٹ میں شدید درد ہوتا ہے۔

کنٹرول کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن مچھر اور پانی پر ہم قابو پاسکتے ہیں۔ چونکہ مادہ مچھر گھر کے اندر اور باہر ٹھہرے ہوئے صاف پانی میں انڈے دیتی ہے۔ لہٰذا اپنے گھروں اور اطراف کی ان جگہوں پر خاص دھیان دیں جہاں پانی جمع ہے۔ وہ تمام اشیا ہٹادیں جن میں پانی ٹھہرنے یا جمع ہونے کا اندیشہ ہو۔ گھر، بالکنی، یا باغوں میں پودوں کی کنڈیوں کو پانی سے لبریز نہ کریں۔ ضرورت کے مطابق ہی پودوں کو پانی دیں۔ گندے پانی کی نالیوں کو وقتاً فوقتاً صاف کریں۔ گلدان کے پانی کو روزانہ بدلیں۔ لمبی آستین کی شرٹ پہنیں۔ پاؤں میں موزے اور لمبی پینٹ کو ترجیح دیں۔ رات میں سوتے وقت نیٹ (جالی) کا استعمال کریں۔ خوشبودار صابن یا اسپرے کا استعمال کم کریں۔ گھروں کے دروازے اور کھڑکیوں میں اسکرین یا نیٹ لگائیں۔ مضافاتی علاقوں کی کچی نالیوں میں ٹھہرے ہوئے پانی کی نکاسی کریں۔ پائپ سے رستے ہوئے پانی کا نظم کریں۔ پانی جمع یا رکھنے والے برتنوں کو ڈھانک کر رکھیں۔ گلدان، بے کار ٹائر، ٹن کے ڈبے، گٹر، عارضی فوارہ، کولر کی ٹنکی، پرندوں اور جانوروں کو پانی پلانے کے برتن، بند کنویں، واٹر میٹر وغیرہ میں پانی جمع ہونے نہ دیں۔ واٹر فلٹر کی جانچ کریں۔ خالی بوتلوں میں پانی جمع کرکے نہ رکھیں۔ پانی میں اگر آپ کو مچھر کے لاروے دکھائی دیں تو تھوڑی مقدار میں کروسین ڈال دیں۔ حالانکہ پورے ملک میں صفائی مہم زور وشور سے جاری ہے اب ہماری ذمے داری ہے کہ ہم اپنے گھر اور اطراف کے ماحول کو صاف ستھرا رکھیں۔

ڈینگو کے علاج کے لیے فی الحال کوئی مخصوص ٹیکہ، ضد حیاتین یا ضد وائرس نہیں بنا ہے لیکن اس کی تیاریاں ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔ لہٰذا علاج سے بہتر احتیاط ہے۔

■

Dr. Mohd. Rafique A.S
Baitulamin, Naya Bazar,
KAMPTEE - 441001
Dist. NAGPUR (M.S)
9822225038
rafique.as24@gmail.com

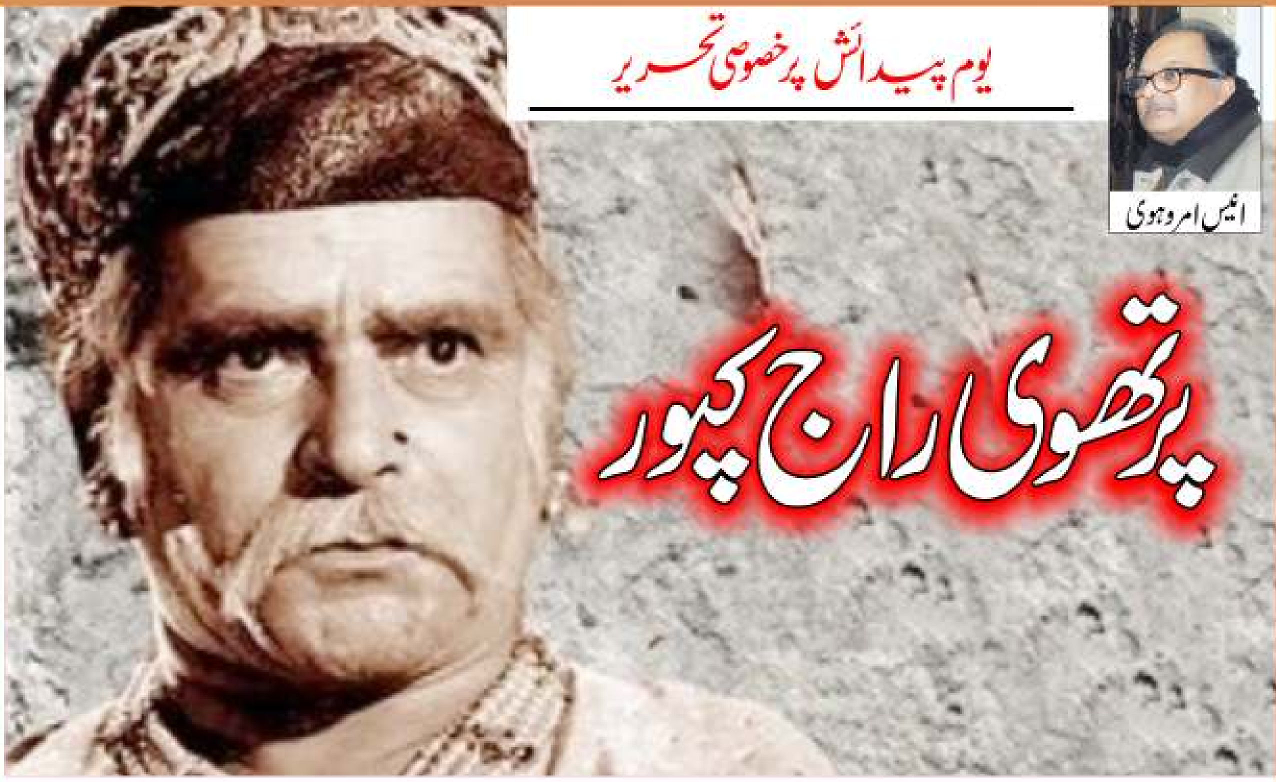

انیس امروہوی

یوم پیدائش پر خصوصی تحریر

پرتھوی راج کپور

فلمی دُنیا میں چند ہی گنی چنی ہستیاں ایسی ہوئی ہیں، جنھوں نے اپنی زندگی میں کچھ ایسے کام کیے ہیں، جن کی وجہ سے وہ فلمی دُنیا کی تاریخ میں امر ہو گئے ہیں۔ چاہے وہ تکنیکی اعتبار سے کوئی اہم کام ہو، یا کسی یادگار کردار ادا کرنے کا کام ہو۔ اُن لوگوں میں دادا صاحب پھالکے کا نام سرفہرست ہے، جنھوں نے ہندوستان میں فلموں کی بنیاد ڈالی۔ اسی لیے اُن کو ہندوستانی فلموں کا جنم داتا کہا جاتا ہے۔ اسی طرح محبوب خان، سہراب مودی، کے۔ آصف، کمال امروہوی، بلراج ساہنی، اشوک کمار، محمد رفیع، لتا منگیشکر اور دلیپ کمار وغیرہ کچھ نام ایسے ہیں جن کو ہندوستانی فلموں کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

ایسے ہی چند ناموں میں ایک درخشاں نام مرحوم پرتھوی راج کپور کا بھی ہے جنھوں نے نہ صرف خود اپنی زندگی فلموں کے لیے وقف کر دی، بلکہ ایک پورا فلمی خاندان ہندوستانی فلموں کو عطا کیا۔ آج اُن کے بیٹے اور پوتے تک اس کاروبار سے جڑے ہوئے ہیں۔ راج کپور ہیروشپ میں مقبولیت حاصل کرنے کے بعد ایک کامیاب ہدایتکار اور فلمساز بنے۔ شمی کپور کریکٹر آرٹسٹ ہو گئے، ششی کپور بھی ایک بہترین فلمساز کے طور پر اپنے آپ کو منوا چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پرتھوی راج کپور کے پوتوں کی بھی ایک کافی بڑی جماعت ہے جو پورے طور پر فلموں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان میں رندھیر کپور، رشی کپور، راجیو کپور اور کنال کپور کافی اہم ہیں۔ ان کی دو پڑپوتیوں (رندھیر کپور کی بیٹیوں)، کرشمہ کپور اور قرینہ کپور نے بھی خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔

پرتھوی راج کا جنم 3 رنومبر 1906 کو پشاور کے ایک متمول کپور خاندان میں پولیس انسپکٹر بشیشر ناتھ کپور کی پہلی بیوی کی اکلوتی اولاد کے طور پر ہوا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم سمندری اور لائل پور میں ہوئی اور بعد میں پشاور کے کالج سے گریجویشن کیا۔ اُن دنوں وہ ایک وجیہ، خوبصورت شکل وصورت کے چھ فٹ سے کچھ نکلتے ہوئے گبرو نوجوان تھے۔ 10 دسمبر 1923 کو ان کی شادی رمادیوی سے ہوئی اور اس کے بعد وہ قانون کی پڑھائی کے لیے لاہور چلے گئے۔ لاہور گورنمنٹ کالج کے ہاسٹل میں ایک دن پرتھوی راج کپور کو اپنی بیوی رمادیوی کا ہندی میں لکھا ہوا خط ملا۔ کیونکہ وہ ہندی نہیں جانتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے روم پارٹنر پورن سنگھ سے ایک دن میں کام چلاؤ ہندی پڑھنا سیکھا اور اپنی بیوی کا خط خود پڑھ کر اس کا جواب بھی ہندی میں ہی لکھ کر بھیجا۔

1929 کے شروعاتی مہینوں میں ہی وہ کالج کے لڑکوں اور مغرور قسم کے پروفیسروں سے اکتا گئے اور ان کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ اداکاری کے فن میں ہی زیادہ ذہنی سکون حاصل کر سکیں گے۔ دل میں یہ خیال آتے ہی انھوں نے کالج اور پڑھائی چھوڑی اور بیوی اور بڑے بیٹے کو پشاور میں ہی الوداع کہہ کر بمبئی آ گئے۔ گرگاؤں میں آردیشر ایرانی کی 'امپیریل فلم کمپنی' تھی۔ وہاں پرتھوی راج کو ایکسٹرا اداکار کے بطور پہلی بار فلم 'چیلنج' میں ایک کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ اُن دنوں وہ فارس روڈ جیسے بدنام علاقے کی ایک گلی کی بلڈنگ میں کرایے کا کمرہ لے کر رہنے لگے۔

پرتھوی راج کو جلد ہی ان کی پُر وقار شخصیت کی وجہ سے آردیشر ایرانی نے اپنی اگلی فلم 'سنیما گرل' میں ہیرو بنا دیا اور ایکسٹرا کا لیبل اُن کے نام سے ہٹ گیا۔ اس فلم میں ارملین ان کی ہیروئن تھیں۔ ہدایتکار بی۔ پی۔ مشرا کی فلم 'طوفان' میں بھی اسی جوڑی کو دہرایا گیا۔ اس کے بعد مشرا جی کی فلم 'دروپدی' میں پرتھوی راج نے ارجن کا کردار ادا کیا۔ فلم 'وجے کمار' اور 'بینڈ فار دی تھرون' میں وہ جلّو بائی کے ساتھ ہیرو بنے اور 'نورانی موتی'، 'لاہور کی بیٹی' اور فلم 'دھرتی ماتا' میں ان کی ہیروئن زہرہ بنیں۔ اس کے علاوہ 'نمک حرام کون؟' اور 'پریم کا داؤ' پرتھوی راج کی کچھ ایسی خاموش فلمیں تھیں جو 1931 تک نمائش کے لیے پیش کی جا چکی تھیں۔

14 مارچ 1931 کو ہندوستانی سنیما کی تاریخ میں ایک زبردست انقلاب آیا اور اُس دن ہندوستان کی پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ فلمساز ہدایتکار آردیشر ایرانی کی اس فلم میں پرتھوی راج کپور نے

عالم آرا (زبیدہ) کے باپ کا کردار ادا کیا تھا جو بادشاہ کی فوج کا سپہ سالار بھی تھا۔ ملک کے اس ناچتے گاتے اور بولتے ہوئے کرشمے نے لوگوں پر جادو جیسا اثر کیا۔ حالانکہ اس فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اخبار کے صحافی نے پرتھوی راج کی اداکاری اور خاص طور پر ان کی آواز کی سخت الفاظ میں تنقید کی اور لکھا کہ ان کی آواز فلموں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد میں متکلم فلموں کے لیے ان کی یہی آواز ان کی اور فلم کی کامیابی کی ضمانت بن گئی۔

یہ وہی زمانہ تھا جب پرتھوی راج کا تھیٹر کی طرف رجحان بڑھنے لگا تھا۔ بمبئی کے اوپرا ہاؤس میں انھوں نے 'گرینڈ انڈین نیشنل تھیٹر' نام کے ایک گروپ کے ساتھ کام شروع کر دیا، مگر جلد ہی چار سو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پر کلکتہ کے 'نیو تھیٹرس' کے ساتھ کام کرنے لگے۔ بمبئی میں انھوں نے 1932 میں 'امپیریل فلم کمپنی' کی 'دغا باز عاشق' میں زہرہ کے ساتھ کام کیا تھا اور 1933 سے لے کر 1939 تک پرتھوی راج نے کلکتہ کے نیو تھیٹرس کی تقریباً دس فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ اس کے علاوہ تقریباً چھ فلمیں نیو تھیٹرس سے باہر کی بھی کیں۔

کلکتہ جانے سے پہلے انھوں نے اپنی شدید خواہش کے مطابق رنجیت اسٹوڈیو کی فلموں میں کام کرنے کے لیے اسٹوڈیو کے مالک چندو لال شاہ سے ملے۔ مگر چندو لال شاہ نے ان کے ڈیل ڈول کو دیکھتے ہوئے انھیں اسٹنٹ فلموں میں کام کرنے کا مشورہ دے کر ٹال دیا۔ تب پرتھوی راج یہ کہتے ہوئے اُن کے دفتر سے باہر آ گئے کہ آپ ہندوستان کے ایک بہت بڑے اداکار کو رجیکٹ کر رہے ہیں۔

1939 میں پرتھوی راج واپس بمبئی آ گئے اور ایک ہزار روپے ماہوار پر سیٹھ چندو لال شاہ کے ہی رنجیت مووی ٹون سے وابستہ ہو گئے۔ حالانکہ انھوں نے اب تک کافی شہرت، عزت اور پیسہ حاصل کر لیا تھا، مگر وہ ہمیشہ ایک سادہ سی زندگی گزارنے کے قائل رہے۔ ماٹنگا کے ان کے فلیٹ میں ہمیشہ مہمان بھرے رہتے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت جب جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے تو پنجاب سے ان کے کئی رشتہ دار خاندان بمبئی آ کر ان کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔

رنجیت مووی ٹون کے ساتھ پرتھوی راج کی سب سے پہلی فلم 1939 میں 'ادھوری کہانی' کی نمائش ہوئی، جس کی ہیروئن دُرگا کھوٹے تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے رنجیت مووی ٹون کی 'آج کا ہندوستان' اور 'پاگل' (1940)، 'گوری' اور 'وش کنیا' (1943) فلموں میں کام کیا، جن میں ستارہ دیوی، مادھوری، شمیم اور سادھنا بوس ان کی ہیروئنیں تھیں۔ اس درمیان پرتھوی راج نے 'چنگاری، دیپک، سجنی' (1940)، 'راج نرتکی، سکندر' (1941)، 'ایک رات، اُجالا' (1942)، 'آنکھوں کی شرم، بھلائی، اشارہ' (1943) فلمیں بھی کیں۔ ان میں 'سکندر' اور 'راج نرتکی' اُس زمانے کی کامیاب فلمیں تھیں۔ فلم 'پکار' کی بے پناہ کامیابی سے متاثر ہو کر فلمساز سہراب مودی نے فلم 'سکندر' کو اور زیادہ عالیشان بنانے کی کوشش کی تھی۔ سکندر کے کردار میں پرتھوی راج کپور، پورس کے کردار میں خود سہراب مودی اور رُخسانہ کے کردار میں ونمالا نے پورے ہندوستان میں دھوم مچا دی۔ ان دونوں فلموں نے پرتھوی راج کو شہرت کے نئے آسمان پر پہنچا دیا۔ اس کے بعد پرتھوی راج کی مذہبی، دیومالائی اور تاریخی فلموں کی ایک لمبی فہرست ہے، مگر 1944 میں وی۔ شانتارام کی فلم 'شکنتلم' میں انھیں کام نہیں ملا، اور وہ ایک تھیٹر گروپ بنانے کی بات اپنے دل میں ٹھان بیٹھے۔

دوبارہ بمبئی لوٹنے کے بعد پرتھوی راج نے اسٹوڈیو کی ملازمت اختیار کرنے کے بجائے فری لانسنگ سسٹم شروع کیا۔ یہی ایک طرح سے اسٹار سسٹم کی بھی ابتدا تھی۔ اس سے قبل فلم اداکار اسٹوڈیو یا فلم کمپنی کا تنخواہ دار ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے کسی ایک اسٹوڈیو میں نوکری کرنے کے بجائے الگ الگ کمپنیوں کی فلمیں سائن کیں۔ لہٰذا پرتھوی راج کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فری لانسنگ سسٹم کو دوسرے اداکاروں نے بھی اپنایا۔

1945 میں اسٹیج کی مقبول اداکارہ عذرا ممتاز کے ساتھ 'شکنتلا' ڈرامہ کر کے انھوں نے 'پرتھوی تھیٹر گروپ' کی بنیاد ڈالی اور آئندہ آنے والے پندرہ برسوں تک 'پرتھوی تھیٹر گروپ' لگاتار اپنے شوز کرتا رہا۔ 1960 تک سولہ برس کے وقفے میں پرتھوی راج کپور نے تقریباً ایک سو پچاس اداکاروں، ادیب شاعروں، موسیقاروں اور تکنیکی لوگوں کی منڈلی کے ساتھ پورے ملک کا دورہ کیا اور تھیٹر کی طاقت کا احساس عوام کو کرایا۔ اپنے ایک تھیٹر کا قیام اب اُن کا سب سے بڑا خواب بن چکا تھا۔ وہ ہر شو کے بعد ناظرین سے اپنے ایک تھیٹر کے قیام میں تعاون کرنے کی اپیل کرتے تھے اور بعد میں تھیٹر کے باہر چندہ اکٹھا کرنے کے لیے دامن پھیلا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ حالانکہ ان کا یہ خواب اُن کے انتقال کے بعد شرمندۂ تعبیر ہوا۔ ان کی موت کے بعد ''پرتھوی راج کپور میموریل ٹرسٹ'' کا قیام عمل میں آیا اور پھر 1978 میں ان کی یاد میں اس ٹرسٹ نے ایک تھیٹر کی تعمیر کرائی۔

ملک بھر میں اسٹیج شوز کرنے کے ساتھ ہی اپنی گھریلو ضروریات کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے بہت سی فلموں میں بھی کام کیا۔ جن میں خاص طور پر 'آزادی کی راہ پر (1948)، ہندوستان ہمارا (1950)، آوارہ، دیپک (1951)، آنند مٹھ، انسان (1952) آگ کا دریا (1953)، احسان (1954)، پردیسی، پیسہ (1957)، لاجونتی (1958)' اور 'مغل اعظم' (1960) خاص طور پر مقبول اور کامیاب فلمیں ثابت ہوئیں۔ 1957 میں

> "میں اسٹیج کی مقبول اداکارہ عذرا ممتاز کے ساتھ 'شکنتلا' ڈرامہ کر کے انھوں نے 'پرتھوی تھیٹر گروپ' کی بنیاد ڈالی اور آئندہ آنے والے پندرہ برسوں تک 'پرتھوی تھیٹر گروپ' لگاتار اپنے شوز کرتا رہا۔ 1960 تک سولہ برس کے وقفے میں پرتھوی راج کپور نے تقریباً ایک سو پچاس اداکاروں، ادیب شاعروں، موسیقاروں اور تکنیکی لوگوں کی منڈلی کے ساتھ پورے ملک کا دورہ کیا اور تھیٹر کی طاقت کا احساس عوام کو کرایا۔"

انھوں نے پرتھوی تھیٹر بند کر کے اسے فلمسازی کے ادارے میں تبدیل کر دیا تھا اور اس کے بینر سے انھوں نے اپنے ہی ایک مقبول ناٹک 'پیسہ' پر فلم بنائی جس کی ہدایتکاری خود پرتھوی راج نے کی۔ اس فلم میں پرتھوی تھیٹر کے خاص خاص اداکاروں کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی پہلی خاموش فلم 'سنیما گرل' کی ہیروئن ایرلین کو بھی موقع دیا، مگر یہ فلم بُری طرح ناکام ہو گئی اور پرتھوی راج نے پھر کبھی فلمسازی یا ہدایتکاری کا حوصلہ نہیں کیا۔

پرتھوی راج کپور نے اسٹیج سے فلم تک ایک کافی لمبا سفر طے کیا تھا اور اداکاری اُن کے رگ وپے میں رچ بس گئی تھی۔ تھیٹر سے ان کا پیار اور لگاؤ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کمایا، اس کا

زیادہ حصہ تھیئٹر میں لگا دیا اور جہاں تک ہو سکا، تھیئٹر کو قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ جب ان کی آمدنی محدود ہوگئی تو مجبوراً ان کو تھیئٹر بند کرنا پڑا۔ پھر بھی وہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ انھوں نے تھیئٹر کے ذریعے ہماری فلمی دنیا کو کئی بڑے اچھے فنکار دیے جن میں راج کپور، شمی کپور، ششی کپور، پریم ناتھ، سجن، حسرت جے پوری، شنکر اور جے کشن، راما نند ساگر اور اندراج آنند کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سارے لوگ ہی پرتھوی راج کپور جی کے ساتھ تھیئٹر سے جڑے ہوئے تھے۔ تھیئٹر میں بہت زیادہ کام کرنے کی وجہ سے ان کی آواز خراب ہوگئی تھی، تب فلم 'تین بھورانیاں' میں اُن کی آواز ڈب کرنی پڑی۔ بعد میں اپنی آواز کی خرابی کو بھی انھوں نے خوبی میں بدل دیا اور جہاں اُن کی آواز ساتھ نہیں دیتی تھی تو وہ ہاتھوں سے کام لیتے تھے اور سین میں جان ڈال دیتے تھے۔

فلمساز کے۔ آصف کی فلم 'مغلِ اعظم' پرتھوی راج کپور کی اداکارانہ صلاحیتوں کی انتہا ہے۔ اس فلم کے کئی منظر ایسے ہیں جن میں پرتھوی راج کی اکبرِ اعظم کے کردار میں اداکارانہ فنکاری پر تفصیل سے بات ہو سکتی ہے۔ یاد کیجیے شیش محل میں انارکلی کا بیباک ہوکر اکبرِ اعظم کے سامنے رقص اور گانا...... ''جب پیار کیا تو ڈرنا کیا......'' کے اختتام پر غصے سے سُرخ ہو جانا اور سانس روک کر آنکھوں اور چہرے، گلے کی نسوں کا پھلا کر غصے کا اظہار کرنا، پوری فلم میں ان کی مخصوص چال اور اپنے لاڈلے بیٹے سلیم سے یہ کہنا...... ''سلیم! تجھے بدلنا ہوگا!'' ایک سین میں جب وہ انتہائی مجبوری میں انارکلی کے سر پر ملکۂ ہندوستان کا تاج اپنے ہاتھوں سے رکھتے ہیں تو ان کے ہاتھ کانپتے ہیں اور چہرے پر مجبوری، حقارت اور غصے کے تاثرات ایک ساتھ اُبھر آتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ دیوان خاص میں اپنے درباریوں کی موجودگی میں اپنے باغی بیٹے شہزادہ سلیم کی بغاوت کا اعلان سنتے ہیں تو ان کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک منظر میں جب بہار اکبرِ اعظم کو سلیم انارکلی کی ملاقات کی جانکاری دیتی ہے اور وہ خود شاہی باغ میں جا کر دیکھتے ہیں اور انارکلی خوف کے مارے بیہوش ہو جاتی ہے تو انتہائی غصے کے عالم میں بھی اُن کے چہرے پر حقارت سے دیکھنے کے تاثرات سے سین میں روح پھونک دیتے ہیں۔ اس طرح کی کئی مثالیں صرف اسی ایک فلم سے دی جا سکتی ہیں۔

پرتھوی راج کپور میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ سیکھنے کی بڑی لگن تھی۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ ہر انسان میں ایک طالب علم ہوتا ہے اور انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر کے طالب علم کو کبھی مرنے نہ دے۔ جب تک زندہ رہو، کچھ نہ کچھ سیکھتے رہو۔ زندگی کا ہر دن کچھ نہ کچھ سیکھنے کے لیے ہوتا ہے۔

فلم 'مغلِ اعظم' (1960) نے پرتھوی راج کپور کو لازوال بنا دیا تھا مگر اس کے بعد ہی وہ سخت علیل ہو گئے اور کئی برسوں تک انھیں کئی سطحی فلموں میں بھی کام کرنا پڑا۔ لٹیرا، ڈاکو منگل سنگھ، لال بنگلہ، لو اینڈ مرڈر، نئی زندگی، بانکے لال وغیرہ چند ایسی ہی فلمیں ہیں۔ حالانکہ 1963 کے بعد ان کی بہترین اداکاری کی مثال کچھ کامیاب فلمیں بھی بنی، جن میں پیار کیا تو ڈرنا کیا، غزل، راجکمار، زندگی، جانور، یہ رات پھر نہ آئے گی، تین بھورانیاں، انصاف کا مندر، ایک ننھی سی لڑکی تھی، گناہ اور قانون اور 'کل، آج اور کل' کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ایک فلم 'باہے بائے نائٹ' ان کے انتقال کے چار سال بعد ریلیز ہوئی۔

1966 میں کارلوویری کے پندرہویں عالمی فلمی میلہ میں ان کی اداکاری والی فلم 'آسمان محل' (1965) کی نمائش کے سلسلے میں پراگ (چکوسلوواکیہ) کی موسیقی اکیڈمی کی طرف سے پرتھوی راج کپور کو ہندوستانی فلم اور ڈرامہ کے ارتقا میں تخلیقی تعاون دینے کے لیے خاص طور پر اعزاز سے نوازا گیا۔ 1953 سے 1960 تک لگاتار پرتھوی راج پارلیامنٹ کی راجیہ سبھا کے ممبر نامزد کیے گئے۔ 1963 میں حکومت ہند کی طرف سے انھیں 'پدم بھوشن' کے اعزاز سے نوازا گیا، اور 1972 میں پرتھوی راج کپور کو بعد از مرگ 1971 کے 'دادا صاحب پھالکے ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔

پرتھوی راج کپور کو لوگ پیار میں اور احتراماً 'پاپاجی' کہا کرتے تھے اور ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ان کو 'پاپاجی، پاپاجی' کہتے نہیں تھکتے تھے۔ پاپاجی کے پاس ایک بہت پُرانی اوپل اور اسٹینڈرڈ گاڑی تھی۔ اسٹینڈرڈ گاڑی تو بڑی عجیب تھی۔ اس میں بیٹھ کر پاپاجی گاڑی سے بڑے دکھائی دیتے تھے۔ لوگ ہنستے بھی تھے مگر پرتھوی راج جی اُسی میں بیٹھ کر گھومتے تھے اور خود ہی اُسے چلایا کرتے تھے۔ جب پرتھوی راج جی صبح کو اس گاڑی میں نکلتے تو گلی کے بچوں کو اکٹھا کر کے کہتے۔ ''چلو بچو! پاپاجی کی گاڑی کو دھکا لگاؤ۔'' بچے دھکا لگاتے اور گاڑی چل پڑتی۔ اگر کہیں راستے میں رک گئی تو

گیتا، قرآن اور بائبل نہ صرف پڑھتے تھے بلکہ لوگوں کو ان کتابوں کے حوالے دے کر انسانیت کے صحیح راستے پر چلنے کی تلقین بھی کیا کرتے تھے۔ دنیا کے ہر مذہب کے لیے ان کے دل میں احترام کا جذبہ تھا اور تنگ نظری ان کو چھو کر بھی نہ گئی تھی۔ وہ قدیم ہندوستان کی تہذیب کے علمبردار تھے مگر نئی تہذیب کی بھی مخالفت نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی پر اپنے خیالات تھوپنے کی کوشش کرتے تھے۔'

راہ چلتے لوگوں کو بلا لیتے اور لوگ بھی پاپاجی کی گاڑی کو دھکا لگا کر خوش ہوتے تھے۔

ان کی زندگی بڑی سادہ اور بااصول تھی۔ ایک بار راج کپور نے ان کے لیے ایک بڑی گاڑی خریدنی چاہی، مگر انھوں نے یہ کہہ کر گاڑی خریدنے سے انکار کر دیا کہ ''پرتھوی راج کپور اتنی بڑی گاڑی افورڈ نہیں کر سکتا۔''

پرتھوی راج کپور میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ سیکھنے کی بڑی لگن تھی۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ ہر انسان میں ایک طالب علم ہوتا ہے اور انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر کے طالب علم کو کبھی مرنے نہ دے۔ جب تک زندہ رہو، کچھ نہ کچھ سیکھتے رہو۔ زندگی کا ہر دن کچھ نہ کچھ سیکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ انھوں نے خود کئی زبانیں سیکھیں، تلگو اور کنڑ فلموں میں بھی کام کیا۔ انھیں موسیقی سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ کوئی بھی اچھا فنکار مل جاتا تو وہ اس کو لے کر بیٹھ جاتے۔ کبھی خود ستار بجانے لگتے، کبھی باجا۔ موسیقی ہی نہیں، وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کے باوجود ناچ بھی سیکھتے تھے۔ اسی طرح مذہبی کتابیں پڑھنے کا بھی ان کو بڑا شوق تھا۔ گیتا، قرآن اور بائبل نہ صرف پڑھتے تھے بلکہ لوگوں کو ان کتابوں کے حوالے دے کر انسانیت کے صحیح راستے پر چلنے کی تلقین بھی کیا کرتے تھے۔ دنیا کے ہر مذہب کے لیے ان کے دل میں احترام کا جذبہ تھا اور تنگ نظری ان کو چھو کر بھی نہ گئی تھی۔ وہ قدیم ہندوستان کی تہذیب کے علمبردار تھے مگر نئی تہذیب کی بھی مخالفت نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی پر اپنے خیالات تھوپنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے زندگی کے آخری دور تک اپنی فلموں کا اسکرپٹ اردو میں ہی لیا۔ وہ اردو زبان کے دلدادہ تھے۔

راج کپور جب فلموں میں آئے، اُس وقت پرتھوی راج کا عروج کا زمانہ تھا اور وہ فلم والوں اور فلم بینوں سے اپنے فن کا لوہا منوا چکے تھے۔ مگر اتنی حیثیت کا مالک ہونے کے باجود انھوں نے راج کپور کے لیے کسی سے کوئی سفارش نہیں کی۔ انھوں نے صاف الفاظ میں راج کپور سے کہا کہ ''اگر تم اس لائن میں آنا چاہتے ہو تو بڑے شوق سے آؤ، مگر یہ مت سمجھنا کہ تم اداکار پرتھوی راج کے بیٹے ہو۔ اپنا راستہ خود تلاش کرو۔ تمھاری محنت، لگن اور ایمانداری خود تمھاری پہچان بنا دے گی۔ میرا آشیرواد ہی تمھارے ساتھ ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ جب راج کپور نے فلم لائن میں داخلہ لیا تو بمبئی ٹاکیز میں کلیپر بوائے کی حیثیت سے کام شروع کیا اور بعد میں وہ ہندوستان کا ایک بڑا اداکار، فلمساز اور ہدایتکار بن کر لوگوں کے سامنے اُبھرا اور غیر ممالک میں بھی غیر معمولی شہرت حاصل کی۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ جیمنی والوں کی فلم 'زندگی' کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ جیمنی اسٹوڈیو میں ہدایتکار واسن صاحب نے پرتھوی راج کے مکان کا بہت بڑا سیٹ لگا رکھا تھا جو ایک بہت بڑے رئیس اور جاگیردار کا کردار اس فلم میں ادا کر رہے تھے۔ بہت بڑا ہال تھا، ہال کو پار کر کے سیڑھیاں تھیں اور سیڑھیاں چڑھ کر راجندر کمار کا بیڈروم تھا جو اس فلم میں پرتھوی راج کے اکلوتے نوجوان بیٹے کا کردار ادا کر رہے تھے۔ سین یہ تھا کہ راجندر کمار کا ایکسیڈینٹ ہو چکا ہے اور وہ بیہوشی کی حالت میں پڑا ہے۔ پاپا جی اس کو پاگلوں کی طرح تلاش کرتے ہیں اور جب وہ مل جاتا ہے تو اس کو گود میں اُٹھا کر ہال میں سے ہوتے ہوئے، سیڑھیاں چڑھ کر اس کے کمرے تک لے جاتے ہیں۔ اُن دنوں پرتھوی جی کے پیر میں کچھ تکلیف بھی تھی۔ ہدایتکار واسن نے کہا: ''پاپا جی، یہ شاٹ بہت لمبا ہے اور تکلیف دہ بھی اور آپ کے پاؤں میں تکلیف بھی ہے، لہٰذا میں یہ شاٹ کسی ڈپلی کیٹ سے کرائے لیتا ہوں۔''

پرتھوی راج نے صاف انکار کر دیا، بولے......

''نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ بیٹا میرا ہے، لہٰذا میں ہی اسے گود میں لے کر اوپر جاؤں گا۔ اگر ایسا نہیں کر سکا تو اس کے بعد کے سین میں باپ کا جذبہ کہاں سے لاؤں گا۔'' اور پھر یہ لمبا اور تکلیف دہ شاٹ انھوں نے خود ہی کیا۔ یہ تھی ان کی کام کے سلسلے میں لگن، محنت اور ایمانداری کی ایک مثال۔

> پرتھوی راج کپور اپنے آپ میں ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ محفلوں میں ان کا اپنا ہی الگ رنگ ہوتا تھا۔ ادب، موسیقی، ڈرامہ، مذہب، شاعری، غرض ہر موضوع میں ان کی دلچسپی تھی۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کا 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' اُن کو ازبر تھا۔

پرتھوی راج کی فلموں میں سب سے اہم فلم تھی کے۔ آصف مرحوم کی 'مغلِ اعظم'۔ دراصل دیکھا جائے تو

یہ فلم ہی پرتھوی راج کپور کی تھی۔ اس فلم کے لیے انھوں نے جتنی محنت کی ہے، شاید ہی کسی فلم کے لیے کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اکبرِ اعظم کے کردار کو پردۂ سیمیں پر زندۂ جاوید کر دیا ہے اور اب تک کوئی بھی اداکار اکبرِ اعظم کے کردار کی اُس امیج کو توڑ نہیں پایا ہے۔

ملک کی آزادی کے بعد بھڑکے ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات پورے ملک میں پھیل گئے۔ پرتھوی راج کے تھیٹر میں کئی مسلم اداکار بھی کام کرتے تھے۔ فسادیوں نے ایک دن پرتھوی تھیٹر کو گھیر لیا اور ان سے مانگ کی کہ مسلم اداکاروں کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ تب پرتھوی راج بے دھڑک فسادیوں کے سامنے آ گئے اور اپنی گھن گرج والی آواز میں کہا کہ ہندو ہو یا مسلمان، میرے ساتھ کام کرنے والا ہر شخص پہلے انسان ہے اور میری اولاد کی طرح ہے۔ ان میں سے کسی تک پہنچنے کے لیے تمھیں پہلے مجھے قتل کرنا ہوگا۔ پرتھوی راج کی باتیں سن کر وہ لوگ ان کے پیر چھو کر واپس چلے گئے۔

پرتھوی راج انسانی ہمدردی اور اخلاقی قدروں میں بہت زیادہ یقین رکھتے تھے۔ ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران ان کو فلم کی ہیروئن کا ہاتھ چومنا تھا۔ وہ بڑے تذبذب میں تھے۔ پھر اچانک انھوں نے اداکارانہ طور پر کمرے کی طرف پشت کر کے اپنا ہی ہاتھ چوم لیا۔ ناظرین کو بالکل ایسا ہی لگا جیسے انھوں نے ہیروئن کا ہاتھ چوما ہے۔

فلم 'آوارہ' میں انھوں نے اپنے بڑے بیٹے راج کپور کے باپ کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کے بعد اُن کے کریکٹر ایکٹر کے کرداروں کا دور شروع ہو گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1943 میں فلم 'اشارہ' میں ان کی ہیروئن ثریا بنی تھیں اور ثریا کی عمر اس وقت صرف تیرہ برس تھی۔ اس فلم میں پرتھوی راج کا ایک ڈائیلاگ...... 'جیو چھمیا......' بہت مقبول ہوا تھا اور فلم کی کامیابی کا حصہ بنا تھا۔ بعد میں ثریا نے راج کپور کے ساتھ بھی ہیروئن کے بطور کام کیا۔

پرتھوی راج کپور اپنے آپ میں ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ محفلوں میں ان کا اپنا ہی الگ رنگ ہوتا تھا۔ ادب، موسیقی، ڈرامہ، مذہب، شاعری، غرض ہر موضوع میں ان کی دلچسپی تھی۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کا 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' اُن کو ازبر تھا۔

29 رمئی 1972 کو پرتھوی راج کپور کا انتقال بمبئی میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد اُن کی زندگی بھر کی فلمی خدمات کے لیے اُن کو حکومت ہند کی طرف سے 1971 کے 'داداصاحب پھالکے ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا، جو اُن کے بڑے بیٹے راج کپور نے حاصل کیا۔ بعد از مرگ یہ اعزاز حاصل کرنے والے پرتھوی راج کپور پہلے ہندوستانی اداکار تھے۔

■

Anees Amrohvi
F - 5, First Floor, Jawahar Park (W)
Laxmi Nagar, DELHI - 110092
Ph:-(011)22442572, 9811612373
Email:- qissey@rediffmail.com

ادبی کوئز

زیب النساء سعید

(1) 'حلقۂ ارباب ذوق' پہلے کس نام سے قائم ہوا تھا؟
(الف) شام شعر یاراں (ب) بزم افسانہ گویاں
(ج) بزم شعر گویاں (د) حلقۂ ارباب ادب

(2) بیگمات اودھ کے مکتوبات 'مخزن اسرار سلطانی' کے نام سے کس نے مرتب کیا ہے؟
(الف) منشی امتیاز علی نجیب (ب) سید تسکین کاظمی
(ج) انتظام اللہ شہابی (د) عبدالرؤف عشرت

(3) میر علی اوسط رشک کس کے شاگرد تھے؟
(الف) ناسخ (ب) امیر مینائی
(ج) مصحفی (د) اسیر

(4) 1931 میں خاکسار تحریک کا آغاز کس نے کیا تھا؟
(الف) سجاد ظہیر (ب) محمد علی جوہر
(ج) عنایت اللہ مشرقی (د) ابوالکلام آزاد

(5) 'مکتوبات اردو کا ادبی تاریخی ارتقا' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ کس نے لکھا تھا؟
(الف) محمد اکرم چغتائی (ب) خواجہ احمد فاروقی
(ج) پروفیسر نذیر احمد (د) ڈاکٹر سیدہ جعفر

(6) 'تاریخ تصوف' کس کی کتاب ہے؟
(الف) یوسف سلیم چشتی (ب) پروفیسر لطیف اللہ
(ج) عبدالماجد دریابادی (د) غلام جیلانی برق

(7) ان میں سے کون سی کتاب نیاز فتح پوری کی نہیں ہے؟
(الف) من ویزداں (ب) انتقادیات
(ج) مالہ وماعلیہ (د) تنقیدی مقالات

(8) 'مغربی شعریات' کس کی کتاب ہے؟
(الف) سید عبداللہ (ب) محمد ہادی حسین
(ج) وقار احمد رضوی (د) جمیل جالبی

(9) ان میں سے کون سی کتاب وزیر آغا کی نہیں ہے؟
(الف) تخلیقی عمل (ب) اردو شاعری کا مزاج
(ج) وقت کی راگنی (د) ساختیات اور سائنس

(10) عطیہ فیضی کی خودنوشت کا کیا نام ہے؟
(الف) روداد چمن (ب) زمانۂ تحصیل
(ج) آئینے کے سامنے (د) کتاب زندگی

(11) یہ شعر کس کا ہے؟
ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوک گیاہ
مثال قطرۂ شبنم رہے رہے نہ رہے
(الف) داغ دہلوی (ب) میر تقی میر
(ج) سودا (د) نظیر اکبرآبادی

(12) دلی کالج کا قیام کب عمل میں آیا تھا؟
(الف) 1791 (ب) 1792
(ج) 1793 (د) 1794

(13) 1863 میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کہاں قائم کی تھی؟
(الف) غازی پور (ب) علی گڑھ
(ج) لکھنؤ (د) دہلی

(14) ان میں سے کون سی کتاب عندلیب شادانی کی نہیں ہے؟
(الف) تحقیقات (ب) تحقیق کی روشنی میں
(ج) اردو غزل (د) عہد حاضر اور غزل گوئی

(15) جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد کا قیام کب عمل میں آیا؟
(الف) 1914 (ب) 1915
(ج) 1916 (د) 1917

(16) انجمن ترقی اردو کب قائم ہوئی تھی؟
(الف) 1903 (ب) 1904
(ج) 1905 (د) 1906

(17) ہندوستانی اکادمی الہ آباد کب قائم کی گئی تھی؟
(الف) 1924 (ب) 1925
(ج) 1926 (د) 1927

(18) گارساں دتاسی کے سالانہ خطبات کا آغاز کب سے ہوا تھا؟
(الف) دسمبر 1948 (ب) دسمبر 1849
(ج) دسمبر 1850 (د) دسمبر 1851

(19) 'خلاصۃ التواریخ' کس کی کتاب ہے؟
(الف) منشی سبحان رائے (ب) عطا حسین خان تحسین
(ج) میر امن دہلوی (د) حیدر بخش حیدری

(20) علامہ اقبال کو شاعر مشرق کی بجائے شاعر پنجاب کس نے لکھنا شروع کیا تھا؟
(الف) جوش ملیح آبادی (ب) خواجہ حسن نظامی
(ج) فراق گورکھپوری (د) کلیم الدین

(21) 'شیش محل' نام سے خاکوں کا مجموعہ کس ادیب کا ہے؟
(الف) شوکت تھانوی (ب) ممتاز مفتی
(ج) شاہد احمد دہلوی (د) محمد طفیل

(22) اردو میں لسانی تشکیلات کی تحریک کا آغاز کس عشرے میں ہوا؟
(الف) 1950 (ب) 1960
(ج) 1970 (د) 1980

(23) 'آخری داستاں گو' کس کا ناول ہے؟
(الف) مظہر الزماں خان (ب) عشرت ظفر
(ج) غضنفر (د) پیغام آفاقی

(24) ان میں کون سی کتاب انیس ناگی کی نہیں ہے؟
(الف) نیا شعری افق (ب) شعری لسانیات
(ج) تنقید شعر (د) انداز نظر

(25) ان میں سے کون سی کتاب قاضی افضال حسین کی ہے؟
(الف) جدید اردو مابعد جدید تنقید
(ب) تحریر اساس تنقید
(ج) زبان اور استعاراتی زبان
(د) مابعد جدید شعر

(26) یہ شعر کس کا ہے؟
ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا
(الف) داغ دہلوی (ب) حسرت موہانی
(ج) میر درد (د) بہادر شاہ ظفر

(27) حافظ محمد شیرانی کی تحقیق کے مطابق 'خالق باری' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) امیر خسرو (ب) ضیاء الدین خسرو
(ج) احمد سراوی (د) حیدر حسن مرزا

(28) باری علیگ کا انتقال کب ہوا تھا؟
(الف) 1946 (ب) 1947
(ج) 1948 (د) 1949

(29) کائنات اور اس کے عناصر و متعلقات سے متعلق تالیف 'رسالہ کائنات' کس کی ہے؟
(الف) خلیل خان اشک (ب) بینی نارائن جہاں
(ج) ناصر علی خان واسطی (د) مظہر علی خان ولا

(30) 1964 میں شائع شدہ کتاب 'شاہ حاتم: حالات و کلام' کو کس نے ترتیب دیا تھا؟
(الف) ڈاکٹر عبدالحق (ب) ڈاکٹر صادق
(ج) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (د) رشید حسن خان

(31) 'تذکرہ ہمیشہ بہار' کس کا لکھا ہوا تذکرہ ہے؟
(الف) کشن چند اخلاص (ب) منشی امام بخش
(ج) سراج الدین خان آرزو
(د) عبدالواسع ہانسوی

(32) ان میں کون سا مجموعہ کلام حفیظ جالندھری کا نہیں ہے؟
(الف) نغمہ زار (ب) سوز و ساز
(ج) چراغ سحر (د) شعلہ و شبنم

(33) رام بابو سکسینہ کی کتاب 'تاریخ ادب اردو' کا انگریزی میں پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا تھا؟
(الف) 1925 (ب) 1914
(ج) 1927 (د) 1928

(34) آل احمد سرور کی خودنوشت کا کیا نام ہے؟
(الف) خواب باقی ہیں (ب) داستاں میری
(ج) غبار کارواں (د) میں کیا میری حیات کیا

(35) مشفق خواجہ کا اصلی نام کیا تھا؟
(الف) خواجہ محی الدین (ب) خواجہ عبدالحی
(ج) خواجہ مشفق الرحمٰن (د) خواجہ عبدالرحمٰن

(36) 'یہودی کی لڑکی' کس کا ڈراما ہے؟
(الف) حکیم احمد شجاع (ب) پطرس بخاری
(ج) احمد عباس (د) آغا حشر کاشمیری

(37) میر مہدی حسن مجروح کے والد کا نام اور کلام تذکروں میں ملتا ہے۔ان کا نام کیا تھا؟
(الف) میر حسن نگار دہلوی (ب) میر مہدی شاد دہلوی
(ج) مہدی حسن دہلوی (د) شاہ مہدی حسن

(38) غالب کے شاگرد میاں داد خان سیاح جو ابتدا میں عاشق تخلص کرتے تھے، کا اصل وطن کہاں تھا؟
(الف) دہلی (ب) حیدرآباد
(ج) اورنگ آباد (د) آگرہ

(39) ان میں سے کون شاعر کسی خاندانی غلط فہمی یا بدنامی کے باعث اپنے والد کے ہاتھوں قتل ہوئے؟
(الف) انعام اللہ خان یقین
(ب) شاہ ظہور الدین حاتم
(ج) عبدالحی تاباں (د) قاضی محمود بحری

(40) نجم الدین شاہ مبارک آبرو کس مشہور صوفی بزرگ کے پوتے تھے؟
(الف) سید عبداللہ شاہ (ب) محمد غوث گوالیاری
(ج) قطب الدین بختیار کاکی (د) حافظ احمد شاہ

(41) شبلی نعمانی کی کتاب 'المامون' کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ کس نے لکھا ہے؟
(الف) مولوی عبدالحق (ب) مولوی نذیر احمد
(ج) مولوی ذکاءاللہ (د) سرسید احمد خان

(42) ان میں کون سا سفرنامہ اردو کا پہلا سفرنامہ ہے؟
(الف) زادِ غریب (ب) آئینہ سکندری
(ج) نیرنگ چین (د) عجائباتِ فرنگ

(43) ان میں سے کون سی کتاب مولانا ابوظفر ندوی کی نہیں ہے؟
(الف) ادبیات اردو (ب) تاریخ خاندان عربی
(ج) سفرنامہ برما (د) تاریخ اولیائے گجرات

(44) ان میں سے کس کو ساہتیہ اکادمی کا انعام مل چکا ہے؟
(الف) جیلانی بانو (ب) جوگندر پال
(ج) رتن سنگھ (د) گیان سنگھ شاطر

(45) ان میں سے کون سی کتاب سید ولی اشرف صبوحی کی نہیں ہے؟
(الف) آدم زاد (ب) ولی کی چند عجیب ہستیاں
(ج) غبار کارواں (د) جھروکے

(46) آغا حشر کاشمیری کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟
(الف) سری نگر (ب) بنارس
(ج) دہلی (د) جموں

(47) ہندوستان کا بڑا ادبی انعام سرسوتی سمان 2007 میں کس کو ملا تھا؟
(الف) شمس الرحمٰن فاروقی (ب) گوپی چند نارنگ
(ج) نیر مسعود (د) سید محمد اشرف

(48) ان میں سے کس کو گیان پیٹھ ایوارڈ نہیں ملا؟
(الف) ندا فاضلی (ب) شہریار
(ج) فراق گورکھپوری (د) قرۃ العین حیدر

(49) آل احمد سرور کا انتقال کب ہوا؟
(الف) 9 فروری 2002 (ب) 8 فروری 2003
(ج) 9 فروری 2004 (د) 9 فروری 2005

(50) بچوں کا ہفت روزہ رسالہ 'پھول' اور خواتین کے لیے ماہ نامہ 'تہذیب نسواں' کس نے جاری کیا تھا؟
(الف) سید امتیاز علی تاج (ب) مولوی ممتاز علی
(ج) اکبری بیگم (د) صغرا ہمایوں مرزا

صحیح جوابات

1. ب	2. الف	3. الف	4. ج	5. ب
6. الف	7. الف	8. ب	9. ج	10. ب
11. ج	12. ب	13. الف	14. ج	15. د
16. الف	17. د	18. ج	19. الف	20. ب
21. الف	22. ب	23. الف	24. د	25. ب
26. الف	27. ب	28. د	29. الف	30. ج
31. الف	32. د	33. ج	34. الف	35. ب
36. د	37. الف	38. ج	39. الف	40. ب
41. د	42. د	43. الف	44. د	45. الف
46. ب	47. ج	48. الف	49. الف	50. ب

Dr. Zaibun Nisa Sayyed
Head, Deptt. of Urdu, C.M.P. Degree College
(Allahabad University), Allahabad - 211002 (UP)

تبصرہ و تعارف

قدیم علم الامراض

مصنف : ملک واثق امین

صفحات : 132، قیمت :40 روپے، سنہ اشاعت : 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی

مبصر: راشد جمال فاروقی، سی 1452، آئی ڈی پی ایل ٹاؤن شپ ویربھدر (رشی کیش)، ضلع دہرہ دون 249202 (اترا کھنڈ)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی متعدد اسکیموں کے تحت آج اردو دنیا میں ایک غیر معمولی چہل پہل اور انقلاب کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اردو کی نصابی اور درسی کتب کی آسان فراہمی بھی ایسا ہی ایک منصوبہ ہے۔ زیرتبصرہ کتاب اسی اسکیم کے نتیجے میں طبیہ کالج کے طلبا کے لیے شائع کی گئی ہے۔ بہت بہتر انداز میں اور بے حد کم قیمت پر طلبا کی ضرورت اس کتاب سے پوری ہوگی۔ کتاب کی تیاری میں جن کتب سے مدد لی گئی ہے وہ کچھ یوں ہیں۔ ترجمہ قانون شیخ (سید غلام حسنین کنتوری)، علم الامراض (حکیم سید ظل الرحمٰن)، اصول طب (حکیم کمال الدین حسین ہمدانی)، موجز القانون (حکیم کوثر چاندپوری)، کلیات ابن رشد)، کلیات نفیسی (حکیم کبیرالدین اورنظریات و فلسفہ طب وغیرہ۔

یہ کتاب طبیہ کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے اس کے نظری حصے کے تین پہلو ہیں۔ قدیم علم الامراض، جدید علم الامراض اور علم الجراثیم۔ قدیم علم الامراض پر حکیم سید ظل الرحمٰن کی کتاب نایاب ہوچکی تھی اور حکیم ہمدانی کی اصول طب نیز حکیم کوثر چاندپوری کی 'موجز القانون' پورے مضمون کا احاطہ کرنے سے قاصر تھی۔ لہٰذا حکیم واثق امین نے طلبا کی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب لکھی۔ وہ یہ خوش خبری بھی دیتے ہیں کہ قومی اردو کونسل میں جدید علم الامراض اور علم الجراثیم پر درسی کتابیں جلد شائع کرنے پر کام جاری ہے۔ نیز یہ کہ عملی نصاب کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک اہم کتاب 'رہنمائے معمل' پہلے ہی شائع ہوکر طلبا میں مقبول ہوچکی ہے۔

کتاب میں ترتیب وار تفصیل کے ساتھ علم الامراض کی تعریف اسے جاننے کا سبب مرض کے ہمارے جسم پر مرتب ہونے والے اثرات اور مرض کے نتیجے میں جسم کی غیرطبعی حالت جسے طبی زبان میں 'عرض' کہا جاتا ہے ان تمام باتوں کو آسان زبان میں سمجھایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں انسانی بدن کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حکیم جالینوس کے نزدیک صحت، مرض اور لامرض تین حالتیں ہیں جبکہ ابن سینا صحت اور مرض صرف دو حالتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ باب 3 میں مرض کی قسمیں (مفرد اور مرکب) اور ان کی علامات بتائی گئی ہیں۔ مزاج بگڑ جانے یعنی سوء مزاج، اعضا کی ساخت میں بگاڑ یعنی سوء ترکیب، اعضا کی ساخت الگ الگ ہوجانے یعنی تفرق اتصال پر بحث کی گئی ہے۔ امراض کی وجہ تسمیہ یعنی امراض کے نام کس طرح رکھے گئے ہیں ان کا دلچسپ بیان بھی عام قاری کو لطف اندوز کرتا ہے اور معلومات میں قیمتی اضافے کا سبب بنتا ہے۔ باب 7 میں ان اسباب کا تذکرہ ہے جو انسانی زندگی کے لیے لازم ہیں یعنی 'اسباب ستہ ضروریہ' عربی میں چھ کوستہ کہتے ہیں۔ یہ اسباب یوں ہی: (1) ہوا، (3) مشروب (3) حرکت و سکون بدنی (4) حرکت وسکون نفسانی (5) نینداور بیداری (6) استفراغ واحتباس یعنی بدن موادکا اخراج یا اخراج کا رک جانا، باب 8 میں اسباب غیرضروریہ جسے ڈوب جانے جل جانے یا زہر کا شکار ہوجانے کا ذکر ہے۔ باب 9 میں ورم کے اسباب تفرق اتصال کے اسباب خشونت (عضو کے کھردرے پن) اور سلاست (سطح کے چکنے پن) کے اسباب، درد (وجع) کے اسباب، اقسام اثرات ونتائج وتسکین درد کے اسباب، ضعف اعضا کے اسباب سمجھائے گئے ہیں۔ باب 10 علم العلامات ہے۔ انسانی جسم کی تین علامات صحت، مرض اور حالتِ ثالثہ کے علاوہ ان علامات کا ذکر بھی ہے جن کی مدد سے مزاج کو پہچانا جاتا ہے۔ انھیں علاماتِ امزجہ کہتے ہیں۔ آخری باب میں بقراط کے نظریہ اخلاط کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ خلط وہ رطب سیال ہیں جو غذا کے ہضم ہونے کے نتیجے میں بدن کے تغذیہ کا سبب بنتے ہیں۔ آج سے ڈھائی ہزار سال قبل بقراط نے اپنی کتاب 'طبیعت الانسان' میں چار اخلاط گنائے ہیں دم یعنی خون، بلغم، صفراء، اور سودا ان چاروں کا متوازن تناسب صحت کا ضامن ہے اور ان کی ترتیب بگڑ جانا ہی بیماریوں کی وجہ بن جاتا ہے۔

واجبی سی قیمت میں یہ دلچسپ کتاب سہل زبان کے ذریعے عام قاری کو بھی بہت کچھ سمجھانے میں کامیاب ہے لیکن یہ لکھی گئی ہے طبیہ کالج کے طلبا کے لیے۔ لہٰذا مجھ جیسے قارئین کے لیے اس میں کچھ زیادہ تلاش کرنا کارعبث ہی ہوگا۔ ہاں طب کے طلبا کو قومی اردو کونسل کا احسان مند ضرور ہونا چاہیے کہ فی زمانہ جب ایک معمولی سی (نوٹ بک (کاپی) بھی پچاس روپیہ سے کم میں دستیاب نہیں ہے ایسے میں ایک قیمتی درسی کتاب انھیں صرف چالیس روپے کی حقیر رقم میں میسر آرہی ہے۔ اس قسم کی نصابی کتابیں طلبا کی مالی مدد کے زمرے میں آئیں گی۔

زبان و ترسیل (اردو پرنٹ اور برقی میڈیا کا لسانیاتی مطالعہ)

مصنف : ایم جے وارثی، مترجم : امتیاز وحید

صفحات: 180، قیمت: 97 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی

مبصر: طفیل علیمی، مکان نمبر 122، گلی نمبر 1، ذاکر نگر، نئی دہلی 25

زیرتبصرہ کتاب زبان وترسیل (اردو پرنٹ اور برقی میڈیا کا لسانیاتی مطالعہ) ایم جے وارثی کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'اردو برقی اور پرنٹ میڈیا: ایک تعارف' ہے، جس میں مرحلہ وار اردو الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے اردو پرنٹ میڈیا کے ارتقا کے مراحل کو تین ادوار 1882 سے 1900، 1901 سے 1947 اور 1947 سے تاحال میں تقسیم کیا ہے۔ اسی باب میں 'اردو پرنٹ میڈیا کے تاریخی ارتقا سے بحث'، 'اردو پرنٹ میڈیا کے معاشرتی ثقافتی پہلوؤں کا احاطہ'، 'اردو پرنٹ میڈیا کے لسانی مسائل سے مباحثہ'، 'اردو پرنٹ میڈیا کے ترسیلی

پہلوؤں پر نظر ذیلی عناوین کے تحت اردو پرنٹ میڈیا پر ہونے والے کاموں کی درجہ بندی کی گئی ہے اور آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس اور دوردرشن کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے۔

دوسرے باب 'زبانی اور تحریری ترسیلی نیٹ ورک کے لسانی عناصر' میں لسانی سلیقے یا لسانی جوڑ توڑ کو پیش کیا گیا ہے، اردو نیوز ایڈیٹر کی ترسیلی حکمت عملیوں کے استحکام کے لیے لسانی سلیقہ کا تعین کیا گیا ہے اور یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ لسانی سلیقہ ناموزونیت اور غیر یکسانیت کے امکان میں کمی پیدا کرتا ہے اور پیغام کو غیر معمولی بناتا ہے۔ تیسرے باب 'شماریاتی ابعاد: لغوی انتخاب' میں اردو نیوز میڈیا کی لغوی شقوں کے ترسیلی حد کی پیائش کے لیے شماریاتی تکنیکوں کا اطلاق کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ علامت یا نشان اور اسلوب پیغام کی تشکیل میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ چوتھے باب 'الفاظ و معانی رشتوں کے نفسیاتی لسانی زاویے' میں لفظ و معنی کے رشتے کے ہندوستانی اور مغربی نظریات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے فلسفۂ ماہیت اور فلسفۂ عدم ماہیت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندوستانی فلسفی بھارتی ہری کے نظریہ پر بحث کی گئی جس میں وہ زبان کو ایک ساکت صوت رکنی کی حیثیت نہیں تصور کرتا ہے بلکہ اسے ایک عمل خیال کرتا ہے۔ اسی طرح کچھ مغربی فلسفیوں کے نظریات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اسی باب میں نظریۂ معنیاتی افتراق اور نظریۂ وصف کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ کتاب کے پانچویں اور آخری باب 'ضابطۂ ترسیل اور ترسیلی تصور پر اس کا اثر' میں مصنف نے ساختیاتی رشتے کے دائرہ میں ترسیلی تصور کا نظریاتی جائزہ لیا ہے۔ اسی باب میں 'ذہنی ماڈل اور ترسیلی تصور'، 'ترسیلی تصور کے مطالعے میں منہاجیاتی مسائل اور ترسیلی قوت فہم'، 'ترسیلی تصور سے متعلق قیاسی بنیاد'، 'مبہم ساختوں میں ساختیاتی رشتے' اور 'ترسیلی تصور: ایک لسانی تناظر' عناوین کے تحت مدلل گفتگو کی گئی ہے۔

امید ہے کہ زیر نظر کتاب اپنے قاری کو متوجہ کرے گی۔ بالخصوص ریسرچ اسکالرس کے لیے کافی مفید ثابت ہوگی۔ ساتھ ہی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی مبارکباد کی مستحق ہے کہ کونسل نے مذکورہ کتاب شائع کر کے اردو قاری کو اردو پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے لسانیات کی تفہیم کے لیے راہ ہموار کی ہے۔ زیر نظر کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے، لیکن سادہ و سلیس زبان ہونے کی وجہ سے اس بات کا قطعی اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ دوسری زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

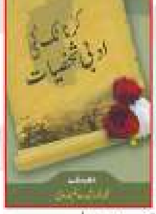

کرناٹک کی ادبی شخصیات

مصنف: محمد خورشید عالم ندوی

صفحات: 185، قیمت 99 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تبصرہ نگار: ڈاکٹر منور حسن کمال / G-5/A - بیت الراضیہ، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

اردو ادب نے ہندوستان کے شمال و جنوب میں اپنے ابتدائی زمانے سے ہی ترقی کے منازل طے کیے ہیں۔ جنوبی ہند کی خدمات کا قلم و کاغذ سے رشتہ بھی اتنا ہی پرانا ہے، جتنا اس کا پھیلاؤ شمالی ہند میں ہے۔ 'کرناٹک کی ادبی شخصیات' ہمیں جنوبی ہند کی اہم ادبی شخصیات کے تعارفی خاکوں اور اردو کے تئیں ان کے گراں قدر ادبی کارناموں سے نہ صرف متعارف کراتی ہیں، بلکہ وہاں اردو کی صورت حال اور اس کے پھلنے پھولنے کے انداز و معیارات سے بھی روشناس کراتی ہیں۔ اس کتاب کے مصنف محمد خورشید عالم ندوی ہیں۔ خورشید عالم ایک ریسرچ اسکالر ہیں۔ ان کی تحقیق کا موضوع 'مجاہد آزادی مولانا عبدالرزاق: حیات و خدمات' ہے۔ ان کے اکثر مضامین اردو، انگریزی کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کے زیر اہتمام ان کی کتاب 'فخر کرناٹک شخصیات اور فکر و نظر' شائع ہو چکی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں حتی الامکان کوشش کی ہے کہ شخصیت کے تعارف سے متعلق تمام ضروری باتیں زیر قلم آجائیں تاکہ قاری کو تشنگی کا احساس نہ ہو۔ ترتیب میں تقدیم و تاخیر کے لیے زمانۂ وفات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی جس کا انتقال پہلے ہوا اس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور جس کا انتقال بعد میں ہوا ہے، اس کا تذکرہ بعد میں آیا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تقدیم و تاخیر کے لیے قاری اپنی پسندیدہ شخصیت سے قرب کے سبب اس کے بعد میں آنے پر کبیدہ خاطر نہیں ہوتا اور مصنف بھی ان الزامات سے بچ جاتا ہے کہ اس نے اپنی پسندیدہ شخصیات کو پہلے جگہ دی ہے۔

'کرناٹک کی ادبی شخصیات' میں آٹھ شخصیتوں پر خورشید عالم نے قلم اٹھایا ہے وہ شخصیتیں بالترتیب محمد قاسم غم، محمد شریف، محمد یوسف نفیس بنگلوری، سید غوث محی الدین، ممتاز شیریں، سلیمان خطیب، محمود ایاز اور حمید الماس ہیں۔ ان شخصیتوں نے اردو ادب کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ بڑی حد تک ناقابل فراموش ہیں۔ یہ لوگ ایک اچھے ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے انسان بھی تھے۔ یہی سبب ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کرناٹک کی ادبی شخصیات کو پورے اہتمام سے شائع کرنے کے لیے محمد خورشید عالم ندوی کی خدمات حاصل کیں اور مصنف نے بھی بڑی عرق ریزی سے ان شخصیتوں سے متعلق مواد جمع کر کے اردو والوں کی جانب سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔

محمد خورشید عالم ندوی نے اس معنی میں اپنی کتاب میں جو اگرچہ روایتی تذکرے سے شروع ہوتی ہے، لیکن اس کو اس انداز سے آگے بڑھایا ہے کہ وہ ادب، ادیب اور قاری کے درمیان ایسا رشتہ ہموار کرتے چلے جاتے ہیں، جس سے قاری کو ادب، ادیب اور شاعر کے رشتے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ان کے مقام و مرتبے کا تعین آسانی سے کرتا چلا جاتا ہے۔

خورشید عالم کی زبان سادہ اور عام فہم ہے، انھوں نے مذکورہ شخصیات پر اس کتاب میں اتنا مواد جمع کر دیا ہے کہ ریسرچ اسکالروں کی رہنمائی کے لیے کافی نظر آتا ہے اور وہ اس کتاب کے صفحات کے توسط سے ان شخصیتوں کے دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں یقیناً آسانی محسوس کریں گے۔ مثلاً ہمیں اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جنوب کے اولین دینی اخبار 'منشور محمدی' کے مدیر محمد قاسم غم اور انہی کے ہم رکاب محمد شریف رہے ہیں۔ دکنی زبان و ادب کے ترجمان اور ممتاز مزاحیہ شاعر سلیمان خطیب ہیں۔ ممتاز شیریں سے تو ایک زمانہ واقف ہے۔ میدان صحافت میں روزنامہ 'الکلام' کے بانی و مدیر سید غوث محی الدین ہیں۔ محمد یوسف نفیس ماہر عروض ہیں، محمود ایاز نظم و نثر دونوں پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نقاد بھی تھے اور نرم لہجے کے منفرد شاعر حمید الماس بھی جنوبی ہند میں اردو ادب کے خدمت گزاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

یقین کیا جانا چاہیے کہ 'کرناٹک کی ادبی شخصیات' نہ صرف محمد خورشید عالم ندوی کی ناموری کا ذریعہ بنے گی، بلکہ مذکورہ ادبی شخصیات کی خدمات کو عام لوگوں تک پہنچانے میں بھی اہم رول ادا کرے گی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

نمونۂ ورق

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail::ncpulsaleunit@gmail.com,sales@ncpul.in

شبلی، مکاتیب شبلی اور ندوۃ العلما

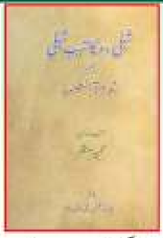

تحقیق وتدوین: عمیر منظر
صفحات: 184، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: شبلی اکیڈمی دارالمصنفین، اعظم گڑھ
مبصر: زبیر خان سعیدی، شاہین باغ، نئی دہلی

ہماری علمی اور ادبی روایات میں جو شخصیات سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں ان میں علامہ شبلی نعمانی (1857-1914) کا نام نمایاں ہے۔ شعروادب کے پارکھ اور سیرت نگار کے ساتھ ساتھ ان کا شمار ممتاز دانش ور کے طور پر بھی کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ملک کی مختلف یونی ورسٹیوں کا تعلیمی نصاب مرتب کیا نیز بہت سی جامعات کے لیے نصابی لائحہ عمل بھی ترتیب دیا۔ علی گڑھ اور ندوۃ العلما سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے۔ علی گڑھ میں انھوں نے ایک معلم کے طور پر زندگی کا ایک اہم عرصہ گزارا تو ندوۃ العلما کے موسس کے طور پر اس ادارے کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کردیں۔ یہ ساری سرگزشت 'حیات شبلی' کے علاوہ مکاتیب شبلی میں دیکھی اور پڑھی جاسکتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب شبلی، مکاتیب شبلی اور ندوۃ العلما ان منتخب مکاتیب کا مجموعہ ہے جو علامہ شبلی نعمانی نے ندوۃ العلما کے بارے میں اپنے احباب، شاگردوں اور دیگر عمائدین کو لکھے تھے۔ ان خطوط کو ڈاکٹر عمیر منظر نے زمانی اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ انھوں نے تعلیقات وحواشی کا بھی اہتمام کیا ہے۔ عربی وفارسی کی عبارتوں کے تراجم کے ساتھ ساتھ مکتوب الیہ کا سوانحی تعارف بھی کتاب کے آخر میں دیا گیا ہے۔ صفحہ 73 پر نواب سید علی حسن خاں کے نام شبلی نے ایک خط میں لکھا ہے'' آپ حضرت عمر کی طرح دریا سے ڈرتے ہیں'' جس کتاب سے یہ خط یہاں شامل کیا گیا ہے اس میں اس جملے سے متعلق کوئی وضاحت نہیں ملتی البتہ ڈاکٹر عمیر منظر نے تلاش وجستجو کے بعد نقوش کے مکاتیب نمبر کا وہ حاشیہ کتاب میں شامل کردیا ہے جو مذکورہ بالا خط کے ساتھ تھا۔ اس سے فاضل مرتب کی تحقیق وجستجو کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک قابل قدر کوشش ہے۔

ابتدائیہ کے عنوان سے کتاب کے آغاز میں جو تحریر فاضل مرتب نے پیش کی ہے اس سے تعلیمی میدان میں شبلی کی کاوشوں کا بہت واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے جس سے شبلی کی عبقریت اور ان کی دانشورانہ سوچ کا بھی صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ بارہ صفحات پر مشتمل اس 'ابتدائیہ' کو شبلی کی دردمندانہ تعلیمی سرگرمیوں کا اجمالی خاکہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ فاضل مرتب نے جس دردمندی کے ساتھ اجمالا یہ تعلیمی خاکہ پیش کیا ہے وہ بھی کمال ہے۔ قارئین کو ان بارہ صفحات کے مطالعے سے شبلی کی تعلیمی سرگرمی، ندوہ کے سلسلے میں ان کی فکرمندی اور نصاب تعلیم کے مسئلے پر ایک حساس فرد کی دردمندی کا احساس ہوگا۔ المختصر ڈاکٹر عمیر منظر نے پوری لگن، ایمان داری اور کمال جستجو سے ان صفحات کو آراستہ کیا ہے۔ فاضل مرتب کی اس بات سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ ''تعلیم کی یہ موجودہ دوئی اس قدر بھیانک نہ ہوتی۔ ندوہ صرف مدرسہ ہی نہیں رہتا بلکہ اس کی حیثیت مدارس کے ایک وفاق کے ایک مرکز کی ہوتی اور اس سے پورے ملک کے مدارس کو فائدہ پہنچتا ''لیکن اس سے قبل ایک 'اگر' بھی ہے۔ اگر شبلی کی بات پر عمل پیرا ہونے کو یقینی بنایا گیا ہوتا۔ ان مکاتیب کے حوالے سے ندوۃ العلما کی تعمیر، ترقی اور نصاب تعلیم سے متعلق جو کوششیں کی جارہی تھیں اس کو بالترتیب دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

شبلی نے ندوۃ العلما سے متعلق، افراد، ارکان کو جس دلسوزی اور گہری دردمندی کے ساتھ خطوط لکھے ہیں وہ شبلی کا ہی حصہ ہے۔

مولانا آزاد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں'' ایک مرتبہ ندوہ میں اعلان کردیجیے کہ میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر ندوہ کے آستانے پر آبیٹھوں اور اپنی تمام عمر اسی کی خدمت میں صرف کردوں (ص 32) کتاب میں سب سے زیادہ خطوط مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام ہیں۔ شروانی صاحب علامہ شبلی کے خاص دوستوں میں تھے۔ وہ ان کو ہر مشورہ میں شریک کرتے تھے اور ان کو ہر بات لکھتے بھی تھے چاہے وہ شروانی صاحب کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کے نزدیک ندوہ کا مقصد بہت عظیم تھا اس کے سامنے سب ہیچ۔ شروانی صاحب کو ایک خط میں شبلی لکھتے ہیں ''ایک ہمارے روشن خیال شروانی ہیں، میں ان کو اپنا امام کہتا ہوں، ان کا حال یہ ہے کہ انگریزی کے نام سے ان کو لرزہ آتا ہے۔ بڑی مشکل سے مسلمانوں کو پھسلانے کی تجویز پر راضی ہوئے تو عمل درآمد میں حیران ہیں، حالانکہ تمام طالب علموں کو انگریزی پڑھانا مقصود نہیں، نہ میرا یہ خیال ہے، صرف اس قدر مقصود ہے کہ دو چار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں۔ (ص 31)

چونکہ ان تمام خطوط کا تعلق ندوۃ العلما سے ہے۔ اس لیے اس کی ابتدائی تاریخ پر ان خطوط کی اہمیت بنیادی مآخذ کی ہے۔ اس سے نہ صرف ندوہ بلکہ متعلقات ندوہ اور وہاں سے شبلی نے جو تاریخ ساز رسالہ 'الندوہ' کے نام سے جاری کیا تھا ان تمام کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ فاضل مرتب نے خطوط کو ان کے مآخذ کی نشاندہی کے ساتھ یہاں جمع کیا ہے اور خط کے اسی حصے کو نقل کیا ہے جس کا تعلق ندوہ سے ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ حوالوں کا بطور خاص اہتمام کیا گیا ہے تاکہ پورا خط اگر کوئی دیکھنا چاہے تو اصل مآخذ سے رجوع کرلے۔ خطوط کے آداب والقاب کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ سب سے آخر میں ان خطوط کو دیا گیا ہے جن پر تاریخ نہیں ہے۔

بہ اعتبار ترتیب وپیش کش لاجواب ہے اور خشک موضوع کو جس دلچسپی کے ساتھ عمیر منظر نے پیش کیا ہے وہ بھی کسی ضرب المثل سے کم نہیں ہے۔ اور شبلی کی زندگی کا ایک اہم عرصہ اپنی تمام تر علمی سرگرمیوں کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

امید ہے علمی اور ادبی دونوں حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی کی جائے گی۔

تفکر وتدبر

مصنف: محمد ایوب واقف
صفحات: 234، قیمت: 400 روپے
ناشر: تکمیل پبلی کیشن، ممبئی بھیونڈی
مبصر: محمد نوشاد عالم ندوی، F-A-14/E تیسری منزل، شاہین باغ، نئی دہلی

محمد ایوب واقف کی تصنیف 'تفکر وتدبر' سے قبل بھی کئی کتابیں منظر عام پر آکر قبولیت کا درجہ حاصل کرچکی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے تمام مشمولات بہت اچھے ہیں۔ 14 مضامین پر مشتمل 'تفکر وتدبر' میں ہمیں سب سے زیادہ اگر کسی چیز نے متاثر کیا اور کچھ سیکھنے کا موقع فراہم کیا ہے تو وہ ہے گوپی چند نارنگ کا دیباچہ، ممبئی میں اردو افسانے کا ارتقا، ترقی پسند تحریک اور ممبئی، اردو کے نامور محقق، اور اردو اکیسویں صدی میں، کتاب کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف محمد ایوب واقف نے اس کتاب کی ترتیب میں نئی نسل کے اردو داں طبقے کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھ کر ان کی دلچسپی میں اضافے کے ساتھ ساتھ علم میں بھی اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ علی میاں ندوی کے حوالے سے جو مضمون اس کتاب میں شامل ہے وہ بصیرت افروز ہے۔ اس سے وہ لوگ جو اپنے اس مربی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں انھیں مجموعی طور پر اتنا تو علم ہوجائے گا جس کا جاننا ہر ایک کے لیے ضروری ہے ایسے لوگوں کو اس کے لیے نہ تو جامعہ کی لائبریری کی خاک چھاننا پڑے گی یا نہ ہی خدابخش لائبریری کا سہارا لینا پڑے

گا بلکہ علم کی اتنی سی پیاس 'تفکر و تدبر' سے ہی بجھائی جا سکتی ہے۔

'فیض احمد فیض کی بین الاقوامی اہمیت' کے حوالے سے لکھا گیا مضمون بھی کافی اچھا ہے۔ اس کے بارے میں اگر میں ایک طالب علم کی حیثیت سے بات کروں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ فیض احمد فیض کے بارے میں جتنی باتیں محمد ایوب واقف نے اس مضمون میں اکٹھا کر دی ہیں اس کے لیے طلبہ کو کم سے کم 5 بار لائبریوں کا چکر کاٹنا پڑتا اور درجنوں کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی لیکن ایسے طلبہ خاص کر بی اے اور ایم اے کے طالب علموں کی اس پریشانی کو زیر تبصرہ کتاب 'تفکر و تدبر' کے مصنف نے اس مضمون کے ذریعے دور کر دیا ہے۔

محمد ایوب واقف کی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی میری نگاہ میں یہ ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں زیادہ تر اپنے ان مضامین کو شامل کیا ہے جن کا براہ راست فائدہ طلبہ کو مل سکتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں کم وبیش وہی مضامین شامل ہیں جو آج کل بی اے اور ایم اے کے نصاب میں شامل ہیں۔

'تفکر و تدبر' (تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ) پر جب ہم عام قاری کی حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ محمد ایوب واقف کی یہ کتاب بھی دوسرے مصنفوں کی روش سے کچھ الگ نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر کتابوں کے مضامین بہت زیادہ طویل ہوتے ہیں ایسی کتابوں کے مطالعے سے آدمی گریز کرتا ہے اور اگر شروع بھی کرتا ہے تو تنگ آ کر اسے درمیان میں ہی چھوڑ دیتا ہے اور یہی حال اس کتاب میں شامل مضامین کا بھی ہے کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جو 10 (دس) یا 12 (بارہ) صفحات سے کم ہو، جب کہ عام لوگوں کی عادت یہ ہے کہ وہ کسی بھی مضمون کے مطالعے سے پہلے صفحات کی گنتی کرتے ہیں اس کے بعد مطالعہ شروع کرتے ہیں، اگر مضمون چھوٹا ہوتا ہے تو دلچسپی کے ساتھ پوری کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

233 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ناشر تکمیل پبلی کیشن ہے۔ عمدہ طباعت اور اچھے ٹائٹل کے ساتھ چھپی اس کتاب میں کچھ پروف کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں مگر کل ملا کر اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتاب عام لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بنے گی تو بے جا نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ علمی کاوشوں کی قدر کرنے والے محمد ایوب واقف کی تحریروں کو محبت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ان کی گرانقدر تحریر کی قدر افزائی بھی کریں گے۔

افسانے کے فروغ میں ماہنامہ آجکل کا کردار

مصنف: عامر نظیر ڈار

صفحات: 175، قیمت: 200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: نفیس عبدالحکیم، 151 ایم بی ہاؤس، الہ آباد یونیورسٹی

الہ آباد 211002

اردو ادب میں صنف افسانہ ایک مقبول ترین صنف رہی ہے۔ شاعری کے بالمقابل اس میں ادیب کو اپنی ذات کے درد و کرب اور سماجی مسائل کو پیش کرنے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ رسالہ آجکل 1943 سے متواتر شائع ہو رہا ہے، اس نے اپنے معیار کی وجہ سے ادبی حلقے میں اپنا ایک مقام بنالیا۔ اس نے اپنے پہلے شمارے سے ہی اردو افسانے کو جگہ دی اور مسلسل ہر شمارے میں تین چار افسانے شائع کر کے اردو افسانے کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

زیر تبصرہ کتاب دراصل عامر نظیر ڈار کے ایم فل کا مقالہ ہے۔ عامر نظیر ڈار تحقیق و تنقید کے میدان میں نووارد ضرور ہیں لیکن اس کتاب سے ان کے تحقیقی و تنقیدی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تحقیق و تنقید کے کوچے کے آداب سے واقف ہیں۔

اس کتاب کو انھوں نے تین باب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں اردو افسانہ کے پس منظر کو مختصراً بیان کیا ہے جو بہتر ہے، اس لیے کہ افسانہ کے پس منظر اور ارتقا پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ سوائے اس کی تکرار کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، نیز اس طرح سے اصل موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے اپنی توانائی کو محفوظ کر لیا۔ دوسرا باب اردو کی ادبی صحافت اور ماہنامہ آجکل ہے۔ اس میں مصنف نے صحافت کے لغوی اور اصطلاحی معنی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اپنی باتوں کو مختلف لغات سے ثابت کیا ہے۔ موجودہ دور میں صحافت کی اہمیت اور معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے ادبی صحافت کی حد بندی بھی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے بعض ناقدین اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے والے ادبی فن پارے کو ادبی زمرے میں نہیں رکھتے۔ کلیم الدین احمد وغیرہ اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں 'صحافت ادب نہیں ہے اگر یہ ادب بن جائے تو میں اس پر ضرور اظہار خیال کر سکتا ہوں'۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مصنف نے ناقدین کے مختلف اقوال کو درج کیا اور بڑے ہی بے باک انداز میں وہ خود لکھتے ہیں کہ 'ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ صحافت ادب کا حصہ نہیں ہے۔ وہی صحافت جس کو کلیم الدین احمد ادب ماننے سے انکار کرتے ہیں کیا اس میں غالب کی شاعری شائع نہیں ہوئی ہے... جب یہ شاعری اور مضامین کتابی شکل میں آئیں گے تب ہی ہم اس کو ادب تسلیم کریں گے۔ میرا ماننا ہے کہ اخبارات اور رسائل میں جو بھی غزلیں، مضامین، تبصرے، کہانیاں شائع ہوتی ہیں وہ ادب کا ایک خاص حصہ ہیں'۔

کتاب کا تیسرا باب 'آجکل کے افسانے' ہے جو کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے۔ مصنف نے اس کو تین دور میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ابتدا سے 1960 تک کے افسانے، یہ دور چوں کہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا اور ترقی پسند تحریک نے افسانے کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اس وجہ سے اس دور میں ترقی پسند خیالات کے افسانے زیادہ شائع ہوئے۔ اس دور میں شائع ہونے والے چند افسانہ نگاروں کی فہرست بھی ہے اور تین چار افسانوں کا تجزیہ بھی۔ دوسرا دور 1960 سے 1980 تک کے افسانوں پر محیط ہے۔ یہ دور جدیدیت کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں علامتی و تجریدی افسانے خوب لکھے گئے جو قاری کی سمجھ سے پرے تھے۔ مصنف نے غالباً اسی وجہ سے لکھا ہے کہ 'افسانوں کا ایک سیلاب سا آ گیا، اس سیلاب میں معیاری افسانے بھی لکھے گئے لیکن غیر معیاری افسانوں کی تعداد زیادہ تھی۔' عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی تحریک یا رجحان زوال پذیر ہوتا ہے اور اس کے بالمقابل جو رجحان سامنے آتا ہے تو لوگ اس کا ہم نوا کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہی حال ہر رجحان اور تحریک کے ساتھ ہوا۔ رسالہ آجکل کسی بھی تحریک اور رجحان سے دست بردار ہو کر شائع ہوتا رہا جیسا کہ مصنف نے بھی لکھا ہے۔ لیکن ایک جگہ لکھتے ہیں 'جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے میں ماہنامہ آجکل نے ایک ادارے کا کردار ادا کیا اور اردو تحریکات کی تاریخ میں نئی تاریخ رقم کی۔ اس رجحان کو تحریک کی شکل اختیار کرنے میں ماہنامہ آجکل نے بہت کوشش کی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس رسالے نے جدیدیت کے لیے لاؤڈ اسپیکر کا کام کیا'۔ تیسرا دور 1980 سے 2012 تک کے افسانے ہے۔ اس دور کو مابعد جدیدیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں جو افسانے شائع ہوئے، ان کے اسلوب اور موضوع پر مختصراً ذکر کرنے کے بعد اہم افسانوں کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ سابقہ ادوار کی طرح اس دور کے بھی چند افسانوں کا تجزیہ شامل ہے۔

امریکہ میں اردو کے علمبردار ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی

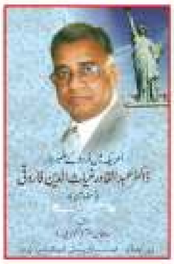

مرتب: سلطان اختر (شولاپور)
صفحات: 160، سنہ اشاعت: 2015، قیمت: 150
ناشر: اسباق پبلی کیشنز، سائرہ منزل، ول درشن، سنجے پارک، پونہ
مبصر: محمود فیصل، H-78 / 2 بٹلہ ہاؤس، اوکھلا، نئی دہلی، 110025

ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی کا شمار اردو ادب کے ان مجاہدوں میں ہوتا ہے جنھوں نے تقریباً نصف صدی سے زیادہ عرصے تک اردو ادب کی خدمت کی اور ملک سے دور رہ کر بھی خلوص نیت سے اردو کی شمع روشن کرنے میں مصروف عمل رہے۔ حالانکہ فاروقی نے امریکہ کا سفر غم دوراں کے لیے کیا تھا لیکن اس سفر میں غم جاناں بھی ان کے ہمرکاب رہا۔ امریکہ (نیویارک) میں ملازمت کے حصول کے بعد غم جاناں نے کاروبار قرطاس وقلم کی حمایت زور وشور سے شروع کردی۔ جس کی بساط کو فاروقی نے ادبی، تحقیقی، تنقیدی مضامین کے ساتھ افسانہ نگاری کے میدان تک وسیع کردیا۔ فاروقی تقریباً 25 سالوں سے امریکہ میں مقیم رہ کر اردو کی مسلسل خدمت کررہے ہیں۔ اردو سے ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ تقریباً 66 سال کی عمر میں بھی اردو کی خدمت میں محبت ومحنت سے ہمہ تن گوش ہیں۔

'امریکہ میں اردو کے علمبردار ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی' نامی کتاب میں سلطان اختر نے فاروقی پر شائع شدہ ان تمام مضامین کو یکجا کیا ہے جو وقتاً فوقتاً ان کی ادبی کاوشوں کے اعتراف میں تحریر کیے گئے۔ ان مضامین میں فاروقی کی پوری ادبی زندگی کا مکمل طور پر احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کو کئی گوشوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا گوشہ 'مضامین' کے نام سے ہے جس میں 'امریکہ میں انوار اردو، دو کالم نگاروں کا ذکر - پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی'، 'امریکہ میں انوار اردو - ڈاکٹر محبوب راہی'، 'ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی ادب شناسی - رفیق جعفر'، 'ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی - مامون ایمن'، 'ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی - حساس ادیب وافسانہ نگار - وہاب عندلیب'، 'امریکہ میں اردو کا ادبی خزانہ - میم الف سین'، 'ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی، ہمہ جہت فنکار - نثار احمد صدیقی'، 'ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی - امریکہ کے حوالے سے - نذیر فتح پوری'، 'دور جدید کے حاتم طائی - منظور وقار'، 'امت مسلمہ کے غمخوار اور اصلاحی مضمون نگار - رفیق شاہین' اور 'احمد فراز اور ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی - سلطان اختر' سمیت 11 قلمکاروں کے مضامین شامل ہیں۔ اس کے بعد دوسرا گوشہ 'ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی کی تنقیدی اور تحقیقی کتابوں سے متعلق' ہے، اس گوشے میں 'شعروادب کے مزاج آشنا، مینار ادب کی روشنی میں - رفیق شاہین'، 'اردو شاعری اور تصوف، ڈاکٹر فاروقی کے حوالے سے - اشرف شیخ'، 'امریکہ میں گلزار ادب - ڈاکٹر غضنفر اقبال' اور 'پروفیسر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی - ادبی، اصلاحی تحریریں - ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی' کے مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ اس کے بعد کا گوشہ 'ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی کے افسانوی ادب سے متعلق' ہے، جس میں 'فاروقی کے افسانے - عباس خان'، 'ادب ساز اور افسانہ طراز - فاروقی - ڈاکٹر منظر اعجاز'، 'ڈاکٹر فاروقی کے افسانے، حالات حاضرہ کے تناظر میں - ڈاکٹر عظیم راہی'، عبدالقادر فاروقی کا افسانوی مجموعہ - ڈاکٹر عبیداللہ چودھری اور 'کچھ افسانوں کے بارے میں - ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار' کی تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد 'امریکہ اور کنیڈا میں خواتین کی اردو خدمات' کا گوشہ موجود ہے۔ اس میں 'کنیڈا میں خواتین قلم کاروں کی کہکشاں - حقانی القاسمی' اور 'کنیڈا اور امریکہ میں خواتین کی اردو خدمات - ڈاکٹر شہناز صبیح' کے مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ اس کے بعد 'ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی سے ادبی مکالمہ' نامی گوشہ قائم کیا گیا ہے۔ اس میں 'پروفیسر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی سے گفتگو - شمشاد جلیل شاد' اور 'امریکہ کے ہر بڑے شہر میں اردو موجود ہے - سلطان اختر' کا مضمون شامل ہے۔ کتاب کے آخری گوشے کو 'ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کے لیے - منظوم نذرانے' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس گوشے میں منظوم نذرانے 'استقبالیہ گیت - بشیر پرواز'، 'جناب فاروقی صاحب کی آمد - شمشاد جلیل شاد'، 'منظوم خراج عقیدت - رئیس احمد پٹیل'، 'ڈاکٹر عبدالقادر شخصیت - ممتاز نادر' اور 'تو اردو کا قلندر - اثر صدیقی' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فاروقی کا ایک انٹرویو 'پروفیسر مامون ایمن سے گفتگو - ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی' اور ایک افسانہ 'انتظار - ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی' شامل ہے۔ اس کتاب میں کل 34 مضامین شامل ہیں۔

سب سے پہلے مناظر عاشق ہرگانوی کے مضمون 'امریکہ میں انوار اردو، دو کالم نگاروں کا ذکر' کو جگہ دی گئی ہے۔ اس مضمون میں ہرگانوی نے فاروقی کے مضمون پر اپنی رائے اس طرح دی ہے کہ "انھوں نے جن شخصیات کا انتخاب کیا ہے ان پر سیر حاصل لکھا ہے... ان کی تنقیدی فکر میں وسیع النظری ہے۔ وہ داخلی مفہوم تک پہنچتے ہیں اور وضاحت سے معنی خیزی پیدا کرتے ہیں... یہ کتاب اور محنت چاہتی تھی کیونکہ امریکہ کے چند ایسے نام اس کتاب میں شامل نہیں ہیں جنھوں نے صحیح معنوں میں اردو کی خدمت کی ہے۔ گل بخشالوی، محمد سالم، صوفیہ انجم تاج، قمر نقشبندی، پنہاں... وغیرہ فعال قلمکار ہیں، جنھیں اعتبار حاصل ہے۔" حقانی القاسمی کا مضمون 'کنیڈا میں خواتین قلم کاروں کی کہکشاں' بھی بہت معلومات افزا ہے۔ حقانی القاسمی نے بہت خوبصورت انداز میں رقم کیا ہے کہ "اردو سے ان لوگوں کا ایک جذباتی رشتہ ہے۔ یہ زبان ان کی روزی روٹی سے جڑی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ ان کی رابطے کی زبان اور روح کی غذا ہے۔ برصغیر میں یہ زبان مالی منفعت سے وابستہ کی جاسکتی ہے مگر کنیڈا اور ان جیسے ملکوں میں اردو معاش سے مربوط نہیں ہے، بلکہ اردو ان کی تہذیبی شناخت کا ایک حوالہ ہے۔" فاروقی کی دو تصنیفات 'امریکہ میں انوار اردو' اور 'امریکہ میں گلزار اردو ادب' کو اہمیت حاصل ہے۔ فاروقی نے اردو دنیا کو کنیڈا کی خواتین قلم کاروں کی خدمات سے بھی متعارف کرایا۔ افسانوی مجموعہ 'اور خون جلتا رہا' میں 20 کہانیاں شامل ہیں۔

اس کتاب کی ابتدا میں مرتب نے 'عرض مرتب' میں لکھا ہے کہ "... فاروقی صاحب تو اردو کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ انھیں اردو زبان، اردو ادب، اور اردو رسائل کے سوا کوئی دوسری چیز دکھائی نہیں دیتی"۔ اس کتاب کی ورق گردانی سے اردو ادب کے ایک اور معمار کی خدمات سے دنیا روشناس ہوگی۔ جس نے دیار غیر میں بھی تہذیب کی زبان کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ اس کتاب کو اسباق پبلی کیشنز، پونے نے شائع کیا ہے۔ علمی حلقوں میں اس کی پذیرائی کے روشن امکانات موجود ہیں۔

عادل اسیر دہلوی کی ادبی خدمات

مصنف: ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن
صفحات: 132، قیمت: 175 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: جاوید اختر، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف ڈاکٹر محفوظ الحسن محتاج تعارف نہیں ہیں۔ آپ درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں اور ادب پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر محفوظ الحسن نے اس کتاب کو کل 12 حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دراصل جواں سال ادیب ومصنف مرحوم عادل اسیر دہلوی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مرحوم کو خراج عقیدت

پیش کیا گیا ہے۔

'خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود' کے تحت مصنف نے تحریر کیا ہے" عادل اسیر اتنی جلدی چلے جائیں گے یہ ہم نے سوچا نہیں تھا، موت کے ایک دن پہلے تک ان سے میری باتیں ہوتی رہی تھیں۔" دوسرے باب میں ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن نے عادل اسیر دہلوی کے ترانے ایک جائزہ جیسی تصنیف کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ 'ترانے' عادل اسیر دہلوی کی 58 رباعیوں کا مجموعہ ہے۔

تیسرے باب میں مصنف نے عادل اسیر دہلوی کی پانچ کتابوں کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔ ان کتابوں کے نام ہیں: رباعیاتِ فراق، رباعیات امجد، رباعیات یگانہ، رسالہ حق نما کا اردو ترجمہ اور رباعیات غنی کاشمیری ایک مختصر جائزہ وغیرہ تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں عادل اسیر دہلوی کی پانچ کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتابوں کے نام ہیں: نغمہ خیام...... ایک جائزہ، رباعیات حضرت سیف الدین باخری ایک تعارفی مطالعہ، رباعیاتِ عادل، رباعیات دارا شکوہ اور اسرار الصلوٰہ وغیرہ تصنیفات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب پنجم کے تحت ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن نے عادل مرحوم کی کتاب 'رباعیاتِ مستزاد' کا جائزہ لیتے ہوئے اسے تحقیقی نوعیت کی کتاب بتایا ہے۔ دو صفحات پر مشتمل متذکرہ کتاب کے پیش لفظ کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب ششم کے تحت 'رباعیاتِ انیس ایک تاثر' جیسی موقر کتاب پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس کے پہلے عادل اسیر، فراق، اقبال، اکبر، امجد، یگانہ اور دیگر رباعی گویوں کی رباعیات کی ترتیب وتدوین کر چکے ہیں۔ اب انھوں نے انیس کی رباعیوں کو کافی تلاش وجستجو کے بعد یکجا کر کے شائع کیا ہے۔" باب ہفتم کے تحت مصنف نے عادل اسیر دہلوی کی کتاب ترجمہ 'مجمع البحرین' کا اردو ترجمہ پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں جیسا کہ مرحوم عادل اس تصنیف وترجمہ کے پیش لفظ میں تحریر کرتے ہیں" اس کتاب (مجمع البحرین) کی تصنیف کے وقت حضرت دارا شکوہ کو اس بات کا علم تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ان کی اس کوشش کو پسند نہیں کریں گے۔"

اگلا باب ہشتم کے تحت عادل اسیر دہلوی کی مرتبہ کتاب 'رانی کیتکی کی کہانی' پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس مختصر سے جائزے میں فاضل مصنف نے ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ ہے" کتنا اچھا ہوتا اگر عادل اسیر اسے آسان اردو میں بھی تحریر کردیتے تو بڑوں کے ساتھ بچے بھی اس سے بیش از بیش مستفید ہوتے اس لیے کہ اس زبان سے ادب کے معلم ومتعلم تو واقف ہیں مگر بچے جن کے لیے اس کہانی میں دلچسپی کا سامان ہے اسے آسانی سے سمجھ نہیں سکتے کہ وہ زبان کے نشیب وفراز سے آگاہ ہیں۔ ہاں اگر وہ یہ قصہ زبانی سن لیں تو بآسانی اسے ہضم بھی کر سکتے ہیں اور یاد بھی رکھ سکتے ہیں۔ باب نہم کے تحت مصنف نے عادل اسیر دہلوی کی مرتب کردہ 'امیر خسرو کی پہیلیاں' پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کتاب بھی بچوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ باب دہم کے تحت 'چار کتابیں بچوں کے لیے عادل اسیر دہلوی کی ترتیب وتصنیف' کے ذیل میں جن چار کتابوں پر تبصرہ کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں: بچوں کے اسمٰعیل، بچوں کے اقبال، سچ کا انعام، ہمارے سائنس داں۔ بقول مصنف/مبصر" یہ چاروں کتابیں بیش قیمتی ہیں۔ ان کی قیمت بہت معمولی ہے۔ ان سے بچے ہی نہیں بڑھتی عمر کے بچے بھی مستفید ہوں گے ایسی میری توقع ہے۔"

گیارہواں باب کے تحت 'عادل اسیر دہلوی کی مرتبہ چار کہانیاں ایک تعارفی جائزہ' کے پیش نظر ان کی چار مرتبہ کہانیوں کا جائزہ مصنف نے لیا ہے۔

گلستاں کی کہانیاں، دلکش کہانیاں، کہاوتوں کی کہانیاں، بیربل کی کہانیاں یہ اخلاقی کہانیاں ظاہر ہے بچوں کی ذہنی نشو ونما میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

آخری باب میں بچوں کے لیے چار کتابیں بچوں کی رباعیاں، پھول ہی پھول، رنگ برنگے پھول، آسبلی بوجھ پہیلی پر ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن نے اپنی بیش قیمتی آرا دیے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ عادل اسیر دہلوی کو مبارکباد بھی پیش کرتے ہیں۔

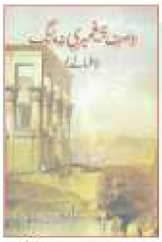

وصف پیغمبری نہ مانگ

مصنف: ڈاکٹر شائستہ فاخری

صفحات: 180، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عبیدالرحمٰن، 11، اولڈ، برہمپترا ہوسٹل، جے این یو، نئی دہلی

'خواتین افسانہ نگاروں میں شائستہ فاخری ایک معتبر نام ہے۔ مجموعے" ہرے زخم کی پہچان" اور" اداس لمحوں کی خودکلامی" میں شامل افسانے ان کی فن افسانہ نگاری کے روشن دستخط ہیں۔ شائستہ فاخری نے بہت کم عرصے میں محض فنی پختگی اور کہانی کہنے کے انداز سے ہم عصر اردو افسانوی منظرنامے پر اپنی انفرادی شناخت قائم کرلی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب" وصف پیغمبری نہ مانگ" شائستہ فاخری کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے۔ مجموعے میں شامل افسانوں کی تعداد چودہ ہے۔ 'میں اور میری کہانیاں' کے عنوان سے آٹھ صفحات کا مقدمہ تحریر کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شائستہ فاخری، افسانے کو افسانہ بنانے کے لیے کتنا جتن کرتی ہیں۔ اس میں انھوں نے مختصر طور پر اپنے خاندانی پس منظر پر بھی ضیاپاشی کی ہے۔ ان کا گھرانہ خانقاہی تہذیب کا پروردہ ہے، جس تہذیب میں تصوف اور اس کی باریکیوں کو خاطر نشان رکھا جاتا ہے۔ خانقاہی فضا اور وہاں کی مخصوص تربیت نے تصوف کے جمالیاتی خصائص سے روشناس کرایا۔ خانقاہی تہذیب کو شائستہ فاخری نے بیانیہ 'عالم خاک وآب وباد' میں تخلیقیت سے منور کیا ہے، نیز تصوف کی باریکیوں کے ساز کو نغمگی عطا کی ہے۔ تصوف کا عالم جس میں کئی جہاں آباد ہیں۔ انسان کے اندر ایک ہمزاد، ہمزاد کو ہوا اور خواہش نفس کی پیروی سے اعراض کرنا ہے۔ ترک دنیا اور طمع وحرص سے بیزار ہوکر ہی انسان عرفان حاصل کرسکتا ہے اور کامل انسان بن سکتا ہے۔ شائستہ نے نہایت ہی شائستگی سے عبدالحی کے کردار کے توسط سے تصوف کے جمالیاتی خصائص کو انگیز کیا ہے۔

شائستہ فاخری نے معاشرے میں پھیلی برائیوں، گھریلو زندگی کے واقعات، مرد عورت کے بکھرتے رشتے، عورتوں کی نفسیات، شہری زندگی کا مکڑ جال، معاشرے کے بدنما چہرے اور ملک کے انتظامی اداروں کے غیر جانب دارانہ رویے سے اپنے بیانیے کو وقار عطا کیا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں کے تمام حقائق ومسائل کو غیر مشروط اور فطری ڈھنگ سے معاملہ کرنے کی سعی کی ہے۔

شائستہ فاخری نے معاشرے کی نبض شناس بن کر عورت کو مرکز میں رکھ کر کئی افسانے تحریر کیے ہیں۔ 'درد شورانگیز' میں معاشرے کا سچ اتنی فن کاری سے پیش کیا ہے کہ قاری افسانہ ختم کرنے کے بعد محو حیرت ہوجاتا ہے۔ ایک بیوہ عورت کے ساتھ معاشرے کے بدچلن کردار جیسا برتاؤ کرتے ہیں، ان کی نقاب کشائی کی ہے۔ فن کار نے یہ بھی دکھایا ہے کہ ایسے کردار کو معاشرہ کس انداز میں جنم دیتا ہے اور یہ کردار تمام حدود پار کرجاتا ہے، یہاں تک کہ ارجمند کے شوہر کا قتل بھی کردیتا ہے تاکہ اس کو حاصل کر سکے۔ مجبور ہوکر بیوہ کو ایک بزرگ مسجد کے امام کی زوجیت میں آنے کا دم بھرنا پڑتا ہے، جسے وہ اپنا پیر ومرشد تسلیم کر رہی تھی 'بابا صاحب! مجھے اپنے نکاح میں لے لو۔'

شائستہ فاخری نے شوہر اور بیوی کے مقدس رشتے کے آپسی اختلافات کو بھی اپنے

بیانیے کا موضوع بنایا ہے۔آج بیشتر گھرانوں میں میاں اور بیوی کے مابین کشیدگی عام بات ہے۔معاشرے کی اس بے رحم سچائی کو 'ساجھی خوشیاں ساجھے غم' اور 'عدم کے وجود میں' نہایت ہنرمندی اور بے باک انداز میں پیش کیا ہے۔

افسانوی مجموعے میں شامل کہانی 'آدمی ہوں وصف پیغمبری نہ مانگ' جو کتاب کا عنوان بھی ہے لفظ آدمی کے حذف کے ساتھ۔ بیانیہ ساخت سے کہیں ایسا پتہ نہیں چلتا کہ فسادات میں عبد الغنی کا قتل ہوا ہے، لیکن بین السطور میں اس کی حرکیات کو نشان زد کیا جا سکتا ہے۔ واقعات کی بنت میں فن کارہ نے ہنرمندی کے جوہر دکھائے ہیں کہ اصل واقعہ کو بیانیہ کی ظاہری سطح سے مس نہیں کیا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ قاری اصل واقعہ کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔شائستہ فاخری نے اس کہانی کو قصہ گوئی / حکائی انداز بیان کا وقار عطا کیا ہے اور اسے تاریخی تناظر میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔عبدالغنی اپنے بیٹے کریم کو سبق آموز کہانی کے ذریعے ہمیشہ سچ بولنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتا ہے،لیکن اس کے بیٹے نے یہ مشاہدہ کیا کہ سچ بولنے کے باعث ہی اس کے والد کا قتل کر دیا جاتا ہے۔یہ اس بات کا اشاریہ ہے کہ آج سچائی اور ایمان داری نام کی کوئی چیز نہیں، طاقت اور اقتدار کے آگے ساری قدریں اپنی معنویت کھو چکی ہیں۔

موجودہ عہد میں زندگی کرنے کے بدلتے ہوئے نظام کی تفہیم اور اس کو فنی شعور کے ساتھ بیانیہ کا موضوع بنانا شائستہ فاخری کی گہری تخلیقیت کا غماز ہے۔خواتین احتجاج اور بغاوت کی صدائے بازگشت سے اپنی آزادانہ شناخت قائم کرنے کی سعی کر رہی ہیں۔معاشرے کے چیلنجز کو آج خواتین خصوصاً تعلیم یافتہ خواتین قبول کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہیں۔زیر تبصرہ مجموعہ میں کئی کہانیاں تانیثیت سے مکالمہ قائم کرتی ہیں۔خواتین زندگی کے مختلف شعبے میں اپنی صلاحیت منوا رہی ہیں۔'خشک پتوں کی موسیقی' اور 'خوابوں کا نیلا سمندر اور تاریک راتیں' ایسی ہی کہانیاں ہیں کہ مرد اساس معاشرے میں بھی خواتین اپنا کردار ادا کرنے کی جدو جہد میں مصروف نظر آتی ہیں اور مردوں کے شانہ بشانہ وہ کسی بھی شغل کو انجام دے سکتی ہیں۔'خشک پتوں کی موسیقی' عورت کی نفسیات کے حوالے سے ایک فکر انگیز کہانی ہے۔'خوابوں کا نیلا سمندر اور تاریک راتیں' کہانی میں خواتین کے احتجاج کی لے بلند ہے،وہ یوں کہ 'آنچل' نے عورتوں کو راہ راست پر لانے اور اسلامی عقائد کی ترویج و اشاعت کے لیے 'نسائی مسجد' کی بنا ڈالی ہے کہ اگر وہ مردوں کی مسجد میں اپنے خالق حقیقی کے سامنے اجتماعی طور پر سربسجود نہ ہو سکیں تو اپنا الگ عبادت خانہ بھی تعمیر کر سکتی ہیں۔

غرض یہ کہ شائستہ فاخری کو مختصر افسانے کے فنی لوازم پر پختہ دسترس ہے۔ان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ مطالبات فن پر خاص توجہ دیتی ہیں۔پلاٹ کی تعمیر اور کردار کی تشکیل میں بھی ان کی سلیقہ مندی، افسانے کو باوقار بناتی ہے۔ان کے اسلوب میں تازگی، روانی اور شگفتگی ہے جس سے قرات کے وقت قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا ہے۔امید ہے کہ زیر تبصرہ مجموعہ بھی قبولیت عام حاصل کرے گا اور قارئین اسے داد و تحسین سے نوازیں گے۔

سائنس ہمارے آس پاس

مصنف: ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کامٹوی

صفحات: 152، قیمت: -/93 روپے سنہ اشاعت: 2016

مبصر: پروفیسر جمال نصرت، روشنی 509/148، پرانا حیدرآباد، لکھنؤ

ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کامٹوی کی زیر نظر کتاب 'سائنس۔ ہمارے آس پاس' جو اسی سال شائع ہوئی ہے اور ان کی گذشتہ 3 کتابوں اور بہت سے مضامین میں ایک قابل قدر اضافہ ہی نہیں کرتی بلکہ اردو میں سائنس کے خزانے کو اور بھی مالا مال کرتی ہے۔اس میں 27 مضامین ہیں اور ہر ایک اپنے میں الگ طرح کا ہے۔ یہ ایک بڑی لائبریری میں جانے کی چابی آپ کو دے دیتی ہے اور آپ سے سوال کرتی ہے کہ یہ ہیں مضامین جو آج کل کے لحاظ سے اہم ہیں اور آپ کی کیا معلوم کرنے کی خواہش ہے، اس کو یہاں سے چُن لیجیے۔ سارے مضامین اس قدر دلچسپی سے بھرپور ہیں کہ جو میرا حال ہوا وہی آپ کا بھی ہوگا۔تجسس کے مارے سب کچھ جاننے کے خواہاں ہوں گے۔ کچھ مضامین کو چھوڑ کر زیادہ تر کے لیے آپ کو دوسری تفصیلی کتاب کی بھی ضرورت ہوگی۔ ڈاکٹر جاوید صاحب تو اپنا کام کر کے اور کام میں آپ کو لگا کر دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ یہی مضامین کی خوبی ہوتی ہے جو یہاں موجود ہے۔

ڈاکٹر جاوید یوں تو تین مکمل کتابوں کے مصنف ہیں لیکن کتنے ہی مضامین فرداً فرداً با تصویر اور بالتفصیل لکھ کر اردو سائنس میں ایک گراں قدر اضافہ فرما چکے ہیں۔ ان کی کتابیں اصلی پونجی، ماحولیات اور انسان اور ادبی شذرات تو سائنسی ادب کی مشہور دستاویز ہیں۔مضامین اہم طور سے 'پانی اور اس کے تحفظ' ماحولیات اور اسلام میں اس سلسلہ سے کیا احکامات درج ہیں کا ذکر، آلودگی، جنگل، توانائی اور دیگر طریق، تو کلاسیکل سائنسی ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے علاوہ اٹھارہ مضامین اپنی نوعیت میں بالکل یکتا ہیں۔ ان کا گوشوارہ کچھ اس طرح سے ہے کہ فاسٹ فوڈ، بیکری اور صحت، ای۔میل، سائبر کرائم، تیزاب، کاربن، ایندھن، گھریلو رنگ، جانوروں کی خوبیاں یہ اپنے آپ میں ایک نئی داستان کہہ رہے ہیں اور اسی ضمن میں ایک مضمون ہے جس میں اہم سائنس دانوں کی فطرت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ بھی بہت دلچسپ ہے۔اس کے علاوہ کچھ دیگر مضامین بھی بالکل نئے عنوان کے ہیں۔ موبائل فون سے نقصان اور فائدے، خلائی خطرات، پیڑوں اور جانوروں، پرندوں کے ختم ہونے سے کیا ہو چکا ہے اور بھی کیا ہو سکتا ہے۔ قدرت نے جس طرح جاندار اور چلتے پھرتے چرند و پرند کو اور کیڑے مکوڑوں کو اپنے تحفظ کی صلاحیت سے نوازہ ہے اسی طرح پیڑ پودوں کو بھی اسی خوبی سے نوازہ ہے۔ دلچسپ ذکر ہے۔

جاوید صاحب کی زبان سہل اور بہت موثر ہے۔ یوں مصنف نے کتاب کو 6 ابواب میں رکھا ہے لیکن ذکر میں صرف تین میں بھی رکھا جا سکتا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب استاد اور پرنسپل رہے ہیں اور اپنے فن میں بہت کامیاب ہیں اسی وجہ سے ان مضامین کے حوالے سے بڑی بڑی باتوں کو بڑی آسانی سے پڑھا گئے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ کتاب میں سب کچھ اچھا ہی اچھا ہے۔ اس میں ہر مضمون کے حوالے سے ایک تصویر بھی شامل حال ہے جو جاوید صاحب کے خیال میں کہ اس کی مدد سے بھی پڑھنے کو قاری مجبور ہو جائے یا طالب علم راغب ہوں گے، تو اس سلسلے میں کہنا ہے کہ اس میدان میں بس ان کو پاس ہونے والے نمبروں سے زیادہ نہیں دیے جا سکتے۔ شاید اس معاملے میں ڈاکٹر صاحب کا ''من تو چلا مگر تو نہیں چلا'' والی بات ہو۔ کتاب کا کور بہت خوب ہے اور وہ کتاب کی عکاسی درجہ اتم میں کرتا ہے۔ کتاب فوراً اٹھا کر پڑھنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ کتاب کے بیک کور پر گذشتہ کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں جو بہت مناسب ہیں۔ کمپوزنگ، چھپائی اور کاغذ اچھا ہے۔ کتاب کو تمام اردو کے سائنسی مصنفین کے نام سے منسوب کر کے جاوید صاحب نے وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔

کتاب بھی بہت کامیاب ہے اور جاوید صاحب بھی بہت کامیاب ہیں۔ قیمت کم ہے۔ صلاح ہے کہ بچوں کو انعام میں دیے جانے والی کتابوں میں اسے ضرور شامل کیا جائے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

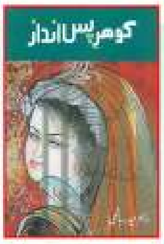

گوہر پس انداز

مصنف/ ناشر: وسیم حیدر ہاشمی
صفحات: 174، قیمت: 350 روپے
مبصر: محمد شاداب شمیم
ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی دہلی

وسیم حیدر ہاشمی ہمارے عہد کے ایک سنجیدہ اور قابل قدر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے متعدد رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے اب تک وہ کسی ادبی تحریک وتنظیم کے پابند نہیں ہیں۔ اپنے افسانوں میں وہ جس بات اور ماحول کی عکاسی کرتے ہیں وہ ان کی اپنی سوچ وفکر کا حصہ ہوتا ہے۔ نیز وہ اپنے افسانوں میں سماج اور معاشرے کی اصل تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات زندگی کی صداقتوں اور حقائق پر مبنی ہیں، وہ اپنے افسانوں کے پلاٹ روز مرہ کے واقعات و حادثات اور آس پاس کے ماحول ومشاہدات سے اخذ کرتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں 24 افسانے ہیں۔ 'گوہر پس انداز' اس مجموعے کا چوتھا افسانہ ہے۔ پہلا افسانہ 'معقول رشتہ' ہے جس میں ایک باپ اپنی افسر بیٹی کے لیے اس کے معیار کا رشتہ تلاش کرتا ہے مگر کافی تگ ودو کے باوجود بھی اس کے معیار کا رشتہ نہیں ملتا ہے۔ تو پھر وہ ایک ایسے لڑکے سے شادی کے لیے تیار ہوجاتا ہے جس کی مستقل کوئی آمدنی نہیں ہوتی ہے۔ یہ ایک عام سی نظر آنے والی کہانی لگتی ہے لیکن افسانے میں بیان کیے گئے شگفتہ کی ماں کی بات بہت ہی پراثر ہے۔ اور اسے اس بات کا مکمل یقین ہے کہ رزق کا مالک اللہ ہے اگر اس نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی ضرور دے گا۔ شگفتہ کی ماں کا یہ یقین حقیقت میں بدل جاتا ہے جب رئیس کو ایک اچھی نوکری مل جاتی ہے۔

دوسرا افسانہ 'سلام روستائی' ہے۔ اس میں ایک دہقان بسنت لال کی دلچسپ روداد بیان کی گئی ہے۔ اس کہانی میں ایسے حالات اور ماحول کی عکاسی کی گئی ہے جو آج کے زمانے میں آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ جب ٹرین اپنے وقت پر اسٹیشن پر نہیں پہنچتی ہے تو مسافروں کو کس طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں اس کی صحیح تصویر اس کہانی میں پیش کی گئی ہے۔

اس مجموعے کا اہم افسانہ ''گوہر پس انداز ایک ایسے بہادر اور بے باک لڑکی کی کہانی ہے جو ہر مصیبت اور پریشانی کا بڑی دلیری سے مقابلہ کرتی ہے، وہ لڑکی جسے جسم فروشی کے دلدل میں دھکیل دیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو اس لعنت زدہ زندگی سے نکالنے کے لیے کامیاب ہوجاتی ہے۔ صرف اپنی ہی نہیں اپنی بہن کے بہتر مستقبل کی فکر میں ہزاروں میل دور دوسرے شہر کو اپنا مسکن بنالیتی ہے اور عزت ووقار کی زندگی جینے لگتی ہے۔ کہانی میں موڑ اس وقت آتا ہے جب دینا کا شوہر ناظم جس سے اس کی شادی بچپن میں ہی ہوجاتی ہے لیکن شادی کے کچھ دن بعد ہی وہ اچانک غائب ہوجاتی ہے اور پھر گیارہ سال بعد جب ان دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو ناظم اسے اپنی ماں کی ناپسندیدگی کے باوجود اپنانے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ ناظم اور اس کی ماں کے درمیان جو مکالمے ہیں وہ بہت ہی دلچسپ اور متاثر کن ہیں۔ افسانہ میں اس حقیقت کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ کس طرح لوگ جھوٹی شان وشوکت کی خاطر بیش قیمتی چیز کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ واقعی یہ افسانہ اس مجموعے کا شاہکار افسانہ ہے۔

مصنف کا ایک اور افسانہ 'تین گھنٹے' اسپتال والوں کی بے رحمی، بے دردی اور ٹریفک نظام کی بے ترتیبی کو بیان کرتا ہے۔ اس افسانہ میں انھوں نے ایک آدمی کو علاج و معالجے میں کس کس طرح کی پریشانیوں اور دشواریوں کا سامنا کرتا پڑتا ہے اس کو بیان کیا ہے۔ نیز ٹریفک کی وجہ سے کیسی کیسی پریشانیاں معرض وجود میں آتی ہیں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ شمشاد کے ساتھ اگر نرس نے خوش اخلاقی کا برتاؤ کیا ہوتا اور اسی طرح ٹریفک جام کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تو شاید شمشاد کی بیوی کی جان بچ سکتی تھی۔

اس کے علاوہ وسیم حیدر ہاشمی کے دیگر افسانے بھی سماج میں پھیلی برائیوں اور عصر حاضر میں زندگی کے تیزی سے بدلتے ہوئے نظام کو سمجھنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ افسانہ نگار نے فنکاری کا ثبوت دیتے ہوئے معاشرے کی سچائیوں کو سامنے رکھنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ بعض افسانے قاری کے احساسات وجذبات کو بیدار کرتے ہیں اور اسے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ افسانہ نگار نے موضوعات کے اعتبار سے سماج کے بیشتر قابل ذکر مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور اپنی پیش کش میں بڑی مہارت اور فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کو مقبولیت حاصل ہو۔

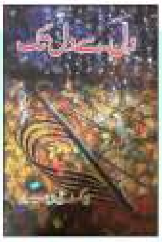

دل سے دل تک

شاعر: ڈاکٹر نوشہ اسرار
صفحات: 136، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، کوچہ چیلان۔ دریا گنج، نئی دلی
مبصر: ڈاکٹر سید احمد قادری، 7 نیو کریم گنج، گیا 823001 (بہار)

'دل سے دل تک' ایک ایسے شاعر کا شعری مجموعہ ہے جو پیشے سے سائنسداں ہیں۔ 'دل سے دل تک' کے شاعر نوشہ اسرار کے اندر شاعری کا ذوق وشوق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سائنسی تعلیم کے دوران جاگا۔ سائنس (علم کیمیائی) کے ساتھ ساتھ شاعری کے اسرار ورموز کو بھی سمجھنے کا یہاں انھیں موقع ملا۔ حالانکہ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنی شاعرانہ طبیعت کو اپنی سائنسی تعلیم پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے ہسپورہ (بہار) سے گیا، گیا سے علی گڑھ اور علی گڑھ سے ماسکو، سعودی عرب اور پھر امریکہ تک کی خاک چھانی۔ نت نئے تجربات ومشاہدات سے گزرے، اور اب وہ امریکہ میں سکونت اختیار کرچکے ہیں۔

زیر تبصرہ شعری مجموعہ 'دل سے دل تک' کے پیش لفظ بہ عنوان 'آغاز کچھ ایسا ہے' میں نوشہ اسرار ان باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کے بعد پی ایچ ڈی (Ph.D) کرنے میں ماسکو گیا۔ واپسی کے بعد ہندوستان، پھر سعودی عربیہ پھر امریکہ میں ریسرچ (research) کے محکموں میں ملازمت کی۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب ہو یا روس کے کمیونسٹ خیالات، یا پھر سعودی عرب کا مذہبی ماحول سب شاعری کے لیے معاون ہوئے۔ بلکہ ان دشت کی سیاحی نے میرے خیالات کو قید وبند سے آزادی دی ہے اور حق گوئی کی راہ دکھائی ہے۔'' (صفحہ: 40)

'دل سے دل تک' کی شاعری میں نوشہ اسرار کا منفرد لب ولہجہ، نئے عنوانات، متنوع موضوعات، عصری تقاضوں کا احساس وبیان، مختلف سائنسی علوم وفنون کو شاعری میں خوبصورت آمیزش سے پرونا اور گہرے مطالعے ومشاہدے کے اظہار وخیال نے ان کی شاعری کو نہ صرف تہہ داری عطا کی، بلکہ معنویت کی ایک ایسی فضا سے متعارف کرایا، جو عام طور پر معدوم ہیں۔ شاعری کی ایسی آنچ، ایسی شعلگی اور ایسی وارفتگی شاعری کے عصری منظرنامہ میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت کے تو اس دن معترف ہوگئے، جب انھوں نے ایک بڑے مشاعرے میں 'خالی بوتل' عنوان سے ایک نظم سنائی۔ ہر چند کہ ان کی غزلوں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، پھر بھی 'خالی بوتل' نے سننے والوں پر کئی بھری بوتلوں کا نشہ چڑھا دیا اور اس طرح نوشہ اسرار غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں کے بھی مشہور ومعروف شاعر ہوگئے۔ نوشہ اسرار اس لحاظ سے خوش قسمت فرد ہیں کہ انھوں نے ہجرت کے درد وکرب کو نہیں جھیلا، اس لیے ان کی شاعری میں وہ شدت غم

تو نہیں ہے۔ لیکن انسانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم، استبداد، بربریت اور جبر سے وہ متاثر ہیں اور ان کا دل ان ہولناکیوں اور کربناکیوں کو دیکھ کر اور محسوس کر کے بے چین اور بے قرار ہو جاتا ہے اور اپنی ان بے چینی، بے قراری کو اپنے احساسات و جذبات کی بھرپور ترجمانی اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہیں، جن میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ ندرت کی جھلک بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ چند اشعار دیکھیے:

بلبل، باغ، بہار و گلشن بادل، بجلی، جگنو، رات
پیٹ میں روٹی ہو تو بھلے ہی بھوکوں کو یہ ڈستے ہیں

—

جس شب کہ اس نے پ سے پڑھا پیٹ کا سبق
تختی ہمارے لال کی اس رات جل گئی

نوشہ اسرار کی غزلوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے افکار و تصورات کی دنیا محدود نہیں ہے۔ وسعت اور معنویت سے بھرپور ان کی غزلیں روح کی گہرائیوں میں اتر کر پیدا ہونے والی کیفیت کو دو آتشہ بنا دیتی ہیں:

وہ جا رہا ہے قافلہ، ہمراہ ہو چلو دریا بنی وہ بوند، جو دریا سے مل گئی
اب زندگی کی خواہش نہ موت کا ہے خدشہ میں اس سے دوبدو ہوں، وہ میرے روبرو ہے
میں اس خیال سے اقبال جرم کر بیٹھا زبان جو کھولی تو اس کا بھی نام آئے گا

فکر و معنی میں ڈوبے یہ تمام اشعار نوشہ اسرار کی شاعرانہ عظمت کے دلیل ہیں۔
نوشہ اسرار نے اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ غزل کہنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بلکہ غزل کہنے کے لیے لہو کو آنکھوں سے ابلنا پڑتا ہے، دل میں ارمانوں کو مچلنا پڑتا ہے اور آگ پر کروٹیں لیتے ہوئے غزل ہوتی ہے۔ یہ دو شعر ملاحظہ کریں:

جب لہو آنکھوں سے ابلے، تو غزل ہوتی ہے دل میں ارماں کوئی مچلے تو غزل ہوتی ہے
جذبۂ عشق میں لپٹا وہ خیالوں کا بدن کروٹیں آگ پہ بدلے تو غزل ہوتی ہے

نوشہ اسرار کی غزل میں جو حسن، تازگی، اور شگفتگی ہے، علامتوں اور استعاروں کی جو جدت طرازی ہے، وہ ان کی شاعری کو آفاقیت بخشنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں موجود کئی ایسی نظمیں ہیں مثلاً گھر، خالی بوتل، دل، وہ ہے چمن میرا، سفر، جہاد کا مل کیا عید آئی؟، میدان عمل اور غزل نامہ وغیرہ گہرے تاثرات کے ساتھ ساتھ دل و دماغ میں ایک خاص کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہیں اور قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ دیتی ہیں۔ خاص طور پر 'خالی بوتل' جیسی نظم عہد حاضر کی بے حد معیاری اور فکر و معنی سے بھرپور نظموں میں شمار کی جائے گی۔ 'دل سے دل تک' کی پوری شاعری، اردو شاعری میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب کا سرورق معنی خیز اور جاذب نظر ہے۔ اندرونی صفحات کی کمپوزنگ اور پیشکش بھی معیاری ہے۔ قیمت مناسب ہے۔ شعری ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ شعری مجموعہ بہترین تحفہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی پزیرائی ہوگی۔

راستہ مل جائے گا

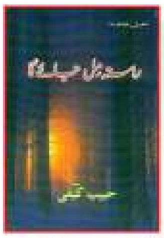

شاعر: حبیب کیفی

صفحات: 128، قیمت: 120، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: تخلیق کار پبلشرز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر نثار راہی، A-31، مہاویر نگر، پال لنک روڈ، جودھپور

'راستہ مل جائے گا' افسانہ نگار اور شاعر حبیب کیفی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو غزلوں پر مشتمل ہے۔ حبیب صاحب بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور نثر میں ان کے آدھے درجن سے زیادہ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ مگر 1965 سے شعری سفر کے آغاز کے باوجود عمر کے اس موڑ پر ہی سہی ان کا خواب پایہ تکمیل تک پہنچا ہے۔

بقول شین کاف نظام ''نثر کے ذریعہ انسان دوسروں سے ملتا ہے اور شاعری انسان کو خود سے متعارف کراتی ہے'' ممکن ہے فکشن میں مسلسل بکھرتے رہنے اور زندگی کی وضاحت کرتے کرتے انھوں نے خود کو از سر نو سمیٹنے کی ضرورت محسوس کی ہو اور اس کار خیر کے لیے غزل جیسی صنف کا انتخاب کیا اور نتیجتاً یہ مجموعہ منظر عام پر آیا۔ اس ضمن میں کیفی خود لکھتے ہیں ''شاعری وہ کرے جس نے محبت کی ہو اور محبت میں دل کا ٹوٹنا لازمی بھی ہے۔ اس ٹوٹن کو غم دنیا سے ملا کر بھی دیکھا جانا چاہیے۔''

کیفی کی غزلوں میں زندگی کی روشن تصاویر جا بجا ملتی ہیں۔ وہ بھاری بھرکم رات میں صبح کا ذکر کرتے ہیں۔ جب لوگ دن کو مٹانے کی سازش رچتے ہیں تو انھیں رات کے چہرے پر روشنی ملنے والے کا انتظار رہتا ہے۔ پھولوں کی باتوں اور خوشبو کے ذکر سے انھیں سکون ملتا ہے۔ وہ خاموش اور اداس فضا میں نغمگی پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ زندگی کے جو قصے ان کی نثری تخلیقات کا حصہ نہ بن سکے شاید انھیں قصوں کو انھوں نے شعری قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ ان قصوں میں مدنی معاشرت میں زندگی گزارنے والے عام انسان کی جھلک ہے۔ غریب، مزدور اور کسان پر ہونے والے ظلم کی پکار ہے تو محبوب کی بے وفائی کے فسانے بھی ہیں، عہد گذشتہ کی یادیں ہیں، بھیڑ اور تنہائی کی داستانیں اور روداد جہاں بھی شامل ہے۔ ویسے بھی صنف کوئی ہو قصے سننے اور سنانے کا سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔

بقول زبیر رضوی ''حبیب میں اپنی غزلوں کو 'چیزے دیگر' بنانے کا تخلیقی اضطراب شدید ہے۔'' دراصل ان کا انداز الگ اور مختلف ہے۔ انھوں نے ہندی زبان کے الفاظ کو شامل کر کے کچھ نیا کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس کے لیے وہ بعض مقامات پر زبان و بیان کے لیے ضروری اصولوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور موہن لال کول کی قربت نے ان کے کلام میں بھوک، افلاس اور سرمایہ داروں کے خلاف احتجاج کے نقوش بھی ابھارے ہیں۔ وضاحت اور اختصار کی کشمکش سے گزرنے کے بعد جب ایک افسانہ نگار شاعری کی جانب رخ کرتا ہے تو کچھ مقامات پر دفعتاً نظر رک جاتی ہے اور ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ مثلاً:

کچھ کہہ نہ پایا بھیڑ میں تو میں نے یہ کیا نظروں سے اس کو ڈھیرے سے چھو کر نکل گیا
کچھ نہ سوجھا تو اس اندھیرے میں خود کو چپکے سے ہم جلا بیٹھے
یاد شدت سے وہ مجھے آیا پھول جب بھی نیا کھلا کوئی
چاند برسوں سے کیوں نہیں نکلا میری راتیں سوال کرتی ہیں
اس کے چہرے جیسا ہے کچھ آنکھوں میں جو گھوم رہا ہے

کیفی نے گذشتہ چار پانچ برسوں میں اپنے اس ثانوی محبوب کو مساوی حق دلانے کے لیے کثیر تعداد میں غزلیں کہی ہیں جس کے سبب یہ مجموعہ منظر عام پر آیا۔ ہمیں امید ہے جو راستہ انھیں ملا ہے اس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے وہ شعر و ادب کی منزلوں کو چھونے کے لیے نئے راستوں کی تلاش جاری رکھیں گے۔ وہ خود بھی کہتے ہیں:

ابھی سفر میں ہوں چلنا مرا مقدر ہے
پہنچ گیا ہوں جہاں وہ میرا مقام نہیں

باتونی لڑکی (بچوں کی کہانیاں)

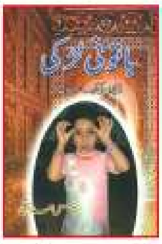

مصنف وناشر: رئیس صدیقی

صفحات: 144، قیمت: 150 روپے

ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، نئی دہلی

مبصر: وارث مظہری

شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

''باتونی لڑکی' رئیس صدیقی کی بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں بشمول ایک ڈرامہ کل پچیس کہانیاں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مصنف کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مختلف اہل قلم کے تبصرے اور تقریظات شامل ہیں جن سے مصنف کی ادبی حیثیت کو نقد اور موازنے کے میزان پر پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو میں ادب اطفال پر لکھنے والوں کی ہمیشہ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے، تاہم ادبی وعلمی حلقوں میں کبھی اس پہلو کو سنجیدگی کے ساتھ موضوع فکر نہیں بنایا گیا۔ بچوں کی بہت بڑی تعداد ابھی بھی کہانیاں پڑھتے ہوئے خالی اوقات گزارنا چاہتی ہے لیکن انھیں اردو میں ایسی کتابیں بہت کم میسر ہیں جو ان کے ذوق ومزاج کے مطابق ہوں۔ اس لیے وہ لامحالہ دوسری زبانوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتی ہے۔ اردو ادب کے دامن کی یہ تنگی اردو دوستوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ حالانکہ دوسری اصناف کے تعلق سے اردو کا دامن بہت وسیع اور مالا مال رہا ہے۔ خاص طور پر شعر وافسانہ نگاری کو ادب کے شعار کے طور پر اختیار کرنے اور ان میں داد تحریر دینے والوں میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے، جو اپنے شوق، ذہنی رجحان اور صلاحیت سے زیادہ عمومی روش کی تقلید میں ان میدانوں میں طبع آزمائی کو اپنی تحریری سرگرمیوں کا عنوان بنائے ہوئے ہے۔ جب کہ ادب نگاری کے بنیادی مقاصد کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو نئی نسل کی شخصیت کی تعمیر اور ان کی پرورش فکر ادب کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے ادبا واصحاب قلم بچوں کے لیے ادب کی تخلیق کو بڑوں کے لیے ادب کی تخلیق سے فروتر اور کم زور حیثیت کا حامل تصور کرتے ہیں۔ کم از کم انگلش اور عربی کے تعلق سے راقم الحروف کا تاثر یہ ہے کہ ان زبانوں میں بچوں کے ادب کی تخلیق کو وہی اہمیت حاصل ہے، جو اہمیت بڑوں کے لیے تحریر کی جانے والی ادبی نگارشات کو حاصل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کمی کا احساس مدتوں سے علمی، ادبی اور تدریسی حلقوں میں پایا جاتا ہے، لیکن اعلیٰ صلاحیت وقابلیت رکھنے والے اصحاب قلم اس وادی پرخار میں آکر آبلہ پائی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں بچوں کے لیے نکلنے والے رسائل کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔ ایسے اردو مجلّات کے کم عمر قارئین دوسری زبانوں (ہندی، انگلش) میں شائع ہونے والے ادبی پرچوں کی طرف ملتفت ہونے پر مجبور ہیں۔

اردو کے حوالے سے اس کمی کی تلافی کرنے والوں میں ہندوستان کے ادبی افق پر جو چند اہلِ قلم نظر آتے ہیں، اُن میں رئیس صدیقی سرفہرست ہیں۔ 'باتونی لڑکی' اپنے نام کے لحاظ سے معمولی لیکن اپنی مشمولہ کہانیوں کے لحاظ سے بچوں کے لیے غیر معمولی اہمیت وافادیت کی حامل ہے۔ چھوٹی چھوٹی اور ننھی منی یہ کہانیاں نہایت فنکارانہ مہارت کے ساتھ بنی گئی ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر جو لذت اور بصیرت حاصل ہوتی ہے، وہ بڑوں کے لیے تحریر کی گئی بہت سی کہانیوں میں بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اسلوب میں سادگی کے ساتھ تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے جو بچوں کے ذہن ونفسیات کے عین مطابق ہے۔ کہانی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے یا ہونی چاہیے کہ وہ پڑھنے والے کو اپنے اندر جذب کرلے اور اپنی گرفت میں لے لے۔ یہ بات بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں پر بدرجہ اولی صادق آتی ہے۔ اس مجموعے کی تمام کہانیوں کا وصف یہ ہے کہ پڑھنے والا اُن میں کھو کر رہ جاتا ہے اور انھیں ختم کیے بغیر قرار نہیں پاتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا ادب اطفال کے ساتھ بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ ومشاہدہ رہا ہے۔ انھوں نے ادب اور سماج کو ہی نہیں، بچوں کے ذہن اور فکر کے دھارے کو بھی پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کہانی نصیحت آموزی کے مختلف پہلو اپنے اندر رکھتی ہے۔ لیکن مصنف کے کمال ہنر نے اسے پندنامہ نہیں بننے دیا ہے بلکہ یہ اصلاً ہلکی پھلکی دل کو موہ لینے والی کہانیاں ہیں جن میں بچوں کی کردار سازی اور اخلاقی شخصیت کی تعمیر کے مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان کہانیوں کا ہندی اور اردو میں بھی ترجمہ ہونا چاہیے۔ تاکہ ان کی افادیت کا دائرہ مزید وسیع ہوسکے۔

رئیس صدیقی عرصہ دراز سے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہیں۔ اس سے قبل اُن کی ادب اطفال کے حوالے سے متعدد کتابیں شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعر بھی ہیں اور میں اُن کی شاعری سے لذت اندوز ہوتا رہا ہوں، تاہم بچوں کے ادب سے اُن کی دل چسپی خصوصیت کے ساتھ لائق تحسین ہے کہ یہ میدان ایسے ہی لوگوں کی صلاحیتوں کے اظہار کا محتاج ہے۔ کتابت وطباعت کا معیار عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔

وہاب دانش حیات وشاعری

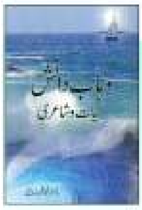

مصنف: ڈاکٹر محمد طلحہ ندوی

صفحات: 280، قیمت: 300 روپے

ناشر: انعم پبلی کیشنز، رانچی

مبصر: ریحان سعید، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

وہاب دانش اردو ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ جنھیں ایک مشکل پسند شاعر کی حیثیت سے شہرت ملی۔ نظم گو اور غزل گو دونوں حیثیتوں سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ان کے شعری مجموعہ 'لب مماس' کو اہل علم حضرات نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ پیش نظر کتاب 'وہاب دانش حیات وشاعری' ڈاکٹر محمد طلحہ ندوی کا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے، جس کو انھوں نے کتابی شکل دے کر زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ابواب بندی سے کسی کے احوال وکوائف کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے نیز چیزوں کو خوش اسلوبی سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ ندوی صاحب نے باب اول میں وہاب دانش کی سوانح حیات اور اس کے ذیل میں خاندان، تعلیم و ملازمت، خوانگی زندگی اور ادبی واقعات وغیرہ کو پیش کرتے ہوئے ان کی مکمل زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ وہاب دانش کے خوانگی اور ادبی حالات کو پیش کرنے میں مصنف نے نہایت محنت اور احتیاط سے کام لیا ہے اور واقعات کی تصدیق بھی دیگر متعلقین سے کی ہے۔ باب دوم' رانچی میں شعر وسخن اور وہاب دانش' ہے۔ اس باب میں بھی ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ رانچی میں شعر وسخن پر اجمالی نظر ڈالتے ہوئے وہاب دانش کی ذہنی تشکیل اور ان کی شعر وادب سے دل چسپی کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاب دانش ترقی پسند تحریک سے عدم دل چسپی کے بعد جدیدیت سے جڑ گئے تھے، نیز انھیں جدیدیت کا علم بردار سمجھا جانے لگا تھا۔ ذیلی عنوانات کے تحت' آزاد نظم نگاری پر ایک نظر' اور' جدیدیت پر ایک اجمالی نظر' کو اس لیے قائم کیا گیا ہے تاکہ وہاب دانش کے مقام ومرتبے کا تعین بحیثیت شاعر کیا جاسکے۔ کتاب کے تیسرے باب' وہاب دانش کی نظمیہ شاعری۔۔۔ ایک مطالعہ' کے عنوان کے تحت' وہاب دانش کی نظمیہ شاعری'، 'شاعری میں بلاغت کی معنویت'، 'وہاب دانش کی شاعری میں استعاراتی واسلوبیاتی

نظام' اور 'وہاب دانش کی نمائندہ نظموں کا تجزیاتی مطالعہ' جیسے ذیلی عنوانات سے وہاب دانش کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب میں وہاب دانش کی مشہور نظموں کا فکری وفنی تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ باب چہارم 'وہاب دانش کی غزلیہ شاعری۔۔۔ایک جائزہ' کے عنوان سے موسوم ہے۔ ذیلی عنوان کے تحت 'صنف غزل کا مختصر جائزہ'، 'وہاب دانش کی غزلیہ شاعری'، 'وہاب دانش کی غزلوں میں مذہبی افکار' اور 'وہاب دانش کے غزلیہ اشعار کا تجزیاتی مطالعہ' پر مبنی ہے۔ صنف غزل کے مختصر جائزے کے بعد وہاب دانش کی غزلوں میں استعاروں، علامتوں اور تلازموں کو برتنے کی ہنر مندی کے علاوہ اجتہادی اسلوب کی کارفرمائی سے روشناس کرایا گیا ہے۔ وہاب دانش کی غزلیں ان کے مذہبی افکار، جذبات وخیالات، تلمیحات، علامات و استعارات اور قرآنی حکایات و واقعات کو نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتی ہیں۔ کتاب کے آخری ذیلی عنوان' وہاب دانش کے غزلیہ اشعار کا تجزیاتی مطالعہ' میں ان کے چنندہ وانوکھے اشعار کو پیش کیا گیا ہے، جس میں آہنگ و معنی آفرینی، عصری حسیت کا فن کارانہ شعور، جدت طرازی، انوکھے استعارے، اچھوتا انداز بیان اور اجتہادی طرز اسلوب نمایاں ہیں۔ آسان لفظوں میں خیالات کی بلند پروازی مع طنز نگاری قابل دید ہے۔ مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو:

خون کا بھی نشاں نہیں چھوڑا
اپنے قاتل کو معتبر کہیے

مصنف داد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے وہاب دانش کے فکروفن پر تحقیقی کام کر کے ارباب علم و دانش کو ان سے روشناس کرایا اور چھوٹے چھوٹے واقعات کو ادبی حسن سے آراستہ کیا۔ پوری کتاب مصنف کی سلیس اور رواں تحریر کی غماز ہے۔ مصنف نے نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے وہاب دانش کی شخصیت اور فن کو پیش کیا ہے۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ کتاب میں خوبیاں تو ہیں مگر پروف کی غلطیوں نے ان کو ماند کر دیا ہے۔ جدید املا کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے جابہ جا غلطیاں در آئی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب وہاب دانش کے فکروفن کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگی اور اہل علم و دانش کے درمیان داد کی مستحق قرار پائے گی۔

مختصر تبصرے

متاع نجات

شاعر: ڈاکٹر محبوب راہی/صفحات: 366، قیمت: 195، سنہ اشاعت: مارچ 2016

ناشر: ڈاکٹر محبوب راہی، گلبن لکھنؤ، کارگل مارگ، پوسٹ چنہٹ، لکھنؤ۔ 41105

اُردو دُنیا کے لیے ڈاکٹر محبوب راہی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ کثیر تعداد میں ان کی کتابیں منظر عام پر آکر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ امسال ان کا نیا شعری مجموعہ 'متاع نجات' شائع ہوا ہے، جو حمد ونعت اور منقبت پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں حمدیہ نظمیں ہیں، دوسرے حصے میں مناجات، تیسرے حصے میں حمدیہ رباعیات، چوتھے حصے میں نعت النبیؐ، پھر چند رباعیات ہیں اور آخری حصے میں حضور اکرم پر سلام پیش کیا گیا ہے۔

زیر نظر شعری مجموعہ اس بات کو عیاں کرتا ہے کہ مصنف کے جذبات اپنے مذہب کے تئیں کس قسم کے ہیں اور اُن جذبات کا اظہار وہ کس طرح کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محبوب راہی کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے کتاب میں مشہور نقاد ڈاکٹر یحییٰ نشیط اور ڈاکٹر نذیر فتح پوری نے اچھی گفتگو کی ہے۔ جو قاری کے لیے توجہ کا باعث ہے۔

ڈاکٹر محبوب راہی جہاں خدا سے لو لگاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہیں وہ حضور اقدسؐ کی شان میں اپنے جذبات کا اظہار بہت عمدگی سے کرتے ہیں۔ یہاں بطور مثال ایک حمدیہ شعر اور ایک نعتیہ شعر نقل کیا جاتا ہے:

رگ وپے میں میری بسا ہے تو تری شان جل جلالہ
مجھے پھر بھی ہے تری جستجو تری شانِ جل جلالہ
سکھائے طور ہم کو جس نے راہی دین ودنیا کے
محمدؐ کے سوا پھر اور رہبر کون ہے میرا

ڈاکٹر محبوب راہی کی یہ کتاب نعتیہ شاعری کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو دینی مدارس کے طلبہ کے لیے بطور خاص بہت مفید ہے۔

کتاب کا گیٹ اپ اچھا نہیں ہے، اچھی کتاب ہے مگر کتاب کی طباعت معمولی کاغذ پر کی گئی ہے اور اسی کے ساتھ کتاب کی بائنڈنگ بھی اچھی نہیں ہے۔ البتہ کتاب کی چھپائی صاف ہے اور پروپ کی غلطیاں نہیں کے برابر ہیں۔ میں اس عمدہ شعری مجموعے کے لیے ڈاکٹر محبوب راہی کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!

کلام نہال

شاعر: حضرت نہال مخدومی نندلوری، مرتب ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری

صفحات: 208، قیمت: 200، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری، چنٹویل 5161604، ضلع کڈپہ، آندھرا پردیش

زیر نظر شعری مجموعہ ''کلامِ نہال' کڈپہ کے مشہور بزرگ اور شیخ طریقت حضرت نہال مخدومی نندلوری کا تخلیق کردہ ہے۔ جسے ان کے صاحبزادے ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے۔

کتاب کا نصف حصہ نثر میں ہے اور نصف حصہ اشعار پر مبنی ہے۔ حضرت نہال مخدومی نندلوری کی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ مرتب کتاب نے ہندوستان میں صوفی تحریک سے متعلق اچھی گفتگو کی ہے۔ وہیں جنوبی ہند میں صوفیائے کرام کی ادبی خدمات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ حضرت نہال مخدومی نندلوری کی شاعری کے بارے میں مرتب نے عمدہ بحث کی ہے۔

تقریباً سو صفحات کے بعد قارئین کی رسائی حضرت نہال مخدومی نندلوری کی شاعری تک ہوتی ہے۔ جہاں حمد، نعت، مرثیہ، مخمس، سلام، منقبت (خاصی تعداد میں موجود ہے۔)، نظم، مثلث، تہنیت، سپاس نامہ، قطعہ اور غزلیں موجود ہیں۔ یعنی یہ بات کہی جاسکتی ہے اس شعری مجموعے میں سبھی اصناف کا ذائقہ قاری کو مل جاتا ہے اور قاری اس سے محظوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ غزل کے اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

جس نے مجھے وفا کا قرینہ سکھایا ہے
اس کو کروں تلاش سرِ راہ گزر کہاں
مجھ کو دونوں کی حقیقت کو سمجھنا ہے نہال
راستے میں مرے بت خانہ بھی ہے کعبہ بھی ہے
اے دل اب اور تازہ دعائیں فضول ہیں
تا عمر تونے ہاتھ اُٹھائے تو کیا ہوا

کتاب کی طباعت عمدہ ہے، حضرت نہال مخدومی نندلوری کے نایاب کلام کو منظر عام پر لانے کے لیے میں مرتب کتاب کو تہہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔

مونس سخن

شاعر/ ناشر:عبدالمتین جامی،صفحات: 192، قیمت: 160، سنہ اشاعت: 2016

زیرنظر مجموعہ اپنی منفرد پہچان بنانے والے شاعر عبدالمتین جامی کا تخلیق کردہ ہے۔ یہ شعری مجموعہ بطورخاص رباعیات پر مشتمل ہے۔اس میں 465 رباعیات ہیں۔اصناف ادب میں رباعی ایک مشکل فن ہے کیوں کہ شاعر کو پابند ہوکر چار مصروں میں کلام کہنا پڑتا ہے۔اور اپنا پیغام قاری و سامع کے روبرو کرنا پڑتا ہے۔مگر اس صنف میں عبدالمتین جامی کافی کامیاب نظر آتے ہیں۔

عبدالمتین جامی کی ادبی وابستگی سے متعلق پروفیسر کرامت علی کرامت نے بہت عمدہ گفتگو کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ ”عبدالمتین جامی عجیب وغریب مخلوق ہیں،شاعری،تنقید، افسانہ، ناول، ڈرامہ،منظوم تمثیل، خاکہ،انشائیہ،جاسوسی ادب،اُڑیا اور بنگلہ کے ادب عالیہ کا اُردو ترجمہ،غرض کہ ادب کا کون سا قابل ذکر شعبہ ہے جوان کی تخلیقی اور فنی دسترس سے باہر ہے؟غرض کہ عبدالمتین جامی کو بلاشبہ ایک ہمہ جہت شخصیت کا مالک قرار دیا جاسکتا ہے۔“(صفحہ:6)

عبدالمتین جامی کا منفرد لب ولہجہ کتاب میں قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔عام فہم انداز میں بھی وہ اپنی بات کہہ جاتے ہیں اور اپنا پیغام دے جاتے ہیں۔یہاں ان کی صرف دو رباعی نقل کی جاتی ہے:

سب گھوم رہے ہیں لیے خواہش کیا کیا   تا عمر وہ کرتے ہیں کوشش کیا کیا
حاصل کہاں ہوتی ہے ہر ایک چیز انھیں   قدرت بھی تو کرتی ہے سازش کیا کیا

تم ہم سے کچھ لفظِ ہدایات سنو   کیا ہم پہ خدا کی ہیں عنایات سنو
انسان بنایا ہمیں حیوان نہیں   اے دوست اسی بات کو دن رات سنو

کتاب کی طباعت وکتابت عمدہ ہے،کتاب دیدہ زیب ہے،پروف وغیرہ کی غلطیاں نہیں کے برابر ہیں،اس خوبصورت شعری مجموعے کے لیے میں عبدالمتین جامی کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

رعنائیاں

شاعر:مسرور حسین سرور/صفحات: 128، قیمت: 100، سنہ اشاعت: 2015

ناشر:مسرور حسین سرور،مکان نمبر: 1/289 محلہ ہاتھی خانہ،فتح گڑھ، پن کوڈ 209601

مسرور حسین سرور کا یہ دوسرا شعری مجموعہ ہے،ان کا پہلا شعری مجموعہ 'سہانی بارش' فروری 1990 میں شائع ہوکر مقبول خواص عام ہوا تھا۔اس کے 25 سال بعد دوسرا شعری مجموعہ 'رعنائیاں' شائع ہوا ہے۔128 صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے میں قاری کو غزلوں کے علاوہ حمد،نعت،نظم سبھی کا ذائقہ مل جاتا ہے۔قاری کو سلیس اُردو میں عمدہ اشعار سے محظوظ کراتے ہوئے شاعر نظر آتے ہیں،یہاں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

خبر نہیں تھی انھیں بارشوں کے موسم کی   بنانے والوں نے کچے مکاں بنائے بہت
کس واسطے کریدنے آئے ہو راکھ کو   غم کا الاؤ سرد ہوئے دیر ہوگئی
اک پرندہ اُداس بیٹھا ہے   اپنی یادوں کو تم بھی تازہ کرو

اس شعری مجموعے میں درد وکرب کے ساتھ جذبے کی صداقت بھی جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔والدمحترم کی یاد میں لکھی نظم قاری کی آنکھوں سے اشک بہانے کے لیے مجبور کردیتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ والد کی دائمی جدائی لکھتے ہوئے شاعر نے اپنے سارے جذبات کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا ہے،اس نظم کا ایک مصرعہ یہ ہے:

اچھا کل سے کہیں نہ جاؤں گا   شام سے پہلے گھر میں آؤں گا

ایک نظم ”شکایت“ قاری پر سوالیہ نشان چھوڑتی ہے،اس کے مصرے دیکھیے:

درد لہجے میں تھا،شکایت تھی/ایک بیٹی یہ باپ سے بولی
ماں مجھے ڈانٹتی ہی رہتی ہے/اور بھیاّ سے کچھ نہیں کہتی

اس مجموعہ کلام میں شریف قریشی،فضیل علوی، غلام ربانی تاباں، راجندر بہادر موج، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، یوسف ناظم اور پروفیسر عنوان چشتی کے تاثرات سے مسرور حسین سرور کی شعر گوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔فی زمانہ اعتراف کو ہی سند قبولیت مانا گیا ہے،اگر کسی کلام پر کسی باوقار صاحب قلم نے اپنی رائے دے دی تو اس کا مطلب صاف ہے کہ کلام کے خالق میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ضرور موجود ہیں کیوں کہ کوئی کسی کی بلاوجہ تعریف نہیں کرتا ہے اور اسی کے ساتھ کلام خود اپنا تعارف کراتا ہے۔

کتاب کی طباعت وکتابت عمدہ ہے،کتاب دیدہ زیب ہے،پروف کی غلطیاں ہیں،اس خوبصورت شعری مجموعے کے لیے میں مسرور حسین سرور کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

پیاسا سمندر

شاعرہ:جسپال کور،صفحات: 136، قیمت: 84، سنہ اشاعت: 2015،

ناشر:جسپال کور، WZ-414،سکنڈ فلور، نانک پورہ، ہری نگر، نئی دہلی 110064

زیرنظر کتاب محترمہ جسپال کور کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔اس میں صرف آزاد نظمیں ہیں۔سبھی نظموں میں جذبوں کی صداقت دکھائی دیتی ہے۔پوری کتاب لائق مطالعہ ہے۔اس کتاب کی خاص اور اہم بات یہ ہے کہ ایک غیر اُردو داں عورت نے اُردو سیکھ کر اس میں نہ صرف اظہارِ خیال کرنا شروع کیا بلکہ اس زبان میں نظم بھی موزوں کرنا شروع کردیا۔جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔

زیرنظر کتاب 'پیاسا سمندر' میں محترمہ جسپال کور کی فن کاری کے نمونے ہر صفحے پر دکھائی دیتے ہیں،عام فہم الفاظ کا سہارا لے کر جسپال کور نے نظم کو بہت خوبصورت لب ولہجے میں موزوں کیا ہے۔مثلاً ایک نظم دیکھیے:

اے میرے پروردگار/ کب ہوگا تیرا دیدار/مت کر مجھے اور بے قرار
کب سے ہے مجھے تیرا انتظار!(نظم:میرے پروردگار)

اپنی بچھڑی ماں کی یاد میں تحریر کردہ نظم میں جسپال کور نے اپنے مضطرب جذبات کو الفاظ کی شکل دے دی ہے،نظم ماں کا یہ بند دیکھیے:

کتنی دور ہوگئی ماں/ہر ایک رشتہ کڑوا سا ہے/تیری میٹھی ممتا بن (نظم:ماں)

ایک اور نظم 'کاش' کا یہ بند ملاحظہ کیجیے:

کاش!اے زندگی مجھ کو/پھر تری بزم میں لے آئے/
تری رہ گزر کے سامنے/میرا ایک آشیاں بن جائے

کتاب کی طباعت وکتابت عمدہ ہے،کتاب دیدہ زیب ہے،پروف وغیرہ کی غلطیاں نہیں کے برابر ہیں،اس خوبصورت شعری مجموعے کے لیے میں محترمہ جسپال کور کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

مبصر:عمران حسن

معرفت رہبر بک سروس، پوسٹ باکس نمبر: 9736، جامعہ نگر، نئی دہلی -110025

آج کے عہد میں نئے علوم وفنون کے ترجمے کی زیادہ ضرورت ہے : پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں سوشل سائنس پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: اردو صرف میر و غالب اور داغ کی شاعری، پریم چند اور منٹو کے افسانوں کا ہی نام نہیں ہے بلکہ اس زبان کا دائرہ بہت وسیع ہے اس میں سائنسی سماجی علوم، عمرانیات، نفسیات اور دیگر موضوعات بھی شامل ہیں۔ ماضی میں اردو میں سماجی سائنسی علوم پر بہت سی کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں اور ان سے اردو زبان کا کارواں آگے بڑھا ہے۔ آج کے عہد میں تخلیق سے زیادہ سائنسی و سماجی مضامین کے ترجموں کی ضرورت ہے، کیونکہ ترجموں کے ہی ذریعے آج کے زمانے کے نئے علوم و فنون اور موضوعات اور مسائل سے متعارف ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ سوشل سائنس پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ کونسل سے شائع ہونے والی کتابوں میں زیادہ تر دیگر علوم کی کتابیں بھی ہیں۔ لہٰذا اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اس پینل کی صدارت محترمہ سیدہ سیدین حمید نے کی۔ انھوں نے پینل کے سامنے خواتین کے حوالے سے کتاب لانے کی ضرورت پر زور دیا انھوں نے کہا کہ عورتوں کے مسائل اور ان کی جدوجہد سے متعلق مضامین لکھوا کر کتاب مرتب کی جائے۔ کیونکہ اردو میں اس نوع کے مضامین کا فقدان ہے۔ لہٰذا اس پینل کی جواب دہی ہے کہ اس حوالے سے خواتین کو موضوع بنا کر ان کی جتنی جہتیں ہیں ان پر مضامین لکھوائے جائیں، اس سے نہ صرف اردو قاری بلکہ اساتذہ اور طلبہ بھی استفادہ کریں گے۔

اس موقعے پر جناب نریش ندیم نے کہا کہ میں ادب مخالف نہیں ہوں لیکن اردو میں لکھنے والوں کی اکثریت ادب اور تنقید تک محدود ہے۔ جبکہ سائنس، سوشل سائنس، میڈیا اور جدید علوم وفنون جیسے موضوعات پر بھی ترجیحی طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے، تبھی ہم دوسری زبانوں کے مدمقابل کھڑے ہو پائیں گے۔ آج دوسری زبانوں میں ہر طرح کے موضوعات پر کتابیں یا تراجم دستیاب ہیں، اردو میں اس کی بہت کمی ہے۔

اس میٹنگ میں سیدہ سیدین حمید، پروفیسر ایم ایچ قریشی، پروفیسر رضوان قیصر، محترمہ عذرا عابدی، ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین، ڈاکٹر افروز عالم، ڈاکٹر سلیم محی الدین، ڈاکٹر محمد داؤد محسن، ڈاکٹر مظفر عالم، محترم سجاد عالم رضوی، جناب نریش ندیم، کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، محترمہ ذیشان فاطمہ، جناب فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، شہناز اختر اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 ستمبر 2016

تصویر میں دائیں سے: ڈاکٹر افروز عالم، سجاد عالم رضوی، ڈاکٹر سلیم محی الدین، پروفیسر ایم ایچ قریشی، پروفیسر رضوان قیصر، سیدہ سیدین حمید، پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر شمس اقبال
ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین، ڈاکٹر محمد داؤد محسن، محترمہ عذرا عابدی، محترمہ شمع کوثر یزدانی

ادبی شخصیات کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشستیں

ریوتی سرن شرما

نئی دھلی: ممتاز ڈرامہ نگار ریوتی سرن شرما کے انتقال پر اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ریوتی سرن شرما ہندوستان

کی مشترکہ تہذیبی وراثت کے امین اور ہندی اردو ڈرامے کا ایک معتبر نام تھے۔ ان کی وفات گنگا جمنی تہذیب اور ڈرامے کا ناقابل تلافی خسارہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریوتی سرن شرما نے ڈرامے کو نئی زندگی بخشی اور اس فن کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ انھوں نے ریڈیائی، اسٹیج اور ٹی وی ڈرامے لکھے اور اپنی تخلیقی ہنرمندی کا مکمل ثبوت دیا۔ ان کے ڈرامے کو پورے ہندوستان میں بے انتہا شہرت و مقبولیت ملی۔ ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے اور مختلف زبانوں میں ان کے ڈرامے نشر کیے جاتے تھے ان کے سیریل بھی بہت مقبول ہوئے۔ خاص طور پر پھر وہی تلاش کو جو مقبولیت ملی اس کی نظیر نہیں ملتی۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ریوتی سرن شرما کے تخلیقی سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ریوتی جی نے افسانے، ڈرامے اور ناول لکھے اور اس کے علاوہ سیاسی، سماجی، ادبی مباحث پر فکر انگیز، خیال افروز مضامین بھی تحریر کیے۔ تمھارے غم میرے، اندھیری راتیں، سفر بے منزل، آرزو ہی آرزو، کچھ سفیدی کچھ سیاہی، ان کی اہم تخلیقات ہیں۔ ان کے افسانے ادب لطیف اور ہمایوں جیسے مؤقر رسالوں میں چھپتے تھے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ریوتی سرن شرما کی انسانیت پسندی اور کشادہ نظری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ریوتی سرن شرما تمام تر تعصبات سے ماورا تھے۔ اردو زبان اور مسلم تہذیب سے انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ اسی لیے انھوں نے اپنے ڈراموں اور سیریلس میں مسلم معاشرے کی بہت ہی عمدہ عکاسی کی ہے۔ پاکستان کے مشہور فکشن نگار انتظار حسین میرٹھ میں ان کے کلاس فیلو تھے۔ پاکستان جانے کے بعد بھی انتظار حسین سے ان کے مراسم میں کوئی کمی نہیں آئی اور انتظار حسین بھی جب ہندوستان آتے تو ان سے ضرور ملتے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ریوتی شرن شرما تو خود بڑے تخلیق کار تھے ہی ان کی شریک حیات ممتاز فکشن نگار کرشن چندر کی بہن سرلا دیوی بھی بہت مشہور افسانہ نگار تھیں، کرشن چندر جس وسیع تر انسان دوستی کے نظریے پر یقین رکھتے تھے ریوتی سرن شرما بھی آخری وقت تک اسی نظریے پر قائم رہے۔ انھوں نے کبھی بھی اپنے ضمیر اور ذہن سے سمجھوتا نہیں کیا۔ انھیں قومی سطح کے بہت سے انعامات، اعزازات ملے مگر اپنی زندگی میں انھوں نے غرور اور تصنع کو داخل نہیں ہونے دیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے ریوتی سرن شرما کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایسی شخصیتیں اب ہمارے معاشرے میں خال خال ہیں۔ ریوتی سرن شرما کی شخصیت ہمارے لیے مشعل راہ تھی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 24 ستمبر 2016

راشد آذر

نئی دھلی: اردو کے معروف شاعر راشد آذر کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے

ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ راشد آذر ان شعرا میں تھے جنھوں نے اپنے الگ طرز احساس اور انداز فکر سے شعری منظرنامے پر اپنا اعتبار قائم کیا تھا۔ وہ اپنے فن کو بہت ہی خوب صورتی سے تراشنے کا ہنر جانتے تھے اور اسی ہنرمندی نے انھیں شاعروں کی بھیڑ میں بھی ایک الگ چہرہ عطا کیا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ راشد آذر کا تعلق ایک علمی خانوادے سے تھا۔ ان کے والد پروفیسر مرزا حسین علی خان انگریزی ادب کے مشہور اسکالر تھے اور انھوں نے بھی انگریزی ادب سے گریجویشن کیا تھا اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرکے وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ وہ شروع سے ہی مارکسزم سے متاثر تھے اور مارکسیت کا ان کی زندگی اور فکر و فن پر بہت گہرا اثر ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین سے ان کی وابستگی رہی ہے۔ ساحر اور فیض سے بہت متاثر رہے ہیں مگر انھوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی۔ انقلابی رومانیت ان کی شاعری کا ایک نمایاں عنصر ہے۔ مغربی ادب سے واقفیت نے ان کے ذہنی افق کو وسعت عطا کی تھی۔ وہ صرف حیدرآباد نہیں بلکہ برِّ صغیر میں ایک اہم شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ راشد آذر بنیادی طور پر شاعر تھے مگر انھوں نے 'میر کی غزل گوئی' کے عنوان سے جو تحقیقی تنقیدی کتاب تحریر کی ہے وہ میریات میں ایک گراں قدر اضافے کے ساتھ ساتھ میر شناسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں انھوں نے بالکل نئے طور و طرز سے مجموعہ ضدین میر تقی میر کی شخصیت اور فن کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کی تنقیدی تحریریں بھی بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ ان کے شعری مجموعے 'نقش آذر'، 'صدائے تیشہ'، 'آب دیدہ'، 'خاکِ انا'، 'جمع خرچ وفا'، 'زخموں کی زبان'، 'اندوختہ'، 'قرضِ جاں' ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ رباعی پر بھی انھیں عبور تھا۔ 'منزل شوق' ان کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ اسے رباعیات کے ضمن میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے راشد آذر کی وفات کو شعر و سخن کا بہت بڑا خسارہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ راشد آذر اردو دنیا میں اپنے منفرد تخلیقی احساس و اظہار کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 اکتوبر 2016

خلیق انجم

نئی دھلی: اردو کے ممتاز محقق، ماہر غالبیات اور انجمن

ترقی اردو (ہند) کے سابق جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے انتقال پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم

نے اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خلیق انجم کے انتقال سے غالب شناسی کے ایک باب کا خاتمہ ہوگیا۔ غالب کی بازیافت اور تحقیق کے ضمن میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خلیق انجم نے غالب کی مختلف فنی اور فکری جہتوں کے حوالے سے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی وجہ سے انھیں غالب شناسوں میں ایک امتیاز حاصل ہے۔ پانچ جلدوں میں غالب کے خطوط کا مجموعہ اپنے آپ میں ایک بے نظیر کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے غالب کی نادر تحریریں، غالب اور شاہان تیموریہ، غالب کچھ مضامین جیسی کتابوں کے ذریعے غالبیات کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ خلیق انجم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کی مرنجاں مرنج شخصیت کو کوئی بھی نہیں بھول سکتا۔ وہ بے حد خلیق اور متواضع انسان تھے اور اردو دنیا کی سمت و رفتار سے بھی باخبر تھے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر میں ہندو پاک کے شاعروں و ادیبوں کے اعزاز میں تقریبات کا انعقاد بہت اہتمام کے ساتھ کرتے تھے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے خلیق انجم کی اردو خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کا دائرۂ کار بہت متنوع اور وسیع تھا۔ انھوں نے کلاسیکی شاعر مرزا مظہر جانجاناں پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان کے فارسی خطوط کے ترجمے بھی کیے۔ متنی تنقید پر بھی ان کا تحقیقی کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ انھوں نے صرف ادیبوں اور شاعروں پر ہی کتابیں مرتب نہیں کی بلکہ دہلی کے تاریخی آثار و باقیات پر بھی بہت مستند کام کیا ہے۔ سرسید کے 'آثار الصنادید' کی ترتیب و تدوین، دلی کے آثار قدیمہ، مرقع دہلی، رسوم دہلی جیسی کتابوں کی ترتیب کے ذریعے انھوں نے دہلی کی تہذیب و تاریخ سے عوام و خواص کو روشناس کرانے کی جو کوشش کی ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے۔ تاریخ اور آثار قدیمہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ اسی لیے تاریخ اور آثار قدیمہ سے متعلق انھوں نے یہ کام بہت ہی انہماک و ارتکاز کے ساتھ کیا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ خلیق انجم نے اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے جو جدوجہد کی ہے اسے بھی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ وہ گجرال کمیٹی کا بھی حصہ تھے اور اردو زبان کے فروغ اور توسیع کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے پلیٹ فارم سے بھی انھوں نے اردو کے لیے بہت کام کیا ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 اکتوبر 2016

اعلیٰ انسانی اقدار کی نکہت سے اردو دنیا محروم: پروفیسر ارتضیٰ کریم

نئی دھلی: معروف افسانہ نگار اور فکشن ناقد پروفیسر شمیم نکہت کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ شمیم نکہت کے افسانوں میں اعلیٰ انسانی اقدار کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ انھوں نے گھر میں سانس لیتی سچائیوں کو اپنی کہانیوں کے قالب میں پیش کیا اور متوسط طبقے کی زندگی کو اپنے افسانے کا محور بنایا اور طبقۂ نسواں کے استحصال کے خلاف اپنے افسانوں میں احتجاج بھی کیا۔ وہ ترقی پسند افسانے کی روایت سے جڑی

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں پروفیسر شمیم نکہت کے انتقال پر تعزیتی نشست

ہوئی تھیں۔ انھی مسائل اور موضوعات پر انھوں نے بیشتر افسانے تحریر کیے جو عوامی زندگی اور مظلوم طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پروفیسر شمیم نکہت متنوع صفات کی حامل تھیں۔ انھوں نے انشائیے، خاکے، ڈرامے کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی تحریر کیے۔ 'پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار' فکشن تنقید کے حوالے سے ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کے علاوہ 'تاثرات' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'دو آدھے' بھی بہت مقبول ہوا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ خواتین افسانہ نگاروں میں شمیم نکہت کی اپنی ایک الگ پہچان تھی۔ انھوں نے بیانیہ انداز میں کہانیاں لکھیں اور عورتوں کی داخلی زندگی کے مد و جزر، نفسیات اور مسائل کی انھوں نے بہت ہی عمدہ عکاسی کی ہے۔ منظر نگاری میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ سودا اور ثروت آپا جیسی کہانیوں کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے نجی مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر شمیم نکہت دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے طویل عرصے تک وابستہ رہیں اور شعبے کی ترقی میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ وہ بہت ہی پر خلوص اور دردمند شخصیت کی حامل تھیں۔ انھوں نے اپنی داخلی شخصیت کی نکہت کو دور دور تک پھیلانے کی کوشش کی۔ اس لیے انھوں نے ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنی جواں سال بیٹی کی یاد میں شعاع فاطمہ تعلیمی فلاحی ٹرسٹ قائم کیا جہاں انھوں نے اقتصادی اعتبار سے کمزور بچیوں کی تعلیم و تربیت کے بہتر انتظامات کیے اور بچوں کو ماں جیسا پیار دیا۔ یہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جسے دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی وفات سے اردو اس شمیم و نکہت سے محروم ہوگئی ہے جو ان کی ذات سے مخصوص تھی۔ یہ افسانے اور تنقید کا بہت بڑا خسارہ ہے۔

پروفیسر شمیم نکہت کے انتقال کی خبر ملتے ہی قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں ایک تعزیتی نشست منعقد کی گئی جس میں سیدہ سیدین حمید، قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر ایم ایچ قریشی، پروفیسر رضوان قیصر، ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین، ڈاکٹر سلیم محی الدین، ڈاکٹر افروز عالم، جناب نریش ندیم، ڈاکٹر مظفر عالم، محترمہ عذرا عابدی، ڈاکٹر محمد داؤد محسن، کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک محترمہ شمع کوثر یزدانی کے علاوہ شعیب رضا فاطمی، محمد عصیم، حقانی القاسمی، شاہد اختر انصاری وغیرہ موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 ستمبر 2016

اردو صحافت کورس کا آغاز کیا جائے: مختار صدیقی

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل آج پورے ملک میں اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے ایک واحد ادارہ ہے جس کی فعالیت کو معتبر کہا جاسکتا ہے اور گذشتہ ایک سال سے کونسل کی سرگرمیاں اپنے دائرہ کار کو جس طرح وسیع کر رہی ہے وہ لائق ستائش ہے۔ یقینی طور پر اس کے تمام بنیادی پروگرام کی توسیع ہونی چاہیے مگر آج جس طرح دیگر زبانوں کا فروغ ہو رہا ہے اس کے لیے اردو زبان کو بھی نئی جہتوں کی طرف لے جانا ہوگا تاکہ وسیع پیمانے پر اردو زبان کا پھیلاؤ اور فروغ ہوسکے اور ہماری نئی نسل اردو زبان و ادب کی طرف مائل ہوسکے۔ ان خیالات کا اظہار کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے قومی ترجمان اور صوبائی کنونیز مختار صدیقی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل نے جہاں اپنی مروجہ اسکیموں کے بہتر نتائج کے لیے غیر سرکاری تنظیموں کی مالی امداد میں اضافہ کیا ہے اور نئے نئے پروگراموں کی منصوبہ بندی میں سرگرم عمل ہے وہیں کونسل کو کم از کم دو ایسے پروگراموں کا مربوط لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیے جن سے اردو زبان کا تعلق روزی روٹی سے بآسانی جوڑا جاسکے۔ کونسل اپنے طور پر اردو صحافت کا کم از کم ایک سالہ ڈپلومہ کورس کا آغاز کرے جو تعلیمی کورس کے ساتھ تربیتی کورس پر بھی مشتمل ہو۔ یہ ڈپلومہ نئی نسل کو اردو صحافت کے ذریعہ تو روزگار فراہم کرے گا ہی بلکہ ملک کے ان تمام اردو اخبارات کے اس مسئلے کو بھی حل کرے گا کہ انھیں آج اردو زبان کے اچھے صحافی بآسانی دستیاب نہیں ہیں۔ یہ کورس کو قومی کونسل ملک میں اردو زبان کی تعلیم فراہم کرانے والے معیاری تعلیمی اداروں اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ملی تنظیموں کے ذریعے اپنے مراکز قائم کرا کر شروع کرائے جس طرح اس کے ایک سالہ اردو ڈپلومہ کورس کے مراکز پورے ملک میں قائم ہیں۔ اپنے دوسرے پروگرام کے تحت کونسل اردو ٹیچر ٹریننگ کا ایک سالہ ڈپلوما کورس شروع کرے یہ بھی تعلیمی اور تربیتی کورس کے طرز پر ہونا چاہیے۔ اس کورس کے مراکز بھی جب ملک کے تمام حصوں میں بآسانی قائم ہوجائیں گے تو یقینی طور پر ملت کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کا تعلق روزی روٹی سے جڑ جائے گا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 ستمبر 2016

عالمی یوم خواندگی

کانکی نارہ 8 ستمبر 2016 بروز جمعرات کانکی نارہ حمایت الغربا ہائر سکنڈری اسکول میں این سی پی یو ایل، حکومتِ ہند

کی جانب سے چلنے والے کمپیوٹر سنٹر (سی اے بی اے ایم ڈی ٹی پی) میں UNESCO (اقوام متحدہ تعلیمی، سائنسی اور تہذیبی ادارہ) کے ذریعہ نافذ 'عالمی یوم خواندگی' کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب کی صدارت اسکول ہٰذا کے صدر محترم محمد اکبر (زخمی) نے کی جبکہ نظامت کی ذمہ داری کمپیوٹر سنٹر کے سنیئر فیکلٹی کم سپروائزر شاہد علی نے نبھائی۔ ناظم تقریب نے طلباء وطالبات سے بھرے مجمعے کو 50 واں یوم خواندگی (گولڈن جبلی) سے روشناس کرایا۔ ناظم تقریب نے زیرِ نظر شعر سے محترم زخمی صاحب کو سامعین کے حوالے کیا کہ:

گلاب ایسے ہی تھوڑے گلاب ہوتا ہے
یہ بات کانٹوں پہ چلنے کے بعد آتی ہے

صدراتی خطبے میں محترم محمد اکبر زخمی نے خواندگی اور خواندہ سماج وشخصیت کی نسبت سے علمی اور نصیحت آمیز گفتگو کی۔ تقریب کو کامیاب کرنے میں سنٹر کے دوسرے سینئر فیکلٹی محمد شمیم اختر، جونیئر فیکلٹی خطاب عالم، اردو ٹیچر محمد اسلم علی کا تعاون رہا۔

پریس ریلیز: محمد اسلم علی، اردو ٹیچر، کانکی نارہ، بنگال، 12 ستمبر 2016

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرمادیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جاسکے۔

'اردو دنیا' کے لیے تمام مضامین/مکتوبات اردو دنیا کی ای میل آئی ڈی کے علاوہ درج ذیل آئی ڈی پر بھی ضرور ارسال کریں: director@ncpul.in

سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کا خاکہ نمبر

'ناول نمبر' کے بعد قومی اردو کونسل کے علمی، تحقیقی مجلّہ سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کا ایک شمارہ 'خاکہ نگاری' پر مبنی ہوگا جس میں خاکہ کے فن، روایت پر تحریروں کے علاوہ مشاہیر خاکہ نگاروں پر مضامین اور ادبی شخصیات کے اہم نادر و نایاب شخصی خاکے بھی شائع کیے جائیں گے۔ اہل قلم حضرات سے تعاون کی درخواست ہے۔ آپ کے غیر مطبوعہ مضامین مع حوالہ جات کم سے کم 8000 الفاظ پر مشتمل ہونے چاہئیں۔ نگارشات درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں:

ft.ncpul@gmail.com

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

اردو کی نثری اصناف

نظام آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے ریاست تلنگانہ کے ضلع کریم نگر میں واقع شاتاواہنا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام ایک روزہ قومی اردو سمینار بعنوان 'اردو کی نثری اصناف' 8 ستمبر کو منعقد ہوا۔ سمینار کا افتتاح مہمان خصوصی پروفیسر اقبال علی سابق وائس چانسلر اور پروفیسر ایم کومل ریڈی رجسٹرار یونیورسٹی کے ہاتھوں ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ایس سجاتا پرنسپل کالج نے کی۔ مہمانان اعزازی کے طور پر پروفیسر مظفر شہ میری صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد، پروفیسر سجاد حسین صدر شعبہ اردو عربی و فارسی مدراس یونیورسٹی، پروفیسر نسیم الدین فریس ڈین فیکلٹی آف آرٹس مولانا آزاد اردو یونیورسٹی اور ڈاکٹر مجید بیدار سابق صدر عثمانیہ یونیورسٹی نے شرکت کی۔ ڈاکٹر حمیرہ تسنیم صدر شعبہ اردو نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور سمینار کے مہمانوں اور مقالہ نگاروں کا استقبال کیا۔ پروفیسر مظفر شہ میری نے کلیدی خطبہ دیا اور اس بات پر زور دیا کہ اردو کو روزگار سے جوڑنے کے ضمن میں اردو شعبہ جات کو ٹھوس اقدامات کرنے چاہئیں۔ پروفیسر اقبال علی نے کہا کہ اردو کسی ایک مذہب کی زبان نہیں بلکہ عالمی سطح پر مقبول زبان ہے۔ پروفیسر سجاد حسین اور دیگر مہمانوں نے شعبہ اردو کی کارکردگی کی ستائش کی۔ ڈاکٹر محمد ابرارالباقی اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو نے افتتاحی اجلاس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد دو سیشن میں اردو کی نثری اصناف ڈرامہ، انشائیہ، تذکرہ نگاری، داستان، ناول وغیرہ سے متعلق موضوعات پر ملک کے مختلف حصوں سے آئے مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اجلاس میں مہمانان اعزازی نے صدارت کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ناظم الدین منور اسسٹنٹ پروفیسر نے انجام دیے۔ جبکہ ڈاکٹر جعفر جری نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد، 12 ستمبر 2016

علامہ اقبال کے افکار و نظریات

پونا: انجمن خیرالاسلام پونا کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس میں شعبۂ اردو، عربی و فارسی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے بتاریخ 3 ستمبر 2016 بروز سنیچر 'علامہ اقبال کے افکار و نظریات' کے موضوع پر یک روزہ صوبائی سمینار منعقد ہوا۔ سمینار کا افتتاح جناب عبدالرؤف خان چیئرمین مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی حکومت مہاراشٹر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام کا آغاز حافظ غلام احمد کی قرأت کلام اللہ سے ہوا۔ بعدہ علامہ اقبال کی مشہور زمانہ نظم لاالہ الا اللہ ترنم سے پیش کی گئی۔ سمینار کوآرڈینیٹر و صدر شعبۂ اردو، عربی و فارسی پروفیسر معین الدین خان نے مہمانان کا خیر مقدم کیا اور ان کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے سمینار کے لیے مذکورہ موضوع کے انتخاب اور اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔

ماہر اقبالیات اور سابق ڈین اسکول آف مڈل ایسٹ اینڈ افریقن اسٹڈیز پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال کے افکار و نظریات پر سیر حاصل بحث کی اور ان کی شاعری کی فکری جہات پر روشنی ڈالی۔

اخیر میں پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے اقبال کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی تعمیر اس طرح ہونی چاہیے جیسے کہ گلستان کے نوخیز پودوں کی پرورش ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد وائس پرنسپل آف پونا کالج نے اپنی صدارتی تقریر میں علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ابراراحمد اسسٹنٹ پروفیسر (اردو) نے بحسن خوبی انجام دیے۔

اس کے بعد فنی اجلاس کا آغاز ہوا جس میں پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کلیم ضیاء (ممبئی) نے کی۔ جس میں چار گراں قدر مقالے پیش کیے گئے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صاحب علی (ممبئی یونیورسٹی) نے کی۔ جبکہ نظامت ڈاکٹر عبدالباری اسسٹنٹ پروفیسر نے کی جس میں چار مقالے پڑھے گئے۔

سمینار کے اختتامی اجلاس میں پروفیسر صاحب علی (ممبئی) بطور مہمانِ خصوصی اور شری راجندر جوشی (پونے) نے مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ انھوں نے علامہ اقبال کے افکار و نظریات کے موضوع پر اپنے

خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر آفتاب انور شیخ وائس پرنسپل (کامرس پونا کالج) نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال کے افکار و نظریات اور ان کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب جاوید اختر اسسٹنٹ پروفیسر (فارسی) نے اس اجلاس کی نظامت کی۔ پروفیسر معین الدین خان (صدر شعبۂ اردو، عربی، فارسی و پی جی سینٹر) نے سمینار کے تمام شرکا و مندوبین کا اور بالخصوص قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ذمہ داران کا شکریہ ادا کیا۔

اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے ایک عظیم الشان مشاعرہ جناب منور پیر بھائی (چیرمین حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونے) کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں قومی سطح کے شعرا نے شرکت کی۔ جناب ارشاد انجم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پریس ریلیز: ابرار احمد، پونا، ممبئی، 10 ستمبر 2016

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

یومِ اساتذہ پر صدر جمہوریہ ہند کا خطاب

نئی دهلی: صدر جمہوریہ پرنب مکھرجی نے ٹیچرس ڈے کے موقعے پر ایک ٹیچر کی طرح راشٹرپتی بھون میں واقع ڈاکٹر راجندر پرساد سروودیہ ودیالیہ میں طلبہ کی ہندوستانی سیاست کی تاریخ پر کلاس لی۔ مسٹر مکھرجی نے درجہ گیارہ اور بارہ کے تقریباً 80 طلبہ کو ہندوستانی سیاست کی تاریخ کے موضوع پر تقریباً ایک گھنٹے کا لکچر دیا۔ انھوں نے آزادی کے بعد ہندوستانی سیاست کی تاریخ اور اس کے

فروغ کے بارے میں بتانے کے ساتھ ساتھ ملک اور دنیا میں دہشت گردی کے بڑھتے خطرات کے بارے میں بھی بتایا۔ صدر جمہوریہ پرنب مکھرجی نے یوم اساتذہ کے موقعے پر ملک بھر کے اساتذہ کو مبارکباد دی ہے اور ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایسا موقع ہے، جب ہم ملک کی تعمیر میں اساتذہ کی بے لوث خدمات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اساتذہ ہمارے بچوں کی دانشورانہ اور اخلاقی بنیاد تیار کرنے اور اس کو مضبوطی فراہم کرنے میں مصروف ہیں۔ انھوں نے مضبوط تعلیمی نظام کو روشن معاشرے کی بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا کہ استاد شاگردوں کے ذاتی مقصد کو سماجی اور قومی مقاصد سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ صدر جمہوریہ نے کہا کہ ضرورت ہے کہ ہمارے استاد بچوں میں قربانی کا جذبہ، رواداری، تکثیریت پسندی، سمجھ اور رحم دلی کے جذبے کو فروغ دیں۔ درس و تدریس کے معاملے میں جدید اور موثر رخ اختیار کرنے کے واسطے ٹیکنالوجی اور نئے طور طریقوں کو بھی آزمانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر تمام اساتذہ برادری کو ہم وطنوں کی طرف سے نیک خواہشات پیش کیں۔ دریں اثنا صدر جمہوریہ کی سکریٹری اومتا پال نے راشٹرپتی بھون کے احاطے میں انگلش اسپیکنگ کلاسز کا افتتاح کیا۔ اس میں ٹاٹا پاور دہلی ڈسٹری بیوشن لمیٹڈ نے تعاون کیا۔ وزیراعظم نریندر مودی نے اساتذہ کی لگن اور عزم کو سلام کرتے ہوئے سابق صدر اور ماہر تعلیم ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ملک کے دوسرے صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن کی سالگرہ پانچ ستمبر کو یوم اساتذہ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ مسٹر مودی نے کہا 'یوم اساتذہ کی نیک خواہشات! ملک تمام اساتذہ کی لگن اور عزم کو سلام کرتا ہے!'

روزنامہ انقلاب دہلی، 6 ستمبر 2016

سٹیزن اینڈ سوسائٹی

نئی دهلی: صدر جمہوریہ ہند پرنب مکھرجی نے نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری کی تصنیف کردہ کتاب 'سٹیزن اینڈ سوسائٹی' کا راشٹرپتی بھون میں ایک تقریب میں اجرا کیا۔

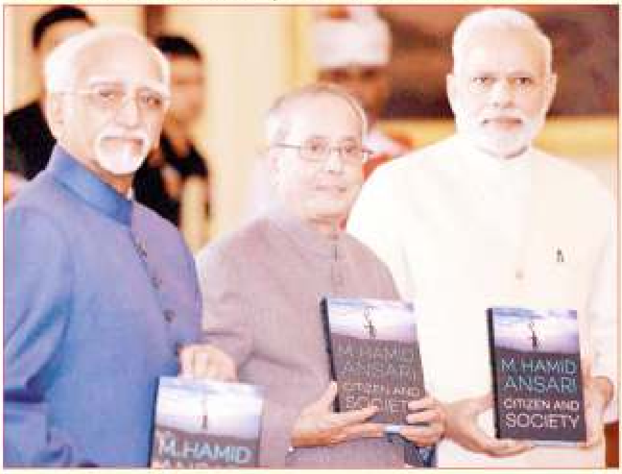

اس موقعے پر وزیراعظم نریندر مودی بھی موجود تھے۔ اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے صدر جمہوریہ نے محمد حامد انصاری کو اس کتاب پر مبارکباد پیش کی، جو خود مسٹر انصاری کے مختلف موضوعات پر دیے گئے لیکچرس کا ایک مجموعہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھیں عام طور پر کتابیں ملتی رہتی ہیں، لیکن یہ ایک منفرد معاملہ ہے، کیونکہ وہ جناب انصاری کو برسوں سے نہ صرف نائب صدر کے طور پر بلکہ ایک دانشور، ایک سفارت کار اور اس عظیم ملک کے ایک حساس شہری کے طور پر جانتے ہیں۔ صدر جمہوریہ نے کہا کہ جس وقت مسٹر انصاری نے جمہوریہ ہندوستان کے نائب صدر کے عہدے کی پہلی مدت کے لیے حلف لیا تو میڈیا نے ان سے سوال کیا تھا کہ کیا وہ غیر سیاسی شخصیت ہیں تو ان کا جواب تھا، کہ کوئی شہری غیر سیاسی نہیں ہوتا، ایک شہری کے طور پر، جس کی تعریف یہ کی گئی ہے، کہ اسے عوامی امور میں دلچسپی لینی ہوتی ہے۔ صدر جمہوریہ نے کہا کہ اس کتاب کا موضوع بھی یہی ہے۔ یہ کتاب ہمیں ایک شہری کے طور پر ہماری ذمے داریوں کو یاد دلاتی ہے۔ اس موقعے پر وزیراعظم نریندر مودی نے نائب صدر کو ان کی کتاب کے اجرا پر مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ دنیا میں تیزی سے تبدیلی آرہی ہے اور ٹیکنالوجی نے شہریوں کو انٹرنیٹ سے جڑا ہوا شہری بنا دیا ہے۔ موجودہ حالات میں ہمیں اپنی روایات اور خاندانی اقدار کا تحفظ کرنا چاہیے، جو ہماری سب سے بڑی قوت ہیں۔ نائب صدر جمہوریہ مسٹر حامد انصاری نے اپنی کتاب کے بارے میں بولتے ہوئے کہا کہ یہ سیاست، سلامتی اور تفویض اختیار جیسے مختلف موضوعات پر ان کے لیکچرس کا ایک مجموعہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے ہندوستان کو درپیش بہت سے چیلنجوں کی حقیقت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موقعے پر موجود دیگر شخصیتوں میں سابق وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ، ٹیکسٹائل کی مرکزی وزیر اسمرتی زوبین ایرانی، نوجوانوں کے امور اور کھیل کود کے وزیر مملکت وجے گوئل اور پارلیمنٹ کے ارکان شامل ہیں۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 29 ستمبر 2016

فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر کے ذریعے قومی کانفرنس کا افتتاح

نئی دھلی: تعلیمی نظام میں جعلی اسناد پر روک لگانے اور تصدیق کے نظام کو بہتر کرنے کے لیے شروع کیے گئے نیشنل اکیڈمک ڈپازیٹری (این اے ڈی) کے تئیں

بیداری پیدا کرنے کی غرض سے ایک قومی کانفرنس کا افتتاح فروغ انسانی وسائل کے وزیر پرکاش جاوڈیکر نے قومی راجدھانی میں کیا ہے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ ''این اے ڈی وزیر اعظم کے ڈیجیٹل انڈیا کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے راستے کی جانب بڑھایا جانے والا ایک قدم ہے۔ انھوں نے پروگرام میں شریک لوگوں سے کہا کہ وہ 2017 کو ہدف کا سال قرار دیں اور یہ طے کرلیں کہ اس سال تک نیشنل اکیڈمک ڈپازیٹری کا استعمال شروع ہوسکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج ہم ہر جگہ تبدیلی محسوس کر رہے ہیں اور ٹیکنالوجی نے طرز زندگی بھی بدل دی ہے۔

وزیر موصوف نے کہا کہ ملک میں تمسکات کی ڈپازیٹریز میں پہلے ہی مالی تمسکات کی تطبیق شروع کردی ہے اور سرمایہ کاروں کے ذریعے لگائی جانے والی دولت کو تحفظ فراہم کرایا جارہا ہے۔ اسی نظام کو اب تعلیمی ایوارڈز کے لیے بھی اپنایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ علم کے شعبے کے ایوارڈز کی جانچ پرکھ کی جائے اور ان کی اصالت کو پرکھنا آسان ہو اور انھیں ڈیجیٹل ڈپازیٹری کے ذریعے محفوظ کرلیا جائے۔ انھوں نے موجود اداروں سے کہا کہ وہ این اے ڈی کی شکل میں دستیاب ٹیکنالوجی کو اپنانے کے لیے تیار ہوجائیں اور اسے ایک حقیقی شکل میں بدل دیں۔ وزیر موصوف نے اپنی تقریر کے دوران تین چیزوں پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ انداز فکر میں تبدیلی ضروری ہے، کوشش کی، بھروسہ کیا اور ٹیکنالوجی اپنائی، یہ طریقہ کار اپنایا جانا چاہیے اور اگر ایسا ہو، تو شفافیت اور اصالت دونوں اپنے آپ متعارف ہوسکیں گی۔ ان کے مطابق حکومت نے تمام متعلقہ افراد تک مؤثر خدمات بہم رسانی کے لیے ٹیکنالوجی کے استعمال کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ انتظامی اور تعلیمی اصلاحات لانے کے اپنے عہد کو عملی جامہ پہنا سکے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے حکومت کا ارادہ یہ ہے کہ نیشنل اکیڈمک ڈپازیٹری نام کی ایک ڈیجیٹل ڈپازیٹری قائم کی جائے، جس کے توسط سے ان ایوارڈز کی اصلیت جانچی اور پرکھی جاسکے اور انھیں ایک جگہ محفوظ رکھا جاسکے اور آسانی سے ان تک رسائی حاصل کی جاسکے۔ اس سے تعلیمی اداروں، طلبہ اور آجرین کو فائدہ ہوگا، کیونکہ وہ آن لائن تعلیمی اسناد کی جانچ پرکھ کرسکیں گے اور بدعنوانی پر مبنی طریقوں کا خاتمہ ہوسکے گا۔ جعلی اسناد اور مارکشیٹ وغیرہ نہیں پیش کی جاسکیں گی۔ این اے ڈی آن لائن 24 گھنٹے کی بنیاد پر تمام شرکائے کار کے لیے دستیاب ہوگا۔ اس موقعے پر انسانی وسائل کی ترقی اور فروغ کے وزیر مملکت ڈاکٹر مہیندر ناتھ پانڈے اور سکریٹری (اعلیٰ تعلیم) وزارت فروغ انسانی وسائل و نے شیل اوبرائے نے بھی این اے ڈی کے سلسلے میں اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 ستمبر 2016

فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر کے بدست بیگم حضرت محل گرلس ہاسٹل کا افتتاح

نئی دھلی: فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ ملک میں ابھی بھی 75 فیصد سے زائد نوجوان لڑکے لڑکیاں کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم سے محروم ہیں۔ انھوں نے اس کمی کو دور کیے جانے کی سخت ضرورت بتائی۔ جاوڈیکر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کیمپس میں 400 طالبات والا بیگم حضرت محل گرلس ہاسٹل کا افتتاح کرتے ہوئے کہا

کہ ملک میں سو سال پہلے ایسے حالات تھے کہ لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا مشکل کام تھا لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نریندر مودی سرکار نے بیٹی پڑھاؤ بیٹی بچاؤ پروگرام کی مہم چلا کر لڑکیوں کی تعلیم کو مضبوط رفتار دی ہے۔ تقریب کی صدارت وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کی۔ جاوڈیکر نے کہا کہ ملک میں لڑکیوں اور لڑکوں کے درمیان بگڑا جنسی تناسب اب بہتر ہونے لگا ہے۔ تعلیم کا مقصد اچھے انسان بنانا ہے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اس کام کو بخوبی کر رہا ہے۔ قبل ازیں پروفیسر طلعت احمد وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک آزادی کے قومی رہنماؤں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی خوابوں کی تعبیر اور مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر ذاکر حسین، حکیم اجمل خان وغیرہ کی محنت اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کا قیام 29 اکتوبر 1920 کو علی گڑھ کے ایک ویرانے میں چند خیموں کی شکل میں وجود پذیر ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 ستمبر 2016

خلیل الرحمٰن اعظمی: ایک بازیافت

علی گڑھ: خلیل الرحمٰن اعظمی ایک نابغۂ روزگار ادیب اور ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے اردو ادب کی جدید روایت کو مستحکم کرنے میں غیر معمولی کردار

ادا کیا، ان خیالات کا اظہار معروف ادیب و نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے 'خلیل الرحمٰن اعظمی: ایک بازیافت' کے عنوان سے ایک بین الاقوامی سمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا، انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان و ادب کا عصری منظرنامہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ انھوں نے کہا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ترقی پسند تحریک اور نئے ادب کے درمیان ایک راہ نکالی اور اس پر چلنے والے وہ پہلے شخص تھے ان کا ماننا تھا کہ مقصدیت کو ادب پر حاوی نہیں ہونا چاہیے۔ سیمنار کا اہتمام مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو، آئیڈیا کمیونی کیشن اور البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی کے اشتراک سے کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر پروفیسر سید محمد امین میاں قادری نے کی جبکہ معروف فکشن نگار سید محمد اشرف اور مجلس فخر بحرین کے بانی شکیل احمد صبرحدی نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی، بحیثیت مہمان اعزازی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، محترمہ راشدہ خلیل اور اجمل کمار (پاکستان) ہما مرزا، ڈاکٹر سلمان خلیل اعظمی اور ڈاکٹر راحت ابرار نے پروگرام کو رونق بخشی، تعارفی کلمات آئیڈیا کمیونی کیشن کے ڈائریکٹر آصف اعظمی نے پیش کیے، نظامت کے فرائض البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی نے انجام دیے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد امین نے کہا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا مطالعہ انتہائی وسیع اور مشاہدہ بے حد عمیق تھا، وہ نہایت اچھے ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ اچھے استاد تھے مجھے ان کا شاگرد ہونے پر فخر ہے۔ سید محمد اشرف نے کہا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری اور تنقید دونوں اردو زبان و ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے کہا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی مشرقی اقدار اور اردو کی تہذیبی شناخت کے امین تھے، بیگم راشدہ خلیل نے کہا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی ایک اچھے انسان اچھے شوہر اور مثالی باپ تھے، شکیل صبرحدی نے بتایا کہ مجلس فخر بحرین اپنے مشاعروں اور سمیناروں کے ذریعے اردو زبان و ادب کی مشترکہ تہذیبی روایات اور انسانیت کے پیغام کو عام کرنا چاہتی ہے، اسی موقعے پر آصف اعظمی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ افتتاحی سیشن کے بعد ٹیکنیکل سیشن اول کی صدارت پرفیسر عبدالرحیم قدوائی اور پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے کی جبکہ دوسرے ٹیکنیکل سیشن کی صدارت پروفیسر خورشید احمد اور پروفیسر محمد زاہد نے کی۔ مذکورہ سیشن میں پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی، ڈاکٹر مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر مظہر احمد، ڈاکٹر حمیرہ آفریدی، ڈاکٹر محمد اختر، ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر مشیر احمد، ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر قمر عالم، ڈاکٹر محمد شارق، شہواز فیاض اور سلمان فیصل نے مقالات پیش کیے۔ اس موقعے پر پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر شاہد صدیقی، ڈاکٹر راشد انور، ڈاکٹر سیما صغیر، ڈاکٹر صفدر اشرف کے علاوہ یونیورسٹی اور شہر کے معززین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 ستمبر 2016

اردو ادب کے ستون اربعہ اور ان کی وراثت

نئی دھلی: معروف تنظیم 'ایس ویژن' کی جانب سے انڈیا ہیبی ٹیٹ سنٹر، نئی دہلی میں ایک قومی سمینار بعنوان 'عبقری شخصیات اور ان کے مختصر افسانے: اردو ادب کے ستونِ اربعہ اور ان کی وراثت' کا انعقاد کیا اور بیسویں صدی کے سرکردہ اہل قلم اور چار اہم فکشن نگار عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کے ذریعے اردو میں لکھی جانی والی کہانیوں کے سیاق میں ہندستانی ثقافت کے افہام و تفہیم کی کوشش کی۔ تین نشستوں پر مشتمل سیمینار کے افتتاحی سیشن میں 'ایس ویژن' کی روح رواں ڈاکٹر مہر فاطمہ حسین نے خیر مقدمی کلمات کے ساتھ سیمینار کے موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے سماج اور ملک کے بدلتے مزاج اور ضرورتوں کے موجودہ عہد میں موضوع کی معنویت پر پُر مغز گفتگو کی۔ پروگرام کی صدارت اردو کے معروفِ زمانہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر نارنگ نے کہا کہ بعض ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں جو بعض عہد میں خاص اہمیت رکھتی ہیں اور بعض ایسی ہوتی ہیں جو وقت کے بہاؤ میں بے معنی ہوجاتی ہیں۔ انھوں نے اپنے گزرے وقت کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ یہ چاروں شخصیتیں ہمارے بیچ اٹھتی بیٹھتی تھیں، ہم میں کسی کو یہ خیال کبھی نہ آیا کہ کون بڑا ہے کون چھوٹا۔ انھوں نے کہا کہ منٹو نے لکھا ہے کہ جب میں اردو بولتا ہوں تو جھوٹ بولتا ہوں۔ منٹو کی کہانیوں میں تقسیم اور اس کا دکھ درد موجود ہے۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر اختر الواسع نے کہا یہ چاروں تخلیق کار تخلیقیت کے امتیازی نشان ہیں۔ ان چاروں فنکاروں کا ایک زمانہ اور ایک عہد ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ کے بغیر افسانوی ادب کا مطالعہ پورا نہیں ہوسکتا۔ مہمان اعزازی کے طور پر پروگرام میں شریک ڈاکٹر ترنم ریاض نے کہا کہ عصمت کے یہاں 'دل کی دنیا' کے حوالے سے نسائیت کا بڑا توانا تصور پایا جاتا ہے۔ اپنے کلیدی خطبے میں پروفیسر ایم شافع قدوائی نے موضوع کے دائرہ کار کا تعین کرتے ہوئے کہا کہ فکشن نگار عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو میں بہت سے نقطۂ اشتراک ہیں۔ انھوں نے اپنی پُرمغز گفتگو میں موضوع کے جملہ ابعاد کا احاطہ کیا۔ سیشن کے اخیر میں ڈاکٹر اخلاق احمد آہن نے کلمات تشکر پیش کیا۔

پہلا سیشن پروفیسر رضوان قیصر کی صدارت میں شروع ہوا، جس میں کل پانچ مقالے پیش کیے گئے۔ دوسرے سیشن کے چھ مقالات پروفیسر انیس الرحمٰن اور پروفیسر سلیل مشرا کی زیر صدارت پڑھے گئے۔ تیسرے اور آخری سیشن میں کل پانچ مقالے پڑھے گئے۔ سیشن کی صدارت غضنفر علی اور ڈاکٹر محمد انصار الحق نے کی اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے 'ایس ویژن' کی تعریف کی اور تنظیم کی کوششوں کو خوش گوار سماجی تبدیلیوں کا نقیب بتایا۔ اخیر میں مہر فاطمہ حسین نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 اکتوبر 2016

دہلی میں 'قند فارسی وطوطیانِ ہند' پروگرام

نئی دھلی: فارسی شعر وادب نہ صرف ایک خوب صورت تہذیب وثقافت کا دلنشیں عکس ہے، بلکہ فارسی زبان نے

اردو کے حسن کو بھی دوبالا کرنے اور ہندوستان کی خوب صورت تکثیری تہذیب وثقافت کو بھی جلا بخشنے میں تاریخی رول ادا کیا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ آج بھی فارسی ہند-ایران کے قدیم رشتے کو جوڑنے والی مضبوط ڈور بنی ہوئی ہے۔ مذکورہ باتیں جشن بہار ٹرسٹ کی روح رواں کامنا پرساد نے دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقد 'قند فارسی وطوطیان ہند' کے نام ایک شام پروگرام کے دوران کہیں۔ انھوں نے طوطیِ ہند امیر خسرو کے کلام:

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشت حاجت زنار نیست

از سر بالین من بر خیز اے نادان طبیب
درد مندِ عشق راہ دار بہ جز دیدار نیست

سے آغاز کیا۔ انھوں نے فارسی زبان وادب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ اس زبان نے اردو کے حسن کو دوبالا کیا ہے تو ہندوستانی شعرا نے فارسی شاعری کے ذریعے ملک میں گنگا جمنی تہذیب کی جو روشنی پھیلائی ہے اور امن ومحبت ویکجہتی کا جو درس دیا ہے، اس شاعری کو عام کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ فارسی شاعری کی روح یکجہتی ومحبت میں پنہاں ہے۔ اپنے صدارتی کلمات میں کامنا پرساد کی اردو کے تئیں ان کی 20 سالہ خدمات کی ستائش کرتے ہوئے معروف صحافی کلدیپ نیر نے کہا کہ فارسی اور ہندوستان کا رشتہ بہت قدیم ہے۔ میں ایران گیا تو یہ اجاگر ہوا کہ وہاں کے عوام ہندوستان کی پوری تہذیب وثقافت سے آگاہ ہیں۔ ہندوستان کے شعرا کا کمال ہے، جنھوں نے ہند-ایران تعلق کو خوب صورتی عطا کرنے میں فارسی کو اپنی تخلیق کا مرکز بنایا۔ انھوں نے اردو والوں کو تلقین کی کہ ہندی اور اردو فروغ کے لیے فارسی کا مطالعہ ضروری ہے۔ 'ہندوستان میں فارسی شاعری کے سفر' پروگرام کا خوب صورت آغاز داستان گوئی کے انداز میں جے این یو کے شعبہ فارسی کے استاد ڈاکٹر سید اختر حسنین نے کیا۔ انھوں نے داستان گوئی کے دلچسپ انداز کو اپناتے ہوئے غیاث الدین بلبن کے دور سے لے کر گروگوبند سنگھ، میر، غالب، اقبال اور ٹیگور کی گیتانجلی سے لے کر 20 شعرا کے دور اور ان کے فارسی کلمات کا روشن منظر نامہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ گروگوبند سنگھ کو صرف دو زبانیں آتی تھیں سنسکرت اور فارسی۔ انھوں نے سنسکرت میں کچھ نہیں کہا، لیکن ان کی فارسی تخلیق 'ظفر نامہ' کو ہندوستان میں وہی حیثیت حاصل ہے، جو فردوسی کے 'شاہ نامہ' کو ایران میں حاصل ہے۔ اس سے قبل 'قند فارسی وطوطیان ہند' پروگرام کے موقعے پر آئی سی سی آر کے امریندر کھٹوا اور سفارت خانہ ایران کے کلچرل کونسلر علی دیغانی نے بھی ہندوستان میں فارسی زبان اور ہندوستان کی تہذیب کے رشتوں کو اجاگر کرتے ہوئے کامنا پرساد کی ستائش کی اور کہا کہ کامنا پرساد اردو کے فروغ کے ساتھ ساتھ اب جس طرح ہندوستان میں فارسی کو استحکام بخشنے کی جدوجہد کر رہی ہیں، اس سے نہ صرف زبان وادب کی دنیا میں خوش گوار منظر نامہ ابھرے گا، بلکہ ہند-ایران کے درمیان ثقافتی وتہذیبی رشتوں کو بھی مضبوطی ملے گی۔

اس موقعے پر جشن بہار ٹرسٹ کی جانب سے 'ہندوستان میں فارسی شاعری کے سفر' کے عنوان سے ایک ایگزیبیشن کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، جس میں امیر خسرو، بیدل، گروگوبند سنگھ، میر، غالب سے لے کر علامہ اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگور کے فارسی کلام کے خوب صورت بورڈس بھی لگائے گئے ہیں، جو ہندوستان میں فارسی شاعری اور یہاں کی تہذیبی تکثیریت کو اجاگر کر رہے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 ستمبر 2016

نیشنل ایجوکیشنل پالیسی 2016

نئی دھلی: ملک کسی خطہ ارض کا نام نہیں بلکہ وہاں رہنے والی اقوام کی تہذیب وثقافت سے مشتق ہے اور ہر قوم کی ترقی کا انحصار وہاں کے تعلیمی نظام پر منحصر ہے۔ ان خیالات کا اظہار یو جی سی سینٹر فار فیڈرل اسٹڈیز جامعہ ہمدرد اور سہارا نیوز نیٹ ورک کے اشتراک سے موجودہ سرکار کے ذریعے تیار کی جانے والی 'نیشنل ایجوکیشنل پالیسی 2016' پر منعقد مذاکرات کے دوران ملک کے سرکردہ تعلیمی ماہرین نے کیا۔ ماہرین نے کہا کہ ہندوستان تاریخی اعتبار سے ایک اعلیٰ تعلیمی مرکز رہا ہے، جہاں سماجی اور مذہبی تعلیمات کا غلبہ ہے۔ موجودہ دور میں صنعتی تعلیم کے اشتراک نے سماجی اور مذہبی تعلیم کے دائرہ کو تنگ کیا ہے، اس لحاظ سے قومی سطح پر ہندوستان کا تعلیمی لائحہ عمل کیا ہو، یہ ایک قابل توجہ اور اہم موضوع ہے اس بات کی پاسداری سابقہ قومی تعلیمی پالیسی میں صاف نظر آتی ہے چاہے وہ رادھا کرشنن کمیٹی کی سفارشات ہوں، موالیاد کمیٹی کی سفارشات ہوں یا پھر کوٹھاری کمیشن کی سفارشات ہوں ہر اس نکتہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے کیونکہ ہندوستان کا مستقبل کلاس روم میں پرورش پاتا ہے اس کی مناسبت میں کل کا ہندوستان تشکیل پائے گا۔ ہندوستان کے تعلق سے سب سے اہم نکتہ یہی ہے کہ یہاں مختلف مذاہب اور رنگ کے لوگ رہتے ہیں، اس لیے حکومت کو تعلیمی پالیسی میں ہندوستان کے ہر باشندے کے حقوق کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اس مذاکرے کی صدارت جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر سید احتشام حسنین نے کی جبکہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین پروفیسر وید پرکاش نے افتتاحی خطبہ دیا۔ اس پروگرام میں ملک کی مختلف مشہور یونیورسٹیز کے وائس چانسلروں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر یو جی سی کے چیئرمین پروفیسر وید پرکاش نے اپنے طویل خطبے میں ہندوستان میں حصول تعلیم پر خرچ ہونے والی خطیر رقم پر فکرمندی کا اظہار کیا انھوں نے ایسی پالیسی مرتب کرنے کی خواہش ظاہر کی کہ جہاں کم خرچ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بڑے مواقع ملیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیر الدین شاہ نے کلیدی خطبہ میں تعلیمی پالیسی میں ملک کے سیکولر کردار کو بحال رکھنے کی خاص طور سے وکالت کی۔ گروپ ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا اور عالمی سے چینل سید فیصل علی نے ہندوستان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ٹکسلا اور نالندہ جیسے باوقار ہندوستانی

تعلیمی مراکز کا ذکر کیا اور موجودہ دور کے تعلیمی مراکز کے مقاصد اور معیار پر کھل کر گفتگو کی۔ ایمٹی گروپ آف انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین ڈاکٹر اشوک چوہان نے موجودہ دور کو تعلیم کے متعلق سے انقلاب بتاتے ہوئے تعلیمی مراکز کے مقاصد کو واضح کیا جس میں ہر سطح کے طلبا کو تعلیم سے ہمکنار کرنے کے واسطے مختلف کورسز کی فراہمی کو لازمی قرار دیا۔

اپنی صدارتی تقریر میں وائس چانسلر سید احتشام حسنین نے سماج کے تمام طبقوں تک کوالٹی ایجوکیشن پہنچانے کی تدابیر اختیار کرنے پر زور دیا۔

افتتاحی تقریب کے بعد شعبہ تعلیم سے وابستہ کئی اہم نکات پر ماہرین کے گروپ نے مختلف سیشنوں کے دوران نئی تعلیمی پالیسی پر غور و خوض کیا۔ یہ تمام تجاویز مرتب کرنے کے بعد جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کو سونپیں گے۔ اس پروگرام کے کنوینر اور ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنس اینڈ ہیومنیٹیز محمد میاں نے شرکا کا استقبال کرتے ہوئے پروگرام کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ اس سے قبل امام مسجد رابعہ مولانا عبدالملک فاروقی نے تلاوت کلام پاک سے تقریب کا آغاز کیا اور نظامت ڈاکٹر زینت نے کی۔ آخر میں رجسٹرار ڈاکٹر فردوس وانی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 ستمبر 2016

دهلی :

داستانِ جامعہ کے موضوع پر پہلا توسیعی خطبہ

نئی دهلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ٹیگور ہال، دیارِ میر میں پہلے توسیعی خطبے کا انعقاد 'داستانِ جامعہ' کے موضوع پر کیا گیا جسے آکسفورڈ یونیورسٹی (انگلستان) کے استاد پروفیسر محمد طالب نے پیش کیا۔ خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر محمد طالب نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے میری دیرینہ وابستگی رہی ہے۔ میری ابتدائی تعلیم جامعہ اسکول سے مکمل کرنے کے بعد اسی ادارے میں بحیثیت استاد مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ توسیعی خطبے کی صدارت انگریزی کے استاد اور ڈین، فیکلٹی آف لینگویجز پروفیسر محمد اسدالدین نے کی۔ انھوں نے کہا کہ زبان پر قوت اور قدرت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ مہمانوں کا خیر مقدم شعبۂ اردو کے استاد پروفیسر شہپر رسول نے کیا اور کہا کہ جامعہ کے شعبۂ اردو کی دیرینہ روایت میں سے ایک توسیعی خطبے کا انعقاد بھی ہے۔ مہمان مقرر پروفیسر محمد طالب کا تعارف توسیعی خطبے کے کنوینر پروفیسر کوثر مظہری نے پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کا تعلق ادب سے نہ ہو۔ ادب سماج سے کبھی الگ نہیں رہا۔ ایک ماہر سماجیات نے جامعہ کی زندگی کو جس طرح دیکھا، محسوس کیا اور پیش کیا اس سے ہمیں روشنی ملتی ہے۔ توسیعی خطبے کا آغاز جامعہ کے طالب علم نوراللہ کی تلاوت کلام پاک سے ہوا جبکہ بھی مہمانوں کا شکریہ شعبۂ اردو کے استاد پروفیسر شہزاد انجم نے ادا کیا۔ اس جلسے میں پروفیسر خالد محمود، پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین، جامعہ کے لائبریرین ڈاکٹر ایچ جے عابدی، ڈاکٹر مشتاق تجاروی، ڈاکٹر شکیل احمد، ڈاکٹر رحمٰن مصور، شبلی، پروفیسر احمد محفوظ، ڈاکٹر خالد جاوید، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر سرورالہدیٰ، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر مشیر احمد اور جامعہ کے مختلف شعبوں کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبا و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 اکتوبر 2016

ایک شام قومی یکجہتی کے نام

نئی دهلی: کسی زمانے میں محفل و مشاعروں اور ادبی نشستوں کے لیے معروف ملک کی راجدھانی دہلی ایک بار پھر اپنے پرانے رنگ میں رنگتی جارہی ہے جس میں نہ صرف اردو زبان کے دیوانے بلکہ ہندی زبان کے چاہنے والے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ اسی سلسلے کے تحت نئی دہلی کے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے بی ایس عبدالرحمٰن آڈیٹوریم میں ماڈرن انجینئرز انفراٹیک پرائیویٹ لمیٹڈ اور میوات ایجوکیشنل اینڈ سوشل اویکننگ سوسائٹی کے زیر اہتمام 'ایک شام قومی یکجہتی کے نام' کے عنوان سے مشاعرہ و کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا۔ مولانا مصطفیٰ قاسمی نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے تنظیم کے تعلق سے تفصیلی روشنی ڈالی اور بتایا کہ ہماری تنظیم پورے ملک کے مختلف حصوں میں کام کررہی ہے، بالخصوص تنظیم خواتین کی فلاح و بہبودگی کو اولین ترجیح دیتی ہے۔ پروگرام کے کنوینر یحییٰ سیفی نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ مشاعرہ قومی یکجہتی کی عظیم مثال ہے جہاں ہندو اور مسلم شعرا بڑی تعداد میں موجود ہیں یہی ملک کی گنگا جمنی تہذیب ہے۔ مشاعرہ کا آغاز اردو اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی کے نعتیہ کلام سے ہوا۔ مشاعرے میں مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کرتے ہوئے رکن پارلیمان علی انور انصاری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مشاعرہ و کوی سمیلن کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ایسے پروگراموں کی سخت ضرورت ہے، جہاں دیگر مذاہب کے لوگ آپس میں مل جل کر اکٹھے ہوں تاکہ موجودہ دور میں جو نفرت کے ماحول قائم کیے جارہے ہیں، ان کے منصوبوں کو نیست و نابود کیا جاسکے۔ مشاعرہ کی صدارت عزیز بلگامی نے کی جبکہ نظامت نوجوان شاعر بلال بدایونی نے کی۔ اس موقعے پر خورشید حیدر، عرفان راہی، انا دہلوی، نکہت پروین، اوم تیواری، ہاشم فیروز آبادی، مجاور میلا گانوی، شبانہ تبسم، ڈاکٹر امیر امروہوی، روحی چترویدی، سفلتا ترپاٹھی، دیپکا ماہی، راجندر گوال، برج گوال برج نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا جبکہ مشاعرہ کو کامیاب بنانے میں حاجی تنویر احمد، اسلام الدین، اسلم خان سیفی، احسان سیفی کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 ستمبر 2016

اترپردیش:

'معارف' کا سوسالہ سفر: اردو صحافت کا سنگ میل

نجیب آباد: معارف ہندوستانی مسلمانوں کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ یہ دائرۃ المعارف ہے۔ یہ علم کا خزانہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار شبلی اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے شفیق احمد انصاری ٹرسٹ کے زیر اہتمام نجیب آباد میں منعقد معارف صدی تقریبات کے تحت 'معارف کا سوسالہ سفر: اردو صحافت کا سنگ میل' کے عنوان سے منعقد سمپوزیم کے صدارتی خطاب میں کیا۔ سابق گورنر عزیز قریشی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر 'معارف' کے شذرات پر مشتمل دو خصوصی شماروں کی رسم اجرا انجام دی گئی۔ سمپوزیم کے روح رواں جناب نوشاد انصاری کو شبلی اکادمی کی طرف سے سیرت النبی کا ڈیلکس ایڈیشن پیش کیا گیا۔ پروفیسر ظلی نے صدارتی خطاب کے دوران کہا کہ ماہنامہ 'معارف' سخت سے سخت حالات کے دوران بھی شائع ہوتا رہا۔ انھوں نے کہا کہ ملی دردمندی علامہ شبلی کی بنیادی خصوصیت تھی اور اسی جذبے کے تحت انھوں نے کوشش کی کہ مسلمان احساس کمتری سے نکل جائیں، شکست خوردگی کے بجائے وہ اپنے ماضی پر فخر کرسکیں، اسی جذبے نے شبلی کو ایک تحریک کی شکل دی اور ماہنامہ 'معارف' شبلی کی انھیں دردمندیوں کا اشاریہ ہے۔ مہمان خصوصی عزیز قریشی نے منتظمین کو اس اہم پروگرام کے لیے مبارک باد دی اور کہا کہ ماہنامہ 'معارف' ملت کا عظیم سرمایہ ہے۔ انھوں نے ملی امور کے لیے کام کرنے پر زور دیا۔ اس موقعے پر دوسرے شرکا نے بھی اپنے نادر خیالات پیش کیے۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ غالب شناسی اور اقبال شناسی کی کوئی تاریخ معارف کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

ابتدا میں نوشاد انصاری نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عمیر منظر، حافظ رئیس احمد، سید ہاشم، محمد عارف خاں، ہرپال سنگھ ایڈووکیٹ، کامریڈ رام پال، قاضی ارشد مسعود (نگینہ) اور محمد ضیغم نے جلسے سے خطاب کیا اور معارف کی طویل علمی اور ادبی خدمات کا تذکرہ کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 اکتوبر 2016

انیسویں صدی کے دو روشن دماغ سرسید اور حالی

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی- فارسی یونیورسٹی لکھنؤ میں شعبۂ اردو کی طرف سے ایک سیمینار

'بعنوان 'انیسویں صدی کے دو روشن دماغ: سرسید اور حالی' کے موضوع پر ہوا جس میں ڈاکٹر تقی عابدی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کی چار کتابوں کا اجرا بھی کیا گیا۔ کلیات حالی، حالی فہمی، مسدس حالی اور ایک کتاب خود تقی عابدی کی شخصیت پر تھی۔ پروگرام کا آغاز طالب علم معین الحق کے تلاوت کلام اللہ سے ہوا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی نے استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے پروگرام کا مقصد بیان کیا۔ ناظم سیمینار ڈاکٹر ثوبان سعید نے ڈاکٹر تقی عابدی کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر عابدی کے مطابق حالی کی ایک درجن سے زائد نظمیں صرف بچوں کے لیے ہیں۔ تقی عابدی نے کہا کہ ان کی نظمیں بچوں کو روشن دماغ بناتی ہے۔ حالی سے سرسید بہت متاثر تھے۔ سرسید کی ساری تحریکوں اور تنظیموں کو عملی جامہ پہنایا۔ حالی نے برصغیر میں عورتوں کے لیے سب سے پہلے کالج کھولا۔ اس سے پہلے کسی نے یہ کام انجام نہیں دیا۔ حالی نے عورتوں کی تعلیم کی وکالت کی ہے۔ پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ سرسید نے مختلف جہات میں کام کیا۔ انھوں نے اسباب بغاوت ہند و آثار الصنادید اور تہذیب الاخلاق لکھا۔ اسی کتاب کے ذریعہ زبان کو عام کیا۔ سرسید نے لکھا ہے کہ جو تصور تعلیم ہے یہ ہمارے لیے فائدے مند ثابت ہو سکتے ہیں اور حالی بھی مختلف الجہات مخص تھے انھوں نے شعر کے ذریعے عوام تک پیغام پہنچایا اور انھوں نے تنقید کے میدان میں انقلاب برپا کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر خان مسعود احمد نے مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ مستقبل میں بھی اس طرح کے پروگرام ہونے چاہئیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 ستمبر 2016

کرناٹک اردو اکادمی اور اے ایم یو کے اشتراک سے اردو کے امکانات پر گفتگو

علی گڑھ: کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور کا ایک پانچ رکنی وفد اکادمی کے صدر مسٹر عزیز اللہ بیگ کی قیادت میں دو روزہ دورے پر اے ایم یو میں ہے جس کا اہم مقصد کرناٹک اردو اکادمی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے درمیان آپسی تعاون اور اشتراک کے امکانات پر ایک جامع منصوبہ تیار کرنا ہے۔ اس وفد نے سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ سے ملاقات کی اور انھیں بتایا کہ کرناٹک میں پانچ ہزار اسکولوں اور کالجوں میں اردو میڈیم میں تدریس ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی اکادمی چاہتی ہے کہ اے ایم یو کی اردو اکادمی سے بھی راست گفت و شنید کی جائے اور تعاون کے امکانات تلاش کیے جائے۔ وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ نے وفد کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اس ادارے میں زیر تعلیم اردو کے طلبہ و طالبات کے نمبر ڈویژن میں شامل کرنے کا فیصلہ لیا ہے تاکہ طلبہ بہتر طور پر اردو پڑھ سکیں۔ بعد میں اس وفد نے اردو اکادمی کی عمارت میں شعبۂ اردو کے اساتذہ کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر راحت ابرار نے کہا کہ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر کے طور پر وہ ملک بھر کی اردو اکادمیوں اور اردو کی تنظیموں سے رابطہ قائم کر رہے ہیں تاکہ اردو زبان کی اشاعت اور فروغ میں یہ ادارہ فعال کردار ادا کر سکے۔ شعبۂ اردو کے قائم مقام صدر پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ بڑی تعداد میں وہ لوگ بھی اردو سیکھنا چاہتے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ برج کورس شروع کرنے سے بھی یہاں کے طلبہ دوسرے کورسز میں داخلہ لینے کے اہل ہو رہے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ اردو کے معروف ناقد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اردو اکادمی نوڈل ایجنسی کے طور پر ملک بھر کی اردو اکادمیوں سے رابطہ اور کوآرڈی نیشن قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کرناٹک اردو اکادمی کے نمائندگان کے اعزاز میں منعقدہ اس اعزازی جلسے میں سرسید اکادمی کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر اصغر عباس، شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر خورشید احمد سمیت شعبۂ اردو کے اساتذہ نے حصہ لیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 ستمبر 2016

بہار

دہشت گردی کے سدباب میں تصوف کی معنویت

پٹنہ: حضرت دیوان شاہ ارزانی کے عرس کی تقریبات کے موقعے پر کل ہند سیمینار بعنوان 'دہشت گردی کے سدباب میں تصوف کی معنویت' منعقد کیا گیا، جس کی صدارت پروفیسر سید شاہ حسین احمد نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنی صدارتی گفتگو میں کہا کہ خدا نے تکریم انسانیت و آدمیت کے معاملے میں کہیں بھی تفریق نہیں کی ہے۔ اسی لیے صوفیہ نے وحدۃ الوجود کا نظریہ پیش کیا ہے۔ تاکہ انسان کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے۔ حالانکہ قرآن نے کہا ہے کہ جس نے ایک بے قصور کی جان لی اس نے پوری انسانیت کا قتل کیا۔ بے قصوروں، معصوموں کو قتل کرنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ تمام سلاسل نے احترام انسانیت و تکریم آدمیت کا درس دیا ہے اور نہ صرف درس دیا ہے۔ بلکہ صوفیائے کرام اور بزرگان دین نے اس پر عمل کر کے بھی دکھایا ہے۔

سیمینار میں اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے رمز شناس تصوف، معتبر و منفرد فکشن نگار پروفیسر شاہ حسین الحق نے آیت تخلیق انسانیت کی صوفیانہ تشریح کی اور کہا کہ تصوف کا مقصد کسی کو الگ کرنا نہیں ہے۔ وہ سب کو ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک سب اپنے ہیں۔ کوئی غیر نہیں ہے۔ پہلے تعلیم کے کوئی علاحدہ ادارے نہیں ہوتے تھے۔ خانقاہ اور صوفیوں کی چوکھٹ ہی تعلیمی ادارے ہوتے تھے۔ جب سے تعلیم اور تصوف کو علاحدہ کیا جانے لگا تب سے مسئلہ پیدا ہوا کہ اخلاقی تعلیم کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ اب تعلیم برائے تعلیم کا نظام قائم ہے۔ پہلے تعلیم برائے اخلاق کا نظریہ تھا۔

اس موقعے معروف خطیب و عالم مولانا حسن رضا خان نے اپنے مقالے میں انسان کے عناصر ترکیبی کی تشریح کرتے ہوئے صوفیہ کی تعلیمات اور ان کے درس و تدریس کے طریقوں پر گفتگو کی اور کہا کہ صوفیہ کے طریقہ اصلاح باطن کے ذریعہ ہی انسانیت کو دہشت گردی سے چھٹکارہ مل سکتا ہے۔ انھوں نے اس موقع پر مثالیں دے دے کر صوفیہ کے طریقے کو بیان کیا۔ اس موقعے پر روزنامہ انقلاب، پٹنہ کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر احمد جاوید نے کہا کہ اس دور میں خبط پارسائی سب سے بڑا مرض ہے۔

'فروغ اردو سمینار' کا منظر

جوشخص اس مرض کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے علاوہ کسی کو لائق اعتنا نہیں سمجھتا یہی معاملہ ان لوگوں کے ساتھ ہوا، جو اسلام کے نام پر دہشت گردی پھیلا رہے ہیں۔ اسلام میں کہیں بھی دہشت گردی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

پروفیسر زین رامش نے کہا کہ صوفیہ نے جس طرح کی تعلیمات عام کی ہیں۔ انھیں پھر سے عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر مریدین ومتوسلین اور عقیدت مندوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ اس موقع پر پروفیسر مسعود انور علوی کی آفتاب شریعت تصوف ایوارڈ ملنے پر شرکائے سمینار نے مسرتوں کا اظہار کیا اور پروفیسر موصوف کو مبارک باد پیش کی۔

پریس ریلیز: علی حق نورین، پٹنہ 10 ستمبر 2016

فروغ اردو سمینار

مظفر پور: اردو زبان کو ہمارے آبا اجداد نے سجا سنوار کر ہم تک ایک امانت کی شکل میں پہنچایا ہے، اب ہماری ذمے داری ہے کہ اس زبان کو ہم اپنی آنے والی نسلوں تک پہنچائیں۔ اردو فقط ایک زبان نہیں بلکہ یہ ہماری لسانی وتہذیبی ثقافت ہے اور اسے نئی نسل تک پہنچانا ہماری اخلاقی ذمے داری ہے اور اگر ہم نے اس کو نہیں پہنچایا تو ہم پر خیانت کا الزام عائد ہوگا۔ یہ باتیں شفیع مشہدی صدر اردو مشاورتی کمیٹی پٹنہ نے مقامی عابدہ ہائی اسکول کے مولانا ابوالکلام آزاد ہال میں فروغ اردو سمینار میں کہیں۔ واضح ہو کہ اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ کے زیر اہتمام اردو مشاورتی کمیٹی کی سرپرستی میں فروغ اردو سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا، جس میں بڑی تعداد میں ہمدردان اردو نے شرکت کی اور اردو کے مسائل پر بے باک طریقے سے اپنی بات رکھی۔ شفیع مشہدی نے کہا کہ ان کے پاس اردو کے تئیں مسائل آتے رہتے ہیں اور اس کے حل کے لیے وہ پوری ایمان داری سے کوشش کرتے ہیں لیکن اردو دانوں کو بھی اردو کے فروغ کے لیے ایماندارانہ کوشش کرنی چاہیے۔ اس موقعے پر پروفیسر منصور معصوم نے اردو کے فروغ اور ہماری ذمے داریاں، پروفیسر ابوذر کمال الدین پرنسپل تیشور کالج نے اردو عوام کی عدالت میں اور اصناف ادب کے مدیر ڈاکٹر حسن رضا نے فروغ اردو: مسائل اور تدارک سہ جہاتی تناظر میں' کے موضوع پر اپنا بیش قیمتی مقالہ پیش کیا۔ اس موقعے پر اردو ڈائریکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے اردو کے فروغ اور ترقی پر سیر حاصل گفتگو کی اور اردو کے فروغ کے لیے مفید مشوروں سے نوازا جس کی تائید حاضرین سمینار نے بھی کی۔

پروفیسر عبدالواسع سابق صدر شعبہ اردو بہار یونیورسٹی نے اپنے بیان میں کہا کہ زبان تہذیب کے ساتھ فروغ پاتی ہے۔ انھوں نے اردو اور ہندی پر ہورہی تنقید پر سرسید کا وہ جملہ بھی سامعین کی نذر کیا جس میں سرسید نے اردو اور ہندی کو حسین وجمیل عورت کی دو خوب صورت آنکھ قرار دیا تھا یعنی اردو کے بغیر ہندی ادھوری ہے تو ہندی کے بغیر اردو نامکمل۔

اس موقعے پر ترانہ بہار کے خالق معروف شاعر ایم آر چشتی نے سمینار کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہمارا لباس ہے اور دیگر زبانیں زیور، زیور سے خوب صورتی تو بڑھ جاتی ہے لیکن تن نہیں چھپایا جاسکتا۔ سابق وائس چانسلر میجر بل بیر سنگھ نے اردو کی ترقی، ترویج و اشاعت کے لیے بہترین نسخہ بتاتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کے فروغ اور اس کی ترقی کے لیے بڑی بڑی باتیں کی جاتی ہیں لیکن اردو کے تحفظ کے لیے اردو کی باتیں کم کی جائیں اور اردو میں باتیں زیادہ کی جائیں۔ اس کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی اپنی باتیں رکھیں۔ سمینار کی نظامت معروف شاعر و ادیب اسد رضوی نے بخوبی انجام دی، وہیں اخیر میں محمد نور عالم معاون اردو مشاورتی کمیٹی نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اکتوبر 2016

پنجاب:

ایک افسانوی نشست کیول دھیر کے نام

مالیر کوٹلہ: 8 ستمبر پنجاب اردو اکادمی میں ادبی تقریبات کی سیریز کے تحت معروف فکشن نگار ڈاکٹر کیول دھیر کے اعزاز میں ایک افسانوی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس ادبی تقریب میں ڈاکٹر کیول دھیر مہمانِ خصوصی تھے اور پنجاب کے ممتاز افسانہ نگار محترم کرشن نندہ نے اس باوقار ادبی تقریب کی صدارت کی جبکہ شہرت یافتہ صنعت کار اور ماحولیات کے محافظ جناب اندرجیت سنگھ منڈے (کے ایس گروپ) مہمانِ اعزازی کے طور پر تشریف لائے۔ اس افسانوی نشست میں جناب عابد علی خاں، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے 'ایک زخم اور سہی' جناب لیاقت سہیل نے 'پھتھو' جناب محمد ناصر آزاد نے 'بھوک' جناب محمد حنیف آزاد نے 'خوف' جناب کرشن نندہ نے 'انتظار... تادمِ زیست' افسانے پیش کیے۔ سبھی افسانوں اور افسانچوں کو حاضرین نے بے حد سراہا اور داد وتحسین سے نوازا۔ ان افسانہ نگاروں نے سماج کے پسماندہ ترین طبقے بالخصوص غریبوں، مزدوروں، محنت کشوں اور ستم رسیدہ لوگوں کے مسائل کو موضوع بنایا۔

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر کیول دھیر نے پنجاب کے ادبی رشتے کو اردو فکشن کے ساتھ جوڑتے ہوئے بڑے فخریہ انداز میں فرمایا کہ سرزمین پنجاب نے سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی جیسے قدآور افسانہ نگار پیدا کیے ہیں اور مجھے یہ دیکھ کر یقیناً خوشی ہوئی کہ پنجاب میں یہ صنف نسلِ نو کے ہاتھوں نہ صرف محفوظ ہے بلکہ آگے بھی بڑھ رہی ہے۔ معروف بزرگ افسانہ نگار محترم کرشن نندہ نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ملکی تقسیم سے پہلے اردو اور فارسی کا چلن عام تھا اور انہیں ایک مسلم استاد نے دونوں مضامین بڑی محنت سے پڑھائے تھے۔ اور یہ اسی لائق وفائق استاد کی محنت کا ثمرہ ہے کہ میں آج بھی اردو میں لکھنا پڑھنا پسند کرتا ہوں۔ صدر موصوف نے پنجاب اردو اکیڈمی کی جانب سے اردو زبان وادب کی بقا اور فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں کو سراہا۔

اکادمی کے سکریٹری پروفیسر منظور حسن کے اظہار تشکر کے ساتھ ہی یہ باوقار ادبی نشست اختتام پذیر ہوئی۔ اس افسانوی نشست کی۔ نظامت جناب محمد ناصر آزاد نے کی۔

پریس ریلیز: آفس، پنجاب اردو اکادمی، دہلی گیٹ، مالیر کوٹلہ، 8 ستمبر 2016

طلبا میں 'بچوں کی دنیا' تقسیم کرتے ہوئے

تلنگانہ :

وسط ایشیا کے مسلمان، ماضی اور حال کے تناظر میں

حیدر آباد: 'وسط ایشیا کا علاقہ تاریخ عالم میں خصوصی اہمیت کا حامل رہا ہے، ماقبل مسیح سے ہی چین اور یوروپ کے تجارتی قافلے یہاں سے آتے جاتے تھے۔ دور وسطیٰ کا مشہور تجارتی راستہ شاہراہ ریشم (Silk Route) یہیں سے گزرتا ہے۔ اموی دور سے ہی یہاں اسلام کی آمد شروع ہوچکی تھی۔ عباسی دور میں عالم اسلام کے مشہور مراکز علم یہاں قائم ہوئے، جن میں سمرقند، بخارا، کاشغر اور ماوراء النہر کے علاقے شامل ہیں۔ ابتدا میں عربی زبان یہاں رائج ہوئی، پھر ساسانی حکومت نے فارسی کو فروغ دیا، اس لیے فارسی یہاں کی مقامی زبان بن گئی۔''
ان خیالات کا اظہار پروفیسر اقتدار محمد خاں، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مانو میں کیا، جو 'وسط ایشیا کے مسلمان، ماضی اور حال کے تناظر میں' کے عنوان پر اپنا توسیعی خطبہ پیش کررہے تھے۔ انھوں نے وہاں کی علمی وتہذیبی ترقی پر مفصل روشنی ڈالی اور خرتنگ میں امام بخاری کے مزار، تاشقند میں حضرت عثمان کی طرف منسوب قرآن مجید کے نسخہ کے بارے میں گفتگو کی۔

اس موقعے پر شعبہ کی سبجیکٹ ایسوسی ایشن کی جانب سے دو ماہی دیواری پرچہ 'اسلامی مطالعات' کی اجرا معزز مہمان کے ہاتھوں انجام دی گئی۔ معیاری پرچہ کی تیاری پر صالح امین (مدیر) اور ان کے معاونین کی ہمت افزائی کی گئی۔ پروفیسر اقتدار محمد خاں نے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی عمدہ کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز مانو نے کم مدت میں اہم سنگ میل عبور کیے ہیں۔ آخر میں محترمہ ذیشان سارہ (استاذ شعبہ) نے شکریہ ادا کیا جبکہ نظامت محترمہ سیدہ آمنہ (استاذ شعبہ) نے کی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 30 ستمبر 2016

کرناٹک :

ان سے ملیے

میسورو: شہر میسور میں کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے 'ان سے ملیے' پروگرام کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سی خلیل احمد، پروفیسر آف اردو ڈیپارٹمنٹ، کوویمپو یونیورسٹی شیموگہ اور مہمانِ اعزازی پروفیسر ریاض احمد اعزازی صدر رفاہ المسلمین ایجوکیشنل ٹرسٹ، میسور رہے۔ یہ شاندار پروگرام فاروقیہ ڈی ایڈ کالج، اودے گری میں بتاریخ 21 ستمبر 2016 کو منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سی خلیل احمد نے ڈاکٹر حبیب انسا بیگم، پروفیسر حنیف کلیم، پروفیسر ابو تراب خطائی ضامن اور گوہر تری کیروی جیسے معروف اساتذہ کو یاد کرتے ہوئے نعت اللہ خان، سید شرف الدین جیسے اردو کے محسنوں کی خدمات کو بھی سراہا جن کی وجہ سے ان کی اردو میں نکھار آیا اور آج اس نشست میں کھڑے ہونے کا موقع عطا ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ ملناڈ ایک ایسا زرخیز علاقہ ہے جس نے ممتاز شیریں، میمونہ تسنیم، اصغر علی چکمگلوری، حسنی سرور، حنا روحی، جیسی مشہور زماں اردو کی ہستیاں پیدا کیں۔ چائے کے وقفہ میں زہرہ خانم اور نجمہ بیگم نے ترنم میں غزلیات سنا کر خوب داد پائی۔ چائے کے وقفہ کے بعد گوہر تری کیروی نے 'کلام شاعر بزبان شاعر' کے تحت اپنی ایک نظم 'صدائے اتحاد' سنا کر داد حاصل کی۔

مہمان اعزازی پروفیسر ریاض احمد نے بھی اپنے ماضی میں جھانکتے ہوئے ان حقائق پر سے پردہ اٹھایا کہ کس طرح ان کے والدین نے تعلیم کے دوران ہر ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا۔ صدارتی خطاب میں شرف الدین سید، ممبر کرناٹک اردو اکادمی نے بہت اچھے نکات تعلیم اور تربیت کے عنوان پر سامنے رکھے۔ انھوں نے یہ بتایا کہ کوئی بھی مذہب اپنی مادری زبان کے بغیر آگے نہیں بڑھتا۔ اس لیے اپنی بقا کے لیے دونوں لازم وملزوم ہیں۔ حالیہ عالمی سروے سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ معروف مقبول اور بولی جانے والی زبانوں میں اردو کا دوسرا مقام ہے۔ اردو کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ فلموں ٹی وی سیریلوں اور ہندی نیوز بلیٹین کے 90 فی صد مکالمے اردو زبان میں لکھے جاتے ہیں۔

پریس ریلیز: مشتاق سعید، میسور، 30 ستمبر 2016

مہاراشٹر :

طلبا میں 'بچوں کی دنیا' کی 500 کاپیاں تقسیم

اورنگ آباد: آل انڈیا مسلم اوبی آرگنائزیشن کی جانب سے اورنگ آباد کے اردو اسکولوں میں گاندھی جی کے یوم پیدائش کی مناسبت سے 'بچوں کی دنیا' کے خصوصی شمارے کی 500 کاپیاں تقسیم کی گئیں۔ سرسید اردو پرائمری اسکول باجی پورہ میں کتابیں تقسیم کرتے ہوئے آرگنائزیشن کے قومی ترجمان مرزا عبدالقیوم ندوی نے طلبا واساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ '' ماہ اکتوبر میں بھارت کی عظیم ہستیاں پیدا ہوئی تھیں۔ اس لیے ماہ اکتوبر ہمارے لیے بڑا اہمیت کا حامل ہے۔ اس مہینے میں 2 اکتوبر 1889 کو مہاتما گاندھی جی، 17 اکتوبر کو سرسید احمد خان 1817، 2 اکتوبر کو لال بہادر شاستری 1904، سردار ولبھ بھائی پٹیل 31 اکتوبر 1875، 15 اکتوبر 1931 کو اے پی جے کلام کی پیدائش ہوئی ہے۔ اس لیے ہمیں ان شخصیتوں کے بارے میں پڑھنا ہوگا اور ان کی زندگی سے کچھ سبق حاصل کرتے ہوئے قوم وملک کی خدمت کرنا ہوگی۔ گاندھی جی کے یوم پیدائش کو حکومت نے صفائی دن کے نام سے منسوب کیا ہے۔ لہٰذا ہم اپنی بستیوں، گلی کوچوں اپنے محلوں کو صاف ستھرا رکھیں۔ مولانا ندوی نے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ حکومت ہند کے وزارت ترقی انسانی وسائل محکمہ اعلیٰ تعلیم کے زیر اہتمام جاری ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو کے ذریعے شائع کیا جاتا ہے۔ جس کا مقصد طلبا میں اردو زبان وادب کے ساتھ جدید سائنسی ایجادات سے واقفیت بھی کراتا ہے یہ ملک کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ پڑھا جانے والا رسالہ ہے۔ ہمارے شہر اورنگ آباد کو یہ فخر حاصل ہے کہ شروع سے سب سے زیادہ اورنگ آباد میں پڑھا وخریدا جاتا ہے، جس کا سہرا یہاں کے اردو

اسکولوں کے طلباء کو جاتا ہے۔'' آل انڈیا مسلم او بی سی آرگنائزیشن کے جس کے تحت یہ کتابیں تقسیم کی جارہی ہے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ''اس آرگنائزیشن کی بنیاد صدر شبیر احمد انصاری نے ڈالی تھی جس کا واحد مقصد یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے جو مراعات ملتی ہیں اس سے مسلم طلبہ بھی فائدہ اٹھائیں۔ اس کے بعد سرسید پرائمری اسکول میں 200 کتابیں تقسیم کی گئیں اس وقت اسکول کی صدر معلّمہ اور تمام اساتذہ کا تعاون رہا اور انھوں یقین دلایا کہ وہ طلبا میں صاف صفائی اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں شاہد سر اور مختار سر نے حصہ لیا۔ اسی طرح نارے گاؤں میں واقع انجمن اردو پرائمریا اسکول میں بھی کتابیں تقسیم کی گئیں۔ ہرسول میں واقع سعیدہ کالونی کے ڈاکٹر پدم راؤ قدم اردو پرائمری اسکول کے طلبا و طالبات میں گاندھی جی کی زندگی پر شائع بچوں کی دنیا کا خصوصی شمارہ تقسیم کیا گیا۔ اس کار خیر کے لیے تمام اسٹاف نے مرزا عبدالقیوم ندوی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں آئندہ بھی اسکول میں آنے کی دعوت دی۔ واضح ہو گذشتہ سال بھی ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے یوم پیدائش کی مناسبت سے مرزا ورلڈ بک ہاؤس نے شہر کے اسکولوں میں 1000 کتابیں مفت تقسیم کی تھیں۔

پریس ریلیز: مرزا عبدالقیوم بیگ، مہاراشٹر، 13 اکتوبر 2016

مغربی بنگال:

تانیثیت اور اردو ادب

آسنسول: یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے زیراہتمام آسنسول کے رانی گنج گرلس کالج اور کلکتہ یونیورسٹی کے اردو شعبوں کے تعاون و اشتراک سے آسنسول میں دو روزہ قومی سمینار منعقد ہوا۔ آسنسول کے رانی گنج گرلس کالج میں تانیثیت اور اردو ادب کے عنوان سے سمینار کا آغاز کالج کی پرنسپل پروفیسر چھبی دے کے اردو زبان میں استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب میں تانیثیت کے موضوع پر قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اردو شعبہ نہایت ہی دلجمعی کے ساتھ کام کر رہا ہے اور آج کے سمینار میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے نمائندے شامل ہوئے اور رانی گنج گرلس کالج کو اعزاز بخشا۔

افتتاح نذرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر سادھن چکرورتی نے کیا۔ انھوں نے موضوع کے تحت اپنے خیالات پیش کیے۔ کلیدی خطبہ کلکتہ یونیورسٹی اقبال چیئر کی پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی نے دیا۔ انھوں نے خواتین کے دبے کچلے رہنے پر اظہار افسوس کیا اور منوسمرتی کی روشنی میں عورتوں اور شودر کے مقامات کی وضاحت کی۔

افتتاحی اجلاس میں پٹنہ مظہر الحق عربی یونیورسٹی کے پروفیسر توقیر عالم، کلکتہ یونیورسٹی شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر ندیم احمد، جواہر لعل یونیورسٹی کے پروفیسر معین الدین جینابڑے وغیرہ نے خطاب کیا۔ دو روزہ سمینار میں علاقائی اور ریاست کے دیگر کالجوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ سمینار کی صدارت پرنسپل نے اور نظامت ڈاکٹر فاروق اعظم نے کی۔ اظہار تشکر ڈاکٹر فرزانہ شاہین نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، کولکاتا، 3 ستمبر 2016

اعزاز و اکرام:

ڈاکٹر سید احتشام حسنین

جامعہ ہمدرد کے نئے وی سی

نئی دھلی: معروف سائنس داں اور یونیورسٹی آف حیدرآباد کے سابق وائس چانسلر، ڈاکٹر سید احتشام حسنین

جامعہ ہمدرد کے نئے وائس چانسلر مقرر کیے گئے ہیں اور انھوں نے 2 ستمبر کو اپنا عہدہ بھی سنبھال لیا ہے۔ جامعہ ہمدرد کے رجسٹرار ڈاکٹر فردوس اے وانی کی اطلاع کے مطابق 'جامعہ ہمدرد کے آرٹیکل آف ایسوی ایشن کی فعہ 25 میں تفویض اختیار کا استعمال کرتے ہوئے یونیورسٹی کے چانسلر نے ڈاکٹر سید احتشام حسنین کو جامعہ ہمدرد کا نیا وائس چانسلر مقرر کیا ہے۔ وہ یو جی سی کی ہدایات کے مطابق 5 سال یا ریٹائرمنٹ کی مدت (جو پہلے ہو) تک وائس چانسلر کے عہدے پر رہیں گے۔

اس تقرری کے وقت ڈاکٹر حسنین آئی آئی ٹی دہلی کے KUSUMA School of Biological Sciences میں مدعو پروفیسر شپ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ اس سے قبل حیدرآباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ انھیں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے پدم شری ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ وہ DNA Fingerprinting and Diagnostics (CDFD) Hyderabad کے اوّلین ڈائرکٹر بھی رہ چکے ہیں اور طویل عرصے تک دہلی یونیورسٹی میں بھی تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 ستمبر 2016

ممبئی کے چار اردو اساتذہ کو ایوارڈ

ممبئی: یکم اکتوبر ممبئی میونسپل کارپوریشن نے اردو کے چار اساتذہ کو مثالی معلم کا ایوارڈ سے سرفراز کیا ممبئی کے پارلا علاقے میں موجودہ دینا ناتھ منگیشکر ہال میں ممبئی میونسپل کارپوریشن کی میئر اسنیہل امبیکر کے ہاتھوں تمام اساتذہ کو اس ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا، ممبئی میونسپل کارپوریشن میں موجودہ میونسپل اسکول، ایڈیڈ، نان ایڈیڈ، پرائیویٹ اور دیگر تمام اسکولوں کے اساتذہ اور صدر مدرسین میں سے اردو کے کل چار اساتذہ کا انتخاب کیا گیا تھا اپنے وارڈ اور زون سے منتخب ہونے کے بعد مختلف انٹرویو وغیرہ سے گزر کر امیدوار کا انتخاب عمل میں آیا، اس میں ممبئی میونسپل کارپوریشن کی اسکولوں میں چلنے والے پروجیکٹ اسکول ایکسیلنس پروگرام کے سینٹرل ٹیچر کوچ، دھاراوی میونسپل اردو اسکول ممبرا کے معلم انصاری عمران امین، شیواجی نگر میونسپل اردو اسکول نمبر 9 سے قریشی زبیر احمد محمد حسین، نوپاڑہ میونسپک اردو اسکول کرلا سے انصاری اخلاق احمد محمد رمضان، اور جے مہاراشٹر میونسپل اردو اسکول گھاٹ کوپر سے ثریا محمد حنیف کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ میئر ایوارڈ کے ساتھ سرٹی فکیٹ، ممبئی میونسپل کارپوریشن کے ہولوگرم کا گولڈ میڈل، ٹرافی، شال اور گلدستہ کے ساتھ دس ہزار روپے پر مشتمل تھا جو ممبئی کی میئر کے ہاتھوں منتخب اساتذہ کو پیش کیا گیا۔ ایوارڈ ممبئی کی میئر اسنیہل امبیکر کے ہاتھوں تمام اساتذہ کو عطا کیا گیا جس میں میونسپل کمشنر اور ایجوکیشنل آفیسر وغیرہ کے علاوہ ریاستی وزراء کے ساتھ ساتھ شہر اور اردو کی اہم اشخاص بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 12 اکتوبر 2016

ڈاکٹر آصف کو اعزاز

نئی دھلی: بین الاقوامی انڈس ایجوکیشن فاؤنڈیشن ممبئی کی جانب سے گوتم بدھ یونیورسٹی گریٹر نوئیڈا میں شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر آصف کو انعام سے نوازا گیا ہے۔ ممبئی کے اندھیری علاقے میں واقع معروف للت ہوٹل کی عمارت میں اردو ادب کے حوالے سے اس طرح کی تقریب کا منعقد کیا جانا اور گوتم بدھ یونیورسٹی کے کسی استاد کو اعزاز بخشا بڑی بات ہے۔ شاید اسی لیے تحقیق و تنقیدی خدمات پر ڈاکٹر آصف کو ایوارڈ ملنے پر یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں نے مبارکباد پیش کی ہے۔ واضح رہے کہ انڈس ایجوکیشن نصف دہائی سے اس طرح کی تقریبات کا اہتمام کرتا آرہا ہے، فاؤنڈیشن کا اصل مقصد تخلیق و تحقیق میں نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیات کا اعتراف کرنا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 ستمبر 2016

محمد عارف اقبال کو علامہ شبلی نعمانی ایوارڈ

نئی دہلی: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سابق جنرل سکریٹری و امارت شرعیہ بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ کے سابق امیر شریعت سادس، حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات پر مشتمل دوسری کتاب 'امیر شریعت سادس، نقوش وتاثرات' کی تالیف پر مرکزی جمعیۃ علما نے سوانح نگار محمد عارف اقبال کو 'علامہ شبلی نعمانی ایوارڈ' وتوصیفی سند سے سرفراز کیا ہے۔ گذشتہ دنوں مرکزی جمعیۃ علما کی جانب سے غالب اکادمی میں منعقدہ پروگرام 'ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور ہماری ذمے داریاں' کے موقعے پر ڈاکٹر شکیل احمد (سابق مرکزی وزیر مملکت برائے امور داخلہ حکومت ہند)، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) ومحمد ادیب (سابق ممبر پارلیمنٹ) کے دست مبارک سے عارف اقبال کو ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر شریک علمائے کرام اور دانشوران نے عارف اقبال کے اس اہم اور تاریخی کام پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے تابناک مستقبل کی دعائیں دیں اور گراں قدر ایوارڈ پیش کرنے پر مرکزی جمعیۃ علما اور اس کے جنرل سکریٹری مولانا فیروز اختر قاسمی کو بھی مبارک باد پیش کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 اکتوبر 2016

'میوا مرکز' میسور میں انعامات اور اسناد کی تقسیم

میسورو: 'میوا مرکز' آج کل توجہ کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ یہ مرکز ایک ایسے علاقہ میں کھولا گیا ہے جہاں کے مکین پچھڑے، کمزور اور پست ماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مرکز میں طلباء اور طالبات کا مستقبل روشن کرنے کے لیے روٹی روزگار سے جڑے فنون تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے جیسے ٹیلرنگ، کشیدہ کاری، فیشن ڈیزائننگ، مہندی ڈیزائننگ، ڈی ٹی پی۔ ان کے ساتھ یہاں اردو پڑھانے اور سکھانے کا موقع بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ خصوصاً ایسی ڈراپ آؤٹ لڑکیاں جو امتحانات میں فیل ہو جانے کے بعد تعلیم حاصل کرنے میں اکتاہٹ محسوس کرتی ہیں۔ انھیں یہاں اردو کی تعلیم حاصل کرنے کا بہترین موقع دیا جاتا ہے۔ 21 ستمبر 2016 کو سہ پہر کے ساڑھے تین بجے میوا مرکز شانتی نگر، میسور میں حال میں منعقد ہوئے امتحانات میں کامیاب طلبا اور طالبات میں انعامات اور اسناد کی تقسیم عمل میں آئی۔ یہ نشست کیپٹن میر افضل حسین کی صدارت اور نعمت اللہ خان کی نظامت میں عمل میں آئی۔ جس کے مہمانان خصوصی، شرف الدین سید (ممبر اردو اکادمی)، ڈاکٹر سی خلیل احمد (پروفیسر شعبۂ اردو کوومپو یونیورسٹی، شیموگہ) پروفیسر باقر عمر اور شری مہیش (پرتھم آرگنائزر) رہے۔ نعمت اللہ خان نے اپنے استقبالیہ کلمات میں مہمانوں کی اطلاع کے لیے 'میوا مرکز' کی مختصر سی رپورٹ پیش کی۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں میسور میں اردو دانی اور اردو زبان دانی کے جملہ 9 مراکز ہیں۔ جن میں چند ملیالم کی طالبات بھی اردو میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ تمام مہمانان کے بدست کامیاب طلباء اور طالبات میں انعامات اور اسناد تقسیم کیے گئے۔ اس اجلاس میں باقر عمر اور مہیش نے بھی طلباء اور طالبات کا حوصلہ بڑھانے والی تقاریر کیں۔ کیپٹن میر افضل حسین نے صدارتی کلمات پیش کیے۔ نعمت اللہ خان کے اظہار تشکر کے ساتھ ہی یہ محفل شام کے چھ بجے اختتام پر پہنچی۔

پریس ریلیز: مشتاق سعید، میسور، 30 ستمبر 2016

ڈاکٹر اوصاف سعید کے استقبالیے کا منظر

ڈاکٹر اوصاف سعید کو استقبالیہ

نئی دہلی: شکاگو امریکہ میں ہندوستان کے قونصل جنرل ڈاکٹر اوصاف سعید کی امریکہ سے دہلی آمد کے موقعے پر ان کے اعزاز میں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر دہلی میں پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر اوصاف سعید قونصل جنرل ہندوستان، شکاگو، امریکہ پچھلے 25 سالوں سے مختلف محاذوں پر مختلف طریقوں سے خصوصاً سیاسی، معاشی، تہذیبی میدانوں میں ہندوستان کی بھرپور ڈپلومیٹک نمائندگی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر اوصاف ہندوستانی طریقۂ طب یعنی آیوش کے زبردست مداح ہیں اور اس کو مقبول بنانے کے لیے امریکہ میں بہت سی سائنس سمٹ اور صحت بیداری سیمینار منعقد کرا چکے ہیں۔ ان کی دہلی آمد کے موقعے پر ان کی خدمات کے اعتراف میں ایک پروگرام کا انعقاد انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کی جانب سے گیا جس میں خصوصاً وزارت آیوش حکومت ہند کے افسران اور یونانی ادویات بنانے والی بڑی بڑی کمپنیوں کے ذمہ داران کو مدعو کیا گیا۔ اس موقعے پر شکاگو، امریکہ سے تشریف لائے حکمہ ہربل ایل ایل سی کے سی ای او سید حسین خندمیری اور معروف دواساز کمپنی ہمدرد لیباریٹریز دہلی کے ڈائرکٹر حامد احمد اور یونانی و آیورویدک دواساز کمپنی ریکس ریمیڈیز پرائیویٹ لمیٹڈ کے مینیجنگ ڈائرکٹر محمد شعیب اکرم، وزارت آیوش حکومت ہند کے آئی ایف ایس جوائنٹ سکریٹری انل گنیری والا، ڈاکٹر غزالہ جاوید انٹرنیشنل کوآپریشن وزارت آیوش اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے سی ای او تنویر حاذق اور عذرا رزاق، حکیم ام الفضل اور سید نصیر الدین وقار ایڈوائزر حکمہ ہربل امریکہ و دیگر معزز حضرات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر انل گنیری والا نے ہمدرد کے ذریعے شروع کیے گئے ویلنیس کلینک کی تعریف کی تو ساتھ ہی ریکس ریمیڈیز کی طب یونانی کو فروغ دینے کی کاوشوں کو سراہا جو ملک و بیرون ملک میں جاری ہیں۔ سید اوصاف نے بھی اپنے اعزاز پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 ستمبر 2016

اجرا:

آئینہ انیس و دبیر

ممبئی: ممبرا کے زمزم ہال میں منعقد تقریب میں 'آئینہ انیس و دبیر' کا اجرا عمل میں آیا، تقریب کی صدارت پروفیسر مجاہد حسین اور نظامت عرفان جعفری نے کی، اس کا آغاز قاری محمد شمیم کی تلاوت کلام اللہ سے ہوا۔ 384 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو ظہیر احمد عرف ڈلارے نے ترتیب دیا ہے، جس میں انیس و دبیر کی مرثیہ خوانی کا موازنہ کیا گیا ہے، کتاب کے آغاز میں محترمہ سکندر جہاں (ریاض) کے قلم سے کتاب کے مولف کی زندگی پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اعجاز ہندی کے تعارفی کلمات کے بعد ریاض سے آئے اسلامی اسکالر ڈاکٹر اعظمی ندوی نے میر انیس کی حیات اور ان کے فن کے تعلق سے 6 صفحاتی مقالہ پیش کیا، جس میں مرثیہ کی اصناف پر بھی بحث کی گئی ہے۔

دوسرا مقالہ تحقیقات شرعیہ اکادمی کیرانہ (یوپی) کے ڈائرکٹر مولانا محمد عرفان ثاقب نے پیش کیا جس میں مرزا دبیر کے فن، زیر بحث اشعار کی تشریح اور مرثیہ کی تاریخ نیز مشہور مرثیہ نگاروں کا تاریخی جائزہ لیا گیا۔ قبل ازیں ڈاکٹر اعجاز شعور اعظمی نے کتاب کی افادیت کے حوالے سے پرمغز خطبہ پیش کیا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر مجاہد حسین نے مرثیہ خوانی کے آغاز و عروج کو بیان کیا اور کہا کہ مرثیہ متعلقہ شخص کی زندگی کی صفات کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ تقریبا مولانا عبدالحکیم مدنی کے دعائیہ کلمات پر اختتام پذیر ہوئی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 28 ستمبر 2016

نسخہ ہائے دردِ دل

علی گڑھ: بزمِ نوید سخن رجسٹرڈ علی گڑھ کے زیر اہتمام اور ابن سینا اکادمی کے اشتراک سے ابن سینا اکادمی ہال دودھ پور سول لائن علی گڑھ میں معروف خطاط اور شاعر فطین اشرف صدیقی مقیم صلالہ اومان کے شعری مجموعہ 'نسخہ ہائے دردِ دل' کے رسم اجرا کی تقریب پدم شری حکیم پروفیسر سید ظل الرحمٰن، ڈاکٹر الیاس نوید گنوری، مولانا اصغر اعجاز قائمی جلال پوری، معروف صحافی عالم نقوی اور انجینئر خالد فریدی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان، مولانا اصغر اعجاز قائمی جلال پوری اور ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے فطین اشرف صدیقی کی شاعری اور ان کے مجموعہ کے حوالے سے گفتگو کی۔ اس موقعے پر پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان کی صدارت میں ایک محفل مشاعرہ کا بھی انعقاد عمل میں آیا جس میں بطور مہمانان خصوصی استاد الشعرا ڈاکٹر الیاس نوید گنوری اور معروف صحافی عالم نقوی شامل ہوئے۔ اس تقریب میں کثیر تعداد میں شائقین ادب نے شرکت کی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 1 اکتوبر 2016

پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں

نئی دہلی: اردو کے شاعر ڈاکٹر حنیف ترین کے شعری مجموعہ 'پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں' کی رسم اجرا دست

نائب صدر جمہوریہ جناب حامد انصاری کی رہائش گاہ پر عمل میں آئی۔ نائب صدر جمہوریہ نے ان کی شاعری کے حوالے سے کہا کہ یہ وقت کی آواز ہے جو ان کے قلم کی محتاج ہے۔ زندگی کے مسائل کو جس عمدگی کے ساتھ حنیف ترین اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں وہ انھی کا خاصہ ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی حنیف ترین کا مبارک باد پیش کی کہ آپ ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اچھا ادب بھی تخلیق کر رہے ہیں، جو مشکل کام ہے کہ اس مصروف ترین پیشے سے تعلق کے باوجود ادب کے لیے وقت نکالتے ہیں۔ حنیف ترین کا شمار معتبر شعرا میں کیا جاتا ہے۔ سعودی عرب میں کئی سال گزارنے کے بعد وہ اب مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 ستمبر 2016

ضیائے مبین

سیتاپور: ضلع کے تاریخی قصبہ خیرآباد میں معروف شاعر مرحوم سید مبین علوی کی یوم وفات پر ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ ساتھ ہی ان کا نعتیہ شعری مجموعہ ضیائے

مبین کا رسم اجرا ریاض سعودی عرب سے آئے ہوئے سہیل احمد نے کیا جو کہ اس پروگرام کے مہمان خصوصی بھی تھے۔ رسم اجرا کے بعد سہیل احمد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ خیرآباد ملک کا وہ علمی خطہ ہے جس نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرون ہندوستان میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے جب خیرآباد کا نام سرزمین سعودی عرب میں علم ادب کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مرحوم سید مبین کی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ موصوف نے خیرآباد ادبی فضا کو ہمیشہ قائم و دائم رکھنے کے لیے کوشاں رہے۔ اپنی ملازمت اور خانگی مصروفیات سے وقت نکال کر ادبی حلقوں میں یہاں سرگرم رہا کرتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 ستمبر 2016

اندھیرے سے پرکاش کی اور

نئی دہلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں (بریگیڈیئر) ڈاکٹر مختار عالم کی تحریر کردہ کتاب 'اندھیرے سے پرکاش کی اور' کتاب کا اجرا کی تقریب عمل میں آئی۔ تقریب کا آغاز مولانا وقاری خالد مصطفیٰ کی تلاوت کلام اللہ سے ہوا جبکہ نظامت کے فرائض معروف صحافی مولانا وقاری حاجی عبدالودود ساجد نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کرتے ہوئے آئی آئی سی سی کے صدر سراج الدین قریشی نے کہا کہ دراصل یہ تصنیف قرآن کریم کے چند اہم موضوعات کا ہندی ترجمہ ہے، پچھلے سال بھی ڈاکٹر مختار نے اردو میں 'قرآن آپ سے کیا کہتا ہے' پیش کی تھی اور ایک بار پھر میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ مجھے اس اہم کتاب کی رسم اجرا کا موقع فراہم ہوا۔ سراج الدین قریشی نے یہ بھی کہا کہ بریگیڈیئر صاحب نے اب تک 10 سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں اور 50 سے زائد قومی و بین الاقوامی موضوعات پر مقالے لکھے ہیں اور حکومت مہاراشٹر نے 2013 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا اور یہ ان کے لیے کسی فخر سے کم نہیں کہ ان کی اردو کتابوں کے ہندی، انگریزی، اور مراٹھی میں بھی ترجمے ہوئے ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر مختار عالم نے کہا کہ یہ کتاب ہمیں سکھاتی ہے کہ یہ زندگی فانی ہے جو دنیا میں کریں گے وہی نتیجہ ہمیں آخرت میں ملے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی 21 ستمبر 2016

'ہر سانس محمد پڑھتی ہے' کا انگریزی ترجمہ

دربھنگہ: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کی دفتر دمری منزل (ڈاکٹر آفتاب حسین کمپلکس، سبھاش چوک، دربھنگہ) میں پروفیسر عبدالمنان طرزی صاحب کی صدارت میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کی کتاب 'ہر سانس محمد پڑھتی ہے' کا انگریزی ترجمہ 'انکومیم ٹو ہولی پروفیٹ' (جس کا ترجمہ سید محمود احمد کریمی نے کیا ہے) کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر کئی ادیب اور دانشور حضرات موجود تھے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر منصور خوشتر نے کی۔ انھوں نے پروگرام کی افتتاحی تقریب میں کہا کہ سید محمود احمد کریمی صاحب نے 'انکومیم تو ہولی پروفٹ' کے نام سے 'ہر سانس محمد پڑھتی ہے' کا ترجمہ کر کے اردو ادب کو انگریزی زبان کی چاشنی عطا کی ہے۔ اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس سلسلے میں مختصر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر عالمگیر شبنم صدر انجمن ترقی اردو نے کہا کہ ''محمود احمد کیریمی کے ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اس کو ہوبہو ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ میر امن نے جس طرح باغ و بہار کی شکل میں 'قصہ چہار درویش' یا 'نوطرز مرصع' کی طرح مفاہیم کا لفظی شکل عطا کیا ہے جس کی وجہ سے یہ ترجمہ نہ ہو کر ایک نئی تخلیق کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر شاکر

خلیق (سابق صدر شعبۂ اردو، ایل این ایم یو، دربھنگہ) اور صفی الرحمٰن راعین نے بھی کتاب کے ترجمے پر روشنی ڈالی۔ صدر جمہوریہ ہند سے ایوارڈ یافتہ عالمی شہرت یافتہ شاعر پروفیسر عبدالمنان طرزی نے سید محمود احمد کریمی سے اپنے 50 سالہ تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے اس ترجمے کے لیے مبارک باد پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 ستمبر 2016

نالج مینجمنٹ ان لائبریریز

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) نے شعبۂ لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس میں منعقدہ ایک جلسے کے دوران شعبے

میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد ناظم اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے ڈاکٹر بھاسکر مکھرجی کے ذریعے مشترکہ طور پر تصنیف کردہ کتاب 'نالج مینجمنٹ ان لائبریریز: کنسپٹ، ٹولس اینڈ اپروچز' کی رہنمائی کی۔ اس کتاب کی اشاعت امریکہ چندوس پبلی کیشنز نے کی ہے۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر جنرل شاہ نے کہا کہ انسان اور سماج کے لیے علم کی بہت اہمیت ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کے معلومات کے زمانے میں متعلقہ انفارمیشن حاصل کرنا ایک چیلنجنگ کام ہے۔ انھوں نے کہا کہ صحیح انفارمیشن کو دوبارہ حاصل کرکے اس کے صحیح استعمال سے لوگوں کو انوویٹ اور ایکسل کرنے میں مدد حاصل ہوگی۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد ناظم نے کتاب لکھنے کے دوران ہوئے اپنے تجربات کے بارے میں بتاتے ہوئے کتاب کے عنوان سے متعلق تفصیلات اور اس کی خصوصیات بھی بیان کیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 24 ستمبر 2016

بازگشت غالب

علی گڑھ: ابن سینا اکادمی دودھپور علی گڑھ میں ایک پروقار تقریب اور شعری نشست کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت پدم شری حکیم ظل الرحمٰن نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر افشاں ملک نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ تقریب کے پہلے دور میں پرگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر اور علی گڑھ کے معروف کہنہ مشق شاعر جمنا پرشاد راہی کے شعری مجموعے 'بازگشت غالب' کا اجرا عمل میں آیا۔ بعد ازاں مقررین نے ان کی کتاب ان کے فن شاعری اور غالب شناسی پر تبصرہ کا۔ پروگرام کی صدارت فرمارہے حکیم ظل الرحمٰن نے کہا کہ علی گڑھ کے جن شعرا نے مجھے متاثر کیا اور جن سے یک گونہ شناسائی رہی ان میں جمنا پرشاد راہی ہر طور سے قابل ذکر ہیں۔ وہ تقریباً 14 سال سے ابن سینا اکادمی سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی شائستگی اور شادابی نے دل پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان کے والد مہا پرشاد بھیکم پوری ایک اچھے شاعر تھے۔ میں ان کے شعری مجموعے 'بازگشت غالب' کے رسم اجرا پر ان کو دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 27 ستمبر 2016

ظفر انور اور قدر پاروی کی کتابوں کا اجرا

نئی دهلی: معروف صحافی ظفر انور کی کتاب 'بہار و بنگال کے صحافی اور قدر پاروی کے بغیر الف کی غزلوں کا مجموعہ 'فکر بے ستون' کا اجرا اور مشاعرہ کی تقریب میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ صحافت سماج کا آئینہ ہے اور قوم کا عکاس ہوتا ہے اس کے اندر ہر طبقات کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ صحافت کی دنیا میں ایسے بہت سے گمنام ہیں جن کو ہم لوگ نہیں جانتے۔ ان کے بارے میں جاننے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر اپنے کلیدی خطاب میں دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اور مہمان خصوصی ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے ظفر انور کی صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تحریروں میں خلوص کی چمک ہے۔ اشہر ہاشمی نے کہا کہ ظفر انور نئی نسل کے بڑے صحافیوں میں گنے جاتے ہیں۔ آج چھوٹے چھوٹے اردو اخبارات ہی عام لوگوں کے سکھ دکھ کی بات کرتے ہیں۔ صحافت اور ادب میں تعصب نہیں ہونا چاہیے۔ اس موقعے پر دوسرے شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2016

وفیات

حکیم محمد ایوب عثمانی

نئی دهلی: حکیم محمد ایوب عثمانی کا 10 ستمبر 2016 کو گڑگاؤں میں واقع ایک پرائیویٹ اسپتال میں تقریباً 70 سال کی عمر میں مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹیاں ہیں۔ حکیم عثمانی مایہ ناز حکیموں میں شمار ہوتے تھے اور وہ سنٹرل کاؤنسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (سی سی آر یو ایم)، نئی دہلی کے جوائنٹ ڈائرکٹر کے عہدہ سے تقریباً دس سال قبل سبکدوش ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے وہ ابوالفضل انکلیو میں واقع ایم بلاک میں اپنے ذاتی مطب میں مشغول تھے۔ بڑے پیمانے پر عوام نے ان سے استفادہ کیا۔

محمد عمران قنوجی، پریس سکریٹری، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، نئی دہلی، 10 ستمبر 2016

سوم آنند

نئی دهلی: اردو کے ممتاز بزرگ صحافی سوم آنند اپنی 15 ستمبر 2016 کو اپنی قیام گاہ پر انتقال کرگئے۔ وہ طویل

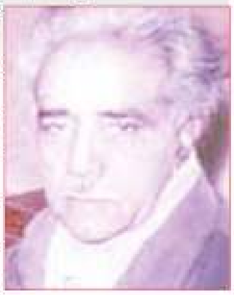

عرصے سے علیل تھے اور دو تین دن سے نیم بیہوشی کی حالت میں تھے۔ انھوں نے صبح سات بجے آخری سانس لی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً 87 سال تھی۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ ان کی آخری رسومات دوپہر ایک بجے نارائن علاقے میں انجام دی گئیں۔

سوم آنند 1929 میں قصور (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن لاہور میں گزرا اور تقسیم کے بعد دہلی منتقل ہوگئے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز انگریزی روزنامہ 'اسٹیٹسمین' سے کیا اور اس کے بعد اردو اور انگریزی میں پابندی سے لکھتے رہے۔ انھیں اردو زبان سے انتہائی محبت تھی۔ انھیں فوٹوگرافی کا بھی بے حد شوق تھا۔ پاکستان کے روزنامہ 'امروز' میں ان کے کالم پابندی سے شائع ہوتے تھے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی موقتی طور پر کئی سال وابستہ رہے۔ جہاں سے ان کے تبصرے اکثر و بیشتر نشر ہوتے تھے۔ جب 1992 میں یو این آئی اردو سروس کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس سے منسلک ہوگئے اور تقریباً 15 برس تک اس سے وابستہ رہے۔ اردو کے مشہور روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد سے بھی سوم آنند کا گہرا رشتہ تھا۔ اس کے لیے وہ مستقل طور پر ایک ہفتہ وار کالم لکھا کرتے تھے۔ آنند صاحب کو اپنے آبائی شہر لاہور سے بے حد محبت تھی جہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔ تقسیم سے پہلے کے لاہور سے متعلق ان کے مضامین اکثر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ لاہور سے متعلق یادوں پر

بمبئی ان کی ایک تصنیف 1980 میں 'اتمیں لاہور کی' عنوان سے دہلی کے مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی تھی۔ بعد میں اس کے نئے ایڈیشن کے لیے انھوں نے کئی ابواب کا اضافہ کیا۔ یہ نیا ایڈیشن 'کہاں گیا میرا شہر لاہور' کے عنوان سے 2003 میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کا انگریزی ایڈیشن بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ سوم آنند کو اردو سے بے پناہ عشق تھا وہ اکثر کہا کرتے تھے 'لاہور میرا وطن ہندوستاں میرا ملک ہے، میرا پہلا اور آخری عشق اردو ہے۔'

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 16 ستمبر 2016

انیس جامعی

نئی دھلی: یو این آئی اردو سروس کے سابق سربراہ اور دہلی کے معروف صحافی و سماجی کارکن انیس جامعی کا 21 ستمبر 2016 کو انتقال ہوگیا۔ وہ 63 برس کے تھے اور کچھ عرصے سے گردے کے عارضے میں مبتلا ہونے کی وجہ سے علیل تھے۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہے۔ وہ 1992 میں یو این آئی اردو سروس کے قیام کے بعد سے 21 برس تک اس سے وابستہ رہے اور 2013 میں شعبہ کے سربراہ کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ اس سے پہلے وہ دہلی سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ پرتاپ میں بھی برسوں تک کام کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز اسی اخبار سے کیا تھا۔

خبررساں ایجنسی سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے اپنی زندگی سماجی خدمات کے لیے وقف کردی تھی۔ اردو سروس کے فروغ اور ترقی کے لیے انھوں نے انتھک جدوجہد کی۔ انھیں مذہبی امور پر بصیرت حاصل تھی اور سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مسٹر انیس الرحمٰن دہلی کے اردو حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ وہ دہلی کی شاہی جامع مسجد کی مشاورتی کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ دہلی کے شاہی امام نے ان کے انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ انیس جامعی (انیس الرحمان) کا جسد خاکی بعد نماز دوپہر بٹلہ ہاؤس قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ نماز جنازہ شاہی امام سید احمد بخاری نے پڑھائی۔ جنازے میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے نمائندوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 21 ستمبر 2016

ریوتی سرن شرما

نئی دھلی: آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے لیے کئی مشہور ڈرامے اور ٹی وی سیریل لکھنے والے ہندی اور اردو کے مشہور ڈرامہ نگار ریوتی سرن شرما کا 23 ستمبر 2016 کو انتقال ہوگیا۔ وہ 92 برس کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے ہیں۔ مسٹر شرما کی شادی مشہور مصنف کرشن چندر کی بہن سے ہوئی تھی۔ یکم اکتوبر 1924 کو پیدا ہوئے مسٹر شرما نے آل انڈیا ریڈیو کے لیے تقریباً 150 ڈرامے لکھے تھے اور دوردرشن کے لیے پھر تلاش، ادھیکار، اور بھی غم ہیں زمانے میں اور گریٹ مراٹھا جیسے مقبول ٹی وی سیریل بھی لکھے تھے۔ انھیں ڈرامہ نگاری کے لیے 2007 میں سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ ملا تھا۔ وہ ہندی کے علاوہ اردو ڈراموں کی دنیا میں بہترین مصنف سمجھے جاتے تھے۔ انھیں غالب ایوارڈ اور ساہتیہ کلا پریشد کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ 40 کی دہائی سے ہی وہ ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھ رہے تھے۔ انٹرنیشنل تھیٹر انسٹی ٹیوٹ کی ہندوستانی شاخ، بھارتیہ ناٹیہ ایسوسی ایشن کے صدر بھی تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 ستمبر 2016

ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ

نئی دھلی: معروف ادبی شخصیت، ہندی اردو زبان کے ماہر، بہت سی کتابوں کے خالق، شاعر، محب اہل بیت، استاد سیاسیات ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ کا 24 ستمبر 2016 کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 83 برس کے تھے۔ سابق وزیر تعلیم اور شاعر ڈاکٹر گوپی ناتھ امن کے فرزند ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ کی زندگی تحقیق ادب میں گزری بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے خود کو ادب کے لیے وقف کردیا تھا اور اسی لیے 80 سال کی عمر میں بھی انھوں نے خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ ایران نئی دہلی سے فارسی زبان میں ڈپلومہ کیا اور کئی مرتبہ ادبی نشستوں میں ایران گئے جہاں رہبر معظم آیت خامنہ ای سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ مشرقی دہلی کے میور وہار فیز 2 میں اپنے بیٹے ہیمندر ناتھ کے ساتھ رہا کرتے تھے جو پیشے سے سافٹ ویئر انجینئر ہیں جبکہ ان کی بیٹی لندن میں رہتی ہیں۔ ڈاکٹر ناتھ کی اہلیہ ان سے قبل ہی 1992 میں الوداع کہہ کر چلی گئی تھیں۔ آپ تقریباً 25 سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ کی آخری رسومات جمنا بازار بودھ گھاٹ پر دن میں 11 بجے انجام دی گئیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 ستمبر 2916

مولانا مفتی ظہور

لکھنؤ: دارالعلوم ندوۃ العلما میں مفتی صاحب کے نام سے مشہور مولانا ظہور کا 25 ستمبر 2016 کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 88 سال کے تھے۔ بعد نماز عصر ان کی نماز جنازہ ندوہ کے وسیع میدان میں ہزاروں کی تعداد میں موجود بھیڑ میں مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے پڑھائی۔ تدفین ڈالی گنج قبرستان میں ہوئی۔ مولانا 1944 میں ندوہ میں تعلیم حاصل کرنے آئے تھے۔ انھوں نے 1951 تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد 1952 میں انھوں نے ندوہ میں ہی درس و تدریس دینا شروع کردیا، ان کی قابلیت اور شعور کو دیکھتے ہوئے ان کو نائب مہتمم کی ذمے داری کے علاوہ شعبہ تعمیر و ترقی کی ذمے داری سپرد کی گئی۔ اس کے علاوہ مرحوم کے زیرنگرانی خطبات ندوہ کی تین جلدیں مکمل ہوئیں جس میں انھوں نے تعلیم بلاغت کا نمونہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ مولانا نے ندوہ کے دارالافتا کی ذمے داری بھی بخوبی انجام دی۔ آبائی طور پر ضلع اعظم گڑھ کے مبارک پور سے تعلق رکھنے والے مولانا مفتی ظہور کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ دو لڑکے مولانا سہیل اور مولانا زہیر ندوہ میں ہی استاد ہیں جبکہ شعیب اعظم گڑھ کے مدرسہ اصلاح میں درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ندوہ کے استاد اور مفتی صاحب کے داماد مولانا فخرالحسن نے بتایا کہ مرحوم پختہ علمی لیاقت، فقہی بصیرت، تدریسی مہارت اور حاضر جوابی کے لیے مشہور تھے، قوت فیصلہ اور اپنی سادگی کی وجہ سے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بیرون ممالک میں کافی نام تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 ستمبر 2016

پروفیسر شمیم نکہت

لکھنؤ: عصری اردو تنقید میں اہم ستون کی حیثیت رکھنے والے نقاد پروفیسر شارب ردولوی کی اہلیہ اور مشہور افسانہ نگار پروفیسر شمیم نکہت کا 28 ستمبر 2016 کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 70 برس کی تھیں۔ پروفیسر شمیم نکہت دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر تھیں۔ ان کے زیرنگرانی متعدد طلبہ و طالبات نے تحقیقی مقالے لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری پائی۔ وہ حد درجہ خلیق، ملنسار اور نیک خاتون تھیں۔ زندہ دل، شگفتہ مزاج اور لکھنوی تہذیب کی پاسدار اپنے

شاگردوں اور چھوٹوں کے تئیں بے حد شفیق تھیں۔ ان کی ایک بیٹی شعاع فاطمہ تھی جس کا نکاح انھوں نے اپنی بہن کے بیٹے وقار احمد سے کیا۔ لیکن شادی کے بعد لکھنؤ میں مختصر علالت کے بعد شعاع فاطمہ کا انتقال ہوگیا۔ پروفیسر شمیم نکہت نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے شوہر پروفیسر شارب ردولوی کے ساتھ لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی اور اپنی جواں سال بیٹی شعاع فاطمہ کی یاد میں شعاع فاطمہ تعلیمی وفلاحی ٹرسٹ قائم کیا اور اسی کے زیر نگرانی شعاع فاطمہ گرلس انٹر کالج لکھنؤ کے علی گنج علاقے میں قائم ہے۔ پروفیسر شمیم نکہت کا ایک افسانوی مجموعہ 'دو آدھے' شائع ہوکر مقبول عام ہوا۔ پروفیسر شمیم نکہت افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ فکشن کی باشعور ناقد بھی تھیں۔ 'پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار' ان کی اہم کتاب ہے جس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ علاوہ بریں ان کے مضامین کا مجموعہ 'تاثرات' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ پروفیسر شمیم نکہت کی تدفین ڈالی گنج قبرستان میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 29 ستمبر 2016

فرزند احمد

لکھنؤ: سینئر صحافی اور اترپردیش حکومت کے مشیر فرزند احمد کا طویل علالت کے بعد 2 اکتوبر 2016 کو انتقال ہوگیا۔

وہ 86 سال کے تھے۔ پسماندگان میں ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ مسٹر احمد نے اپنی صحافت یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (یو این آئی) کے پٹنہ دفتر سے شروع کی تھی۔ یو این آئی سے استعفیٰ دینے کے بعد مسٹر احمد ٹیلی گراف، کولکاتا اور بعد میں انڈیا ٹوڈے گروپ میں اپنی خدمات انجام دیں۔ وہ بہار حکومت میں اطلاعاتی کمشنر بھی رہے۔ مسٹر احمد انڈیا ٹوڈے گروپ سے سینئر ایڈیٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ کنبہ کے ذرائع نے بتایا کہ مسٹر احمد گذشتہ دو برسوں سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی تدفین عیش باغ قبرستان میں کی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 اکتوبر 2016

یعقوب بدر

سکندر آباد: طنز ومزاح کے معروف شاعر یعقوب بدر کا دہلی میں ایک سڑک حادثے کے دوران 3 اکتوبر 2016 کو انتقال ہوگیا، ان کے انتقال کی خبر سے اہل خانہ اور ادبی حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی، اپنے محبوب شاعر کے آخری دیدار کرنے کے لیے ان کی رہائش گاہ واقع محلہ نئی بستی چودھری واڑہ میں پرستاروں کا ہجوم لگا رہا مختلف سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی تنظیموں کے ذمے داران نے اہل خانہ سے اظہار تعزیت کیا اور مرحوم کو ایصال ثواب کیا۔

واضح ہو کہ یعقوب بدر اپنے آبائی وطن بریلی گئے ہوئے تھے یکم اکتوبر کو وہ بذریعہ ٹرین دہلی آئے اور بس سے سکندرآباد کے لیے روانہ ہوئے دوران سفر بس سے اترتے وقت وہ سر کے بل سڑک پر گر پڑے اور بے ہوش ہوگئے، لوگوں نے انھیں شاہدرہ کے جی ٹی بی اسپتال میں داخل کرایا جہاں علاج کے دوران اتوار کی شام ان کا انتقال ہوگیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 اکتوبر 2016

راشد آذر

حیدرآباد: معروف شاعر راشد آذر کا 4 اکتوبر 2016 کو حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 85 برس تھی۔ تدفین مقبرہ عماد الدولہ امیر پیٹ میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں ایک فرزند امیر حسین خان ہیں۔ راشد آذر کے 10 شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں صدائے تیشہ، نقش آذر، خاک انا، رباعیات کا مجموعہ کلیات نقش وغیرہ شامل ہیں۔ راشد آذر اس عہد کے اہم ترین شعرا میں سے تھے۔ وہ مارکسی تصورات سے متاثر تھے۔ مارکسزم کا انھوں نے بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کی شاعری پر فیض اور ساحر کے اثرات ہیں مگر انھوں نے اپنی ایک الگ راہ چنی تھی۔ ان کا شعری ڈکشن بھی اپنے ہمعصروں سے مختلف تھا اسی وجہ سے وہ ادبی حلقے میں بہت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی وفات پر مختلف ادبی تنظیموں نے تعزیت کا اظہار کیا۔ ان کی وفات سے حیدرآباد کے ادبی افق سے ایک روشن ستارہ غروب ہوگیا۔ حیدرآباد کی تخلیقی کہکشاں کو جن افراد نے روشن کیے رکھا تھا ان میں راشد آذر کی شخصیت یقیناً بہت اہمیت کی حامل تھی۔

(مختلف اخبارات سے)

خلیق انجم

نئی دہلی: اردو کے ممتاز محقق، ماہر غالبیات اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے سابق جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کا 18 اکتوبر 2016 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 84 سال تھی۔ مرحوم 38 سال تک انجمن ترقی اردو (ہند) کی خدمت کرتے رہے اور اس وقت انجمن اردو ترقی (ہند) کے نائب صدر تھے۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز مغرب جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جامع مسجد میں قاری سلیمان نے پڑھائی اور تدفین جامعہ قبرستان میں عمل میں آئی۔

ان کی تقریباً 85 کتابیں مختلف موضوعات پر شائع ہوچکی ہیں جن میں سرسید کی آثار الصنادید کا نیا ایڈیشن (ترمیم اور اضافے کے ساتھ)، انتخاب خطوط غالب، غالب اور شاہان تیموریہ، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، متنی تنقید، مرزا محمد رفیع سودا، حسرت موہانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر خلیق اپنی اردو خدمات اور طرز تکلم کی وجہ سے اردو حلقوں میں کافی مقبول تھے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 19 اکتوبر 2016

خراج عقیدت

جوگندر پال کا یوم پیدائش

نئی دہلی: بستی حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکادمی میں اردو کے مشہور ومعروف افسانہ نگار جوگندر پال کے انتقال کے بعد پہلے یوم پیدائش کے موقعے پر ایک جلسہ کا اہتمام کیا

گیا جس کی صدارت ڈاکٹر ترنم ریاض نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی، خورشید اکرم، انجم عثمانی، نگار عظیم اور سکریتا پال نے جوگندر پال کی زندگی پر اظہار خیال کیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہ بڑے فکشن نگار کے ساتھ مضمون نگار بھی تھے۔ انھوں نے 'نادید' جیسا ناول اور 'کھودو بابا کا مقبرہ' جیسا افسانہ لکھا تو بہت سے مضامین بھی تحریر کیے۔ وہ عجیب وغریب آدمی تھے۔ ان کے قاری بے شمار تھے۔ ان کی شخصیت جادوئی تھی۔ ان کی شفقت سب پر حاوی تھی۔ شروع کی کہانیوں میں حقیقت پسندی ہے بعد میں ابہام آیا وہ تجربے کرنے سے ڈرتے نہیں تھے۔ پڑھنے سے زیادہ سوچتے تھے۔ خورشید اکرم نے کہا کہ جوگندر پال نے اردو ادب کے لیے اپنے آپ کو قربان کیا۔

اس موقعے پر انجم عثمانی نے کہا کہ ان کا کہنا تھا کہ ''کہانی میں ڈوب جاؤ'' وہ خود بھی لکھتے تھے تو اپنے کرداروں میں ڈوب جاتے تھے۔ ڈاکٹر نگار عظیم نے کہا کہ میں نے جوگندر پال کو کہانیوں کے کردار سے الگ نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ غالب اکادمی سے جوگندر پال کی وابستگی بہت پرانی ہے وہ تادم حیات غالب اکادمی آتے رہے۔ وہ ایک عظیم افسانہ نگار، ناول نگار تو تھے ہی وہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ ڈاکٹر ترنم ریاض

نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ پال صاحب بڑے فکشن نگار تھے۔ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ قلم کی عظمت کے لیے ایوارڈ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کی شخصیت اعزازات و انعامات سے بڑی تھی۔ آخر میں سکریٹری عقیل احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 ستمبر 2016

بابائے قوم مہاتما گاندھی کو خراجِ عقیدت

نئی دہلی: صدر پرنب مکھرجی، نائب صدر حامد انصاری، وزیر اعظم نریندر مودی، مختلف پارٹیوں کے لیڈروں اور

دیگر معروف شخصیات نے بابائے قوم مہاتما گاندھی کی 147 سالگرہ پر راج گھاٹ جاکر انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ وزیر اعظم نے سابق وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے یوم پیدائش پر وجے گھاٹ جاکر انھیں گلہائے عقیدت پیش کیے۔ مسٹر مودی نے پہلے لکھا 'پوجنیہ باپو کو شت شت نمن'۔ اس کے بعد دوسرے ٹویٹ میں انھوں نے کہا کہ لال بہادر شاستری جی کو ان کی جینتی پر نمن۔ وزیر اعظم کے علاوہ سابق وزیر اعظم من موہن سنگھ، دہلی کے وزیر اعلیٰ اروند کجریوال، نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا، مرکزی وزیر ونکیا نائیڈو، بی جے پی کے سینئر لیڈر لال کرشن اڈوانی، کانگریس کے لیڈر غلام نبی آزاد سمیت تمام پارٹیوں کے لیڈروں نے راج گھاٹ جاکر بابائے قوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور اس موقعے پر منعقدہ 'سرودھرم' دعائیہ جلسے میں شرکت کی۔ تمام رہنما شاستری جی کی سمادھی وجے گھاٹ بھی گئے اور انھوں نے سابق وزیر اعظم کو گلہائے عقیدت پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 اکتوبر 2016

ریوتی سرن شرما

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے پریم چند سیمنار ہال میں اس معروف ڈرامہ نگار کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے جبکہ خصوصی مقررین کی حیثیت سے یو، این، آئی اور راشٹریہ سہارا گروپ کے نمائندے محترم کامران زبیری، یونائٹڈ پروگریسو تھیٹر ایسوی ایشن کے نائب صدر محترم انل شرما شریک ہوئے۔ صدارتی خطبے میں ریوتی سرن شرما سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ یوں تو فکشن کی تمام اصناف مگر خاص طور پر ریڈیائی ڈراموں کی باریکیوں کو سمجھانے والا ان جیسا فنکار میں نے نہیں دیکھا۔ انھوں نے آگے کہا کہ ریوتی سرن شرما کا شمار ٹی وی سیریلس کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے تحریر کردہ سیریلس عوام میں کافی مقبول تھے۔ ریڈیو ڈراما کے تو وہ مستند اسکرپٹ رائٹر تھے۔ وہ شہرت سے دور اور خاموش خدمت کرنے کے عادی تھے اس لیے ان کی شخصیت و فن پر ابھی ابتدائی کام بھی نہیں ہو سکا ہے ہماری کوشش ہوگی کہ بہت جلدی ان پر تحقیقی کام کرا کر ان کو سچا خراج عقیدت پیش کریں۔'' تسلیم جہاں نے ریوتی سرن شرما کی حیات اور خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ''جو اردو اور ہندی میں یکساں شہرت رکھنے والے معدودے چند ادیبوں میں سے ایک تھے۔ ان کے انتقال سے اردو اور ہندی زبانوں کے ادیبوں میں صف ماتم بچھ گئی وہ یوں تو ریڈیائی ڈرامہ نگار کی حیثیت سے معروف تھے لیکن درحقیقت وہ ٹی وی سیریلس، فلم اسکرپٹ اور ناول نگاری کے میدان میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

خصوصی مقرر محترم کامران زبیری نے ریوتی سرن شرما کے انتقال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ریوتی سرن شرما جی اگرچہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن وہ اپنی تخلیقات بالخصوص ڈراموں کے ذریعے ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ محترم انل شرما نے بتایا کہ ریوتی سرن شرما اچھے تخلیق کار کی طرح اچھے انسان بھی تھے فن کی بلندیوں کو چھو لینے کے بعد بھی ان میں غرور یا تمکنت نہیں تھی۔ اس موقع پر ناظم جلسہ نے ریوتی سرن شرما کے انتقال کو صنف ڈرامہ کا ناقابل تلافی نقصان بتاتے ہوئے سامعین کے سامنے ان کی شخصیت و خدمات کی اہم جھلکیاں پیش کیں۔ ڈاکٹر شاداب علیم نے ان کے فن پر، پر مغز مقالہ پیش کیا۔ جلسے میں ڈاکٹر الکا وسشٹھ، راشد یوسف، سریندر شرما، مسعود اختر، عامر نظیر ڈار، طاہرہ پروین، شبستاں، فرحناز، روزی، گلشن فاطمہ سمیت طلبہ نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، 25 ستمبر 2016

کلیم الدین احمد: ایک یادگاری تقریب

پٹنہ: کلیم الدین احمد اردو کے جید نقاد ہیں۔ ان کا تنقیدی سرمایہ بہار کے لیے عالمی سطح پر باعث افتخار ہے۔ ان کی تنقید میں مغرب زدگی کے ساتھ مشرقی قدروں کا بھی

زبردست ادراک ہے۔ سخت گیری اور انتہا پسندی کے ساتھ دیانت داری، معیاری اصول پسندی، فکری صلابت ان کی تنقید میں بہت نمایاں ہیں۔ ان خیالات کا اظہار محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام منعقدہ کلیم الدین احمد یادگاری تقریب میں دانشوران شعر و ادب نے کیا اور انھیں بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے ریاض عظیم آبادی نے کلیم الدین احمد کو بہار کا سرمایہ افتخار قرار دیا۔ مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے واضح الفاظ میں کہا کہ کلیم الدین احمد دنیائے تنقید کی سب سے قد آور شخصیت ہیں۔ عالمی سطح پر ان کی ناقدانہ عظمت اعتراف کیا جاتا ہے۔ پروفیسر ممتاز احمد خاں نے اپنے مقالے میں کلیم الدین احمد کی شخصیت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پروفیسر جاوید حیات نے اپنے مقالے میں بتایا کہ کلیم الدین احمد کا تنقیدی سفر 'گل نغمہ' سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے جب 'اردو شاعری پر ایک نظر' تصنیف کی تو ادبی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جب ان کی دوسری کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' منظر عام پر آئی تو ان کے سخت اصول و نظریات کے سبب دنیائے شعر و ادب میں ایک بھونچال سا آگیا۔ ان کے یہاں اسلوب سے زیادہ معنویت کی ترسیل پر زور ہے۔ تقریب کی ابتداء ڈائرکٹر (اردو) امتیاز احمد کریمی کے استقبالیہ کلمات سے ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ کلیم الدین احمد جیسی عظیم ادبی شخصیت پر اردو ڈائرکٹوریٹ کا یہ اولین سیمنار باعث افتخار ہے۔ انھوں نے کلیم الدین احمد کا مختصر اور جامع شخصی تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ تمام مخالفت کے باوجود دنیائے ادب ان کو اب تک کا سب سے بڑا ناقد تسلیم کرتی ہے تقریب کی نظامت ڈاکٹر خورشید انور نے کی جب کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کی جانب سے اظہار تشکر راج بھاشا افسر (اردو) ڈاکٹر شاہد جمیل خاں نے کیا۔

پریس ریلیز: ڈائرکٹوریٹ اردو گورنمنٹ بہار، 22 ستمبر 2016

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

غواصی (مونوگراف)

مصنف: سیدہ جعفر
صفحات: 140
قیمت: -/82 روپے

ریاض خیرآبادی (مونوگراف)

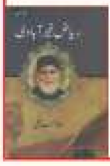

مصنف: صاحب علی
صفحات: 115
قیمت: -/75 روپے

ساجد رشید (مونوگراف)

مصنف: رحمٰن عباس
صفحات: 123
قیمت: -/77 روپے

قاضی عبدالودود (مونوگراف)

مصنف: آفتاب احمد آفاقی
صفحات: 130
قیمت: -/80 روپے

شفیق جونپوری (مونوگراف)

مصنف: تابش مہدی
صفحات: 120
قیمت: -/75 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ششم: رپورتاژ)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 371
قیمت: 170 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہشتم: مضامین)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 262
قیمت: 130 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد دہم: انٹرویز)

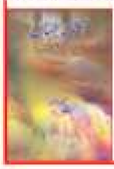

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 245
قیمت: 128 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد یازدہم: انٹرویز)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 258
قیمت: 132 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد نہم: خاکے)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 311
قیمت: 145 روپے

کلیاتِ ماجدی (جلد سوم) خاکے

ترتیب و تدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات: 253
قیمت: 130 روپے

سخن دانِ فارس

مصنف: محمد حسین آزاد
صفحات: 364
قیمت: 160 روپے

مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت، سیاست، پیغام

مصنف: رشیدالدین خاں
صفحات: 336
قیمت: 150 روپے

خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 101
قیمت: 67 روپے

وقف قوانین

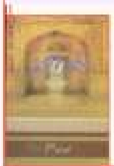

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 213
قیمت: 110 روپے

علاج بذریعہ غذا

مصنف: حکیم احتشام الحق قریشی
صفحات: 415
قیمت: -/185 روپے

تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی
صفحات: 496
قیمت: -/220 روپے

مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ

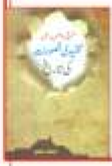

مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: -/168 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, November-2016, Vol.18, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/10/2016**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

ناول پر ایک اہم دستاویز

- ناول کے فن اور روایت پر بیش قیمت مضامین
- بیسویں اور اکیسویں صدی کے اردو ناولوں کی فہرست
- ناول پر لکھی گئی تنقیدی کتابیں اور مضامین کا اشاریہ
- ہندوستانی جامعات میں ناولوں پر تحقیق کا جائزہ
- بیسویں اور اکیسویں صدی کے بیشتر اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ

طلبا اور اساتذہ کے لیے معلوماتی اور مفید شمارہ

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025